بسم اللہ الرحمن الرحیم

ڈائری

جلد اول

مولانا وحیدالدین خاں

DIARY
(Volume 1: 1983-84)

By Maulana Wahiduddin Khan

First published 1995
© Al-Risala Books, 1995

Al-Risala Books
The Islamic Centre
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 4611128, Fax : 91-11-4697333

No prior permission is required from the publisher
for the translation of this book or for the publication
of its translation into any-language.
On application, permission will also be given
to reproduce the book for
da'wah purposes etc.

Printed at Nice Press, Delhi

یکم جنوری ۱۹۸۳

عام طور پر لوگ مضمون اس طرح لکھتے ہیں کہ ایک موضوع (مثلاً اسلام کا معاشی نظام) مقرر کرکے اس کے مطابق لکھنا شروع کر دیا۔ میرا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ میری تحریریں میرے مطالعہ اور غور وفکر کا ضمنی حاصل (by-product) ہوتی ہیں۔ میرے ساتھ اللہ تعالیٰ کا عجیب معاملہ ہے۔ میرے دماغ پر مضامین کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ میرے تقریباً تمام مضامین آمد ہوتے ہیں نہ کہ آورد۔

کبھی مطالعہ کرتے ہوئے کوئی مضمون ذہن میں آجاتا ہے۔ کبھی کوئی چیز دیکھتا ہوں یا کسی چیز کے بارہ میں سوچتا ہوں تو اس دوران میں دماغ کسی تصور کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور ایک مضمون کا خاکہ دماغ میں بن جاتا ہے۔ اسی طرح کسی سے ملاقات ہوتی ہے تو گفتگو کے دوران کوئی ایسی بات سامنے آجاتی ہے جس میں سبق اور نصیحت کا پہلو ہو۔

اس طرح جو مضامین ذہن میں وارد ہوتے ہیں وہ کبھی بڑے ہوتے ہیں اور کبھی چھوٹے۔ بڑے مضامین اکثر قلم بند ہوکر الرسالہ یا کسی کتاب میں شامل ہو جاتے ہیں۔ مگر دوسرے مضامین یوں ہی غیر استعمال شدہ رہ جاتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ چھوٹے چھوٹے خیالات جو روزانہ دماغ میں آتے ہیں ان کو ڈائری کی صورت میں لکھ لیا کروں۔ کسی سے گفتگو کرتے ہوئے کوئی بات سامنے آئے۔ کوئی کتاب پڑھتے ہوئے کوئی چیز اسٹرائک کرے یا دماغ کسی تصور کی طرف منتقل ہو تو اس قسم کی باتوں کو روزانہ لکھ لیا کروں۔ اس طرح ایک ذخیرہ جمع ہو جائے گا، اور آئندہ شاید کوئی اللہ کا بندہ ان کو استعمال کرسکے۔ وما توفیقی إلّا باللہ۔

۲ جنوری ۱۹۸۳

اودھ کے نواب آصف الدولہ کی حکومت ۱۷۷۵ میں قائم ہوئی۔ انھوں نے لکھنؤ کو اپنی راجدھانی بنایا۔ اس خاندان کے آخری حکمراں واجد علی شاہ تھے۔ واجد علی شاہ اپنی رنگین مزاجی کے لئے مشہور ہیں۔ ان کا دربار شاعروں اور مسخروں سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔ وہ دنیا سے بے خبر اپنے اس فرضی ماحول میں بے خود پڑے رہتے تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۵۶ میں اودھ پر قبضہ کرکے اس کو برطانی سلطنت میں شامل کرلیا۔ کرنل بیلی کی قیادت میں جب انگریزی فوج لکھنؤ کے قریب پہنچ گئی اور خبر رسانوں نے اس کی خبر نواب واجد علی شاہ کے دربار میں پہنچائی تو کہا جاتا ہے کہ دربار کے مسخروں نے تالیاں بجا بجا کر کہنا شروع کیا:

"تالیاں بجاؤ موئے بھاگ جائیں گے۔"

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں نے بھی تقریباً یہی کردار ادا کیا ہے۔ جب مسلمانوں کے اوپر غیر اقوام کا غلبہ ہوگیا تو انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ اصل صورت حال کو سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ہر ایک بس شاعری اور خطابت اور انشا پردازی کے جوہر دکھانے لگا۔ گویا کہ بزبان حال وہ کہہ رہے تھے:

لفظ بازی کرو اور تمہارے سب مسئلے حل ہوجائیں گے۔

۳ جنوری ۱۹۸۳

قال رجل لعمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ:

انّ فلاناً رجل صدق۔ فقال عمر، هل سافرت معه او ائتمنته قال لا۔ فقال اذن لا تمدحه فلا علم لك به

ایک شخص نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ فلاں شخص بہت سچا آدمی ہے۔ حضرت عمر نے کہا: کیا تم نے اس کے ساتھ سفر کیا ہے یا کیا تم نے اس کو کسی معاملہ میں امین بنایا ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ حضرت عمر نے کہا پھر تم اس کی تعریف نہ کرو کیوں کہ تم کو اس کے بارہ میں کوئی علم نہیں۔

حضرت عمر کے اس قول کے مطابق آدمی کی سچائی کا معیار وضو اور نماز جیسے اعمال نہیں ہیں۔ وضو اور نماز بلاشبہ اہم ہیں مگر وہ کسی کی سچائی کا براہ راست ثبوت نہیں۔ سچائی کا براہ راست ثبوت یہ ہے کہ عملی تجربات میں آدمی پورا اترے۔ جب آدمی کچھ لوگوں کے ساتھ سفر کرتا ہے، جب اس کو کوئی امانت سونپی جاتی ہے، اس وقت اس کا عمل بتاتا ہے کہ وہ فی الواقع کیا ہے۔

۴ جنوری ۱۹۸۳

"آخرت وہ دنیا ہے جہاں صرف امرِ حق میں قیمت ہو، امرِ غیر حق جہاں بے قیمت ہوکر رہ جائے۔"

مجھ پر ایک تجربہ گزرا، اس کے بعد شدید تاثر کے تحت یہ الفاظ میری زبان پر آ گئے۔

۵ جنوری ۱۹۸۳

حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی طرف جو اشعار منسوب ہیں، ان میں سے دو شعر یہ ہیں:

يغوص البحر من طلب اللآلی　　ومن طلب العلیٰ سهر اللیالی

ومن طلب العلیٰ من غیر کدٍّ　　اضاع العمر فی طلب المحال

ترجمہ: جو شخص موتی چاہتا ہے وہ سمندر میں غوطہ لگاتا ہے اور جو شخص بلندی چاہتا ہے وہ راتوں کو جاگتا ہے۔ اور جو شخص محنت کے بغیر بلند مقام چاہے، اس نے ناممکن کی طلب میں اپنی عمر ضائع کر دی۔

آدمی اس دنیا میں جو کچھ پاتا ہے اپنے اس استحقاق کی بنیاد پر پاتا ہے جو اس نے محنت اور جدوجہد کے ذریعہ اپنے حق میں فراہم کیا ہو۔ صحابہ کرام اس بات کو چودہ سو سال پہلے جان چکے تھے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان جس طرح مطالبہ اور احتجاج کی سیاست میں مشغول ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چودہ سو سال بعد بھی وہ اس حقیقت سے واقف نہ ہو سکے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص قیمتی موتی کا طلب گار ہو تو وہ ساحل پر اپنی مطلوبہ چیز کو نہیں پا سکتا۔ اس کو اپنا مطلوب پانے کے لئے سمندر کی گہرائیوں میں اترنا پڑے گا۔ اسی طرح جو شخص چاہتا ہو کہ اسے زندگی میں عزت اور بڑائی کا درجہ ملے تو اسے راتوں کو جاگنا پڑے گا۔ یعنی صرف دن کی محنت اس کے لئے کافی نہیں ہوگی، وہ راتوں کو بھی محنت کرے گا۔ اس کو اس وقت عمل کرنا ہوگا جب کہ دوسرے لوگ آرام کر رہے ہوں۔ زیادہ محنت ہی کے ذریعہ اس دنیا میں کوئی شخص زیادہ بڑا درجہ پا سکتا ہے۔ جو شخص محنت اور مشقت کے بغیر بڑائی حاصل کرنا چاہے وہ اپنا وقت اور اپنی طاقت کو ضائع کر رہا ہے۔ کیونکہ کسی اور تدبیر سے اس دنیا میں کسی کو بڑائی ملنے والی نہیں۔

۶ جنوری ۱۹۸۳

صحابہ کا طریقہ یہ تھا کہ ان سے اگر کوئی شخص کسی صورت حال کے بارہ میں فتویٰ پوچھتا تو وہ سائل سے پوچھتے کہ کیا ایسی صورت واقعۃً پیش آئی ہے۔ اگر وہ کہتا کہ نہیں تو صحابہ کہتے کہ پھر ایسے معاملہ کے لئے فتویٰ مت پوچھو۔ مگر بعد کو آنے والے فقہا اس احتیاط کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔ انھوں نے بلا قید مفروضہ مسائل پر فتویٰ دینا شروع کر دیا۔ اس طرح کتابوں میں کثرت سے ایسے مسائل جمع ہو گئے جو محض فرضی تھے۔

اس کے باوجود ان کے بارہ میں کسی فقیہہ کی رائے درج تھی۔

مسلم فقہاء کی اس غلطی نے موجودہ زمانہ میں ایک فتنہ کی صورت اختیار کرلی ہے۔ ان مفروضہ مسائل کو مستشرقین اسلام کی تصویر بگاڑنے کے لئے کامیاب طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ مثلاً اسلام نے بلوغ کو ازدواج کی ایک شرط قرار دیا ہے۔ اب کسی تفنن پسند نے ایک فقیہہ سے پوچھا کہ حضرت، ایک شخص بوڑھا ہے یا بڑی عمر کا ہے، اس کا نکاح ایک شیر خوار بچی سے کردیا گیا تو یہ نکاح جائز ہوگا یا نہیں۔ فقیہہ پر لازم تھا کہ وہ سائل سے پوچھتا کہ کیا ایسی صورت پیش آئی ہے، اور جب وہ کہتا کہ نہیں تو فقیہہ کہتا کہ پھر ایسا فرضی مسئلہ مت پوچھو۔ مگر فقیہہ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اس نے فوراً اس کا ایک جواب لکھ دیا اور یہ جواب کتابوں میں بھی شامل ہوگیا۔

اب موجودہ زمانہ کے مستشرقین یہ کر رہے ہیں کہ وہ قدیم کتابوں سے اس قسم کے جزئی واقعات و مسائل ڈھونڈ کر نکالتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ دیکھو اسلامی معاشرہ کے لوگ اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل میں یہاں تک جاتے ہیں کہ وہ شیر خوار بچی سے نکاح کرنے کو بھی غلط نہیں سمجھتے۔

۷ جنوری ۱۹۸۳

کعبہ کے اوپر غلاف اوڑھانے کا رواج قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کعبہ کے اوپر پہلا غلاف خود حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اوڑھایا تھا۔ اگرچہ یہ بات تاریخی معیار پر ثابت شدہ نہیں۔

قریش اپنے دور میں کعبہ کو غلاف اوڑھاتے رہے۔ فتح مکہ سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس کا موقع نہیں آیا تھا۔ بعد کو جب مکہ فتح ہوا، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے موقع تھا کہ کعبہ پر نیا غلاف ڈالیں۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ فتح مکہ کے بعد بھی آپ نے اسی غلاف کو باقی رکھا جو قریش (بالفاظ دیگر مشرکین) نے کعبہ کو اوڑھایا تھا۔

اس کے بعد ایسا ہوا کہ ایک عرب خاتون کعبہ کو خوشبو دینے کے لئے کسی خوشبودار چیز کی دھونی دے رہی تھی۔ اس دھونی دینے کے عمل کے دوران کعبہ کے غلاف کو آگ لگ گئی اور وہ جل گیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمنی کپڑے کا ایک غلاف اس کے اوپر اوڑھایا۔ آپ کے بعد خلفاء کے درمیان اس کی سنت جاری رہی۔

یہ واقعہ بتاتا ہے اسلام میں حقیقت کی اہمیت ہے نہ کہ ظواہر کی۔

۸ جنوری ۱۹۸۳

اس دنیا میں انسان کو آزادی حاصل ہے مگر اس کو اختیار حاصل نہیں ــــ انسان اگر اس حقیقت کو سمجھ لے تو وہ کبھی سرکشی نہ کرے۔

ایک شخص کسی کو بے عزت کرنے کے لئے اپنی زبان کھول سکتا ہے، مگر کسی کا بے عزت ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک خود خدا اس کے لئے بے عزتی کا فیصلہ نہ کرے۔ ایک شخص کسی کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا سکتا ہے مگر وہ اس وقت تک کسی کو قتل نہیں کر سکتا جب تک اسی شخص کے ہاتھ سے اس کی موت مقدر نہ کر دی گئی ہو۔ ایک شخص کسی کی جائداد پر قبضہ کرنے کی سازش کر سکتا ہے مگر اس کی سازش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک خدا اپنی مصلحت کے تحت اس کے حق میں ایسا فیصلہ نہ کر دے۔

۹ جنوری ۱۹۸۳

اس زمانہ میں معاشی تجزیہ (Economic Analysis) کی ایسی تاریخیں مرتب کی گئی ہیں جو زمانہ قدیم اور قرون وسطی کی تحریروں میں معاشی تجزیہ کے عمل کا سراغ لگاتی ہیں۔ اور ان معاشی اصولوں کی نشاندہی کرتی ہیں جن سے اس زمانہ کے مفکرین باخبر تھے۔ اس موضوع کی ایک مشہور کتاب یہ ہے:

History of Economic Analysis by Joseph A. Schumpeter.

اس کتاب کا ایک باب عظیم خلا (The Great Gap) ہے۔ اس میں اس بات کو "تاریخی حقیقت" کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی سے تیرھویں صدی عیسوی تک کا زمانہ معاشی تجزیہ کی تاریخ کے نقطۂ نظر سے بالکل خالی ہے۔ حالاں کہ بعینہٖ یہی وہ دور ہے جس میں مسلمان علما و مفکرین نے اس میدان میں قابل ذکر کام کئے ہیں۔ مثال کے طور پر قاضی ابویوسف، مسکویہ، ماوردی، ابن حزم، غزالی، رازی، ابن تیمیہ اور ابن خلدون وغیرہ کی تصانیف میں واضح قسم کی معاشی بحثیں ملتی ہیں۔

بے خبری کی سب سے زیادہ مضر قسم وہ ہے جب کہ بے خبری کو علم سمجھ لیا جائے۔

۱۰ جنوری ۱۹۸۳

۱۰ جون ۱۹۶۴ کو لکھنؤ میں پنڈت جواہر لال نہرو کے پھول (راکھ) دریائے گومتی میں بہائے گئے تھے۔ راکھ ایک کلش میں رکھ کر راج بھون سے گومتی کے کنارے لائی گئی جس کے ساتھ ایک بڑا جلوس چل

رہا تھا۔ جلوس کے آگے سواروں کا ایک دستہ تھا۔ اس کے پیچھے پی اے سی (PAC) بینڈ کا ایک دستہ۔ اور آخر میں پی اے سی کا مسلح دستہ تھا۔ اس دستہ نے اپنے رائفل کا رخ پیچھے کی طرف کر رکھا تھا۔ ایک اخبار نے اس واقعہ کی رپورٹ ان الفاظ میں دی:

"پی اے سی کے مسلح دستہ نے احتراماً اپنے اسلحہ پیچھے کر لئے تھے۔"

قومی آواز، لکھنؤ، ۱۱ جون ۱۹۶۴

یہ محض رپورٹر کی غلط فہمی تھی۔ رائفل کا رخ پیچھے کرنا دراصل ماتمی پریڈ کی علامت ہے۔ یہ چوں کہ ایک ماتمی جلوس تھا، اس لئے پی اے سی کے دستہ نے اپنی رائفلوں کا رخ پیچھے کی طرف کر لیا تھا۔

عدم واقفیت سے کیسی عجیب عجیب غلطیاں ہو جاتی ہیں۔

۱۱ جنوری ۱۹۸۳

آزادئ ہند کی تحریک کے زمانہ میں کانگرس نے شراب بندی کی تحریک چلائی۔ "شراب بند کرو" کے نعروں سے ملک کی فضا گونج اٹھی۔ انھیں دنوں گجرات کے ایک مسلمان نے شراب کا ٹھیکہ حاصل کیا۔ اس کا نام گل محمد تھا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اپنے اخبار زمیندار میں اس واقعہ پر ایک نوٹ لکھا جس کا عنوان یہ تھا:

گل محمد نام مے فروشی کام

مذکورہ شخص پر اس نوٹ کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے شراب کا ٹھیکہ ختم کر دیا اور لاہور چلا گیا۔

گل محمد کا یہ عمل محض اخبار زمیندار کے نوٹ کا نتیجہ نہ تھا۔ اس میں زیادہ بڑا دخل روایات اور حالات کا تھا۔ اس وقت تک قدیم اسلامی روایات زندہ تھیں۔ نیز کانگرس کی مخالف شراب تحریک نے ہر طرف اس کے خلاف فضا بنا رکھی تھی، اخبار کے مذکورہ نوٹ نے ایک طرف گل محمد کے روایتی ذہن کو جھنجھوڑا۔ دوسری طرف ماحول کا دباؤ پڑا۔ ان چیزوں کے اثر سے اس نے اپنا شراب کا کاروبار بند کر دیا۔

آج بہت سے "مولانا ظفر علی خاں" ہیں جو اسی طرح کی باتیں لکھتے رہتے ہیں۔ مگر کوئی اس قسم کی باتوں سے اثر قبول نہیں کرتا۔ کیوں کہ اب قدیم روایات ٹوٹ چکی ہیں۔ نیز آج شراب کے خلاف وہ ماحول نہیں جو اس زمانہ میں وقتی طور پر بن گیا تھا۔

۱۲ جنوری ۱۹۸۳

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران اس حدیث کا ذکر ہوا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبردی ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل کی بنیاد پر جنت میں نہیں جائے گا بلکہ اللہ کی رحمت سے جائے گا۔ حضرت عائشہ نے پوچھا کہ اے خدا کے رسول کیا آپ بھی۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں، الّا یہ کہ اللہ مجھے اپنے رحمت اور فضل سے ڈھانپ لے (الا ان یتغمدنی اللہ برحمۃ منہ وفضلہ)

میں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا عمل محدود ہے اور جنت لامحدود۔ اور محدود کی کوئی بھی مقدار لامحدود کا بدل نہیں بن سکتی۔ کسی شخص کے پاس کتنا ہی زیادہ عمل ہو، وہ بہرحال محدود ہوگا۔ پھر محدود کی قیمت میں لامحدود چیز کیسے مل سکتی ہے۔ یہ تو اسی وقت ممکن ہے جب کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کو شامل کرکے اس فاصلہ کو ختم کردے۔

میں نے کہا کہ میرے پاس ایک روپیہ ہے اور آپ کے پاس ایک کروڑ روپیہ، تو میرے اور آپ کے درمیان مقدار کا فرق ہوا۔ مگر جس کے پاس بے حساب خزانہ ہو، جو کبھی ختم ہی نہ ہوسکے، تو اس کے اور ہمارے درمیان نوعیت کا فرق ہو جائے گا۔ اور جہاں نوعیت کا فرق آجائے، وہاں مقدار کا فرق محض اضافی بن جاتا ہے۔

انسان کے عمل اور خدا کی جنت کے درمیان نوعیت کا فرق ہے نہ کہ مقدار کا۔ اور جہاں دو چیزوں میں نوعیت اور مقدار کا فرق ہو وہاں مقدار کا کوئی بھی اضافہ دونوں کو مساوی قرار دینے کے لئے کافی نہیں۔

۱۳ جنوری ۱۹۸۳

مولانا حمید الدین فراہی نے سورہ فیل کی ایک منفرد تفسیر کی ہے۔ اس سورہ میں عام طور پر ترمیھم کو واحد مونث کا صیغہ مان کر یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ چڑیاں ان کے اوپر کنکر پھینکتی تھیں۔ مگر مولانا فراہی نے اس کو مخاطب کا صیغہ مان کر "تم ان پر پھینکتے تھے" کا ترجمہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کنکر پھینکنے والے خود اہل مکہ تھے۔ اور چڑیاں جو وہاں آئی تھیں وہ سنگ باری کے لئے نہیں بلکہ وہ لاشوں کو کھانے کے لئے آئی تھیں۔

مگر لغت کے اعتبار سے یہ بات درست نظر نہیں آتی۔ کیوں کہ قرآن اگر اہل مکہ کے بارہ میں کہہ رہا ہوتا کہ تم لوگ ابرہہ کے لشکر پر کنکر پھینکتے تھے تو آیت میں ترمیھم کے بجائے ترمونھم کا لفظ آنا

چاہئے تھا۔

اس منفرد تفسیر میں مولانا فراہی کا انحصار زیادہ تر کلام عرب پر ہے۔ انھوں نے کچھ قدیم اشعار پیش کرکے دکھایا ہے کہ "قتل گاہوں اور جنگ کے میدانوں میں گوشت خور چڑیوں کا جمع ہونا عربوں میں ایک معلوم ومشہور بات تھی۔ وہ فوج کے ساتھ چڑیوں کے جھنڈ کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتے تھے کہ لڑائی ضرور ہوگی۔ بعض شعرا اپنی فوجوں کے ذکر کے ساتھ چڑیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ چڑیوں کو اندازہ ہوگیا ہے کہ میدان جنگ میں بے شمار لاشیں کھانے کو ملیں گی، اس لئے وہ بھی فوج کے ساتھ ہوگئی ہیں۔"

انھوں نے جو چند اشعار نقل کئے ہیں ان میں سے ایک جاہلی شاعر ابونواس ہے۔ اس کا شعر حسب ذیل ہے:

تُتَاقِی الطیر غدوته   ثقة بالشبع من جزره

جب وہ (جنگ کے لئے) روانہ ہوتا ہے تو (گوشت خور) چڑیاں اس کے ساتھ اس یقین کے ساتھ چلتی ہیں کہ وہ مقتولوں سے خوب پیٹ بھریں گی۔

ابونواس کا مذکورہ شعر یا اس طرح کے دوسرے اشعار محض شاعرانہ تصویرکشی کے طور پر ہیں۔ مگر مولانا فراہی نے اس کو حقیقت واقعہ سمجھ لیا۔ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محض عربی دانی عربی کلام کو سمجھنے کے لئے کافی نہیں۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے: تعرف الاشیاء باضدادها (چیزیں اپنے ضد سے پہچانی جاتی ہیں)، مولانا فراہی اگر اس مقولہ کی روشنی میں دیکھتے تو انھیں نظر آتا کہ قدیم زمانہ سے لے کر جدید زمانہ تک بے شمار جنگیں ہوئی ہیں اور ان کے تفصیلی حالات بھی لکھے ہوئے موجود ہیں۔ مگر کسی جنگ میں یہ مذکور نہیں کہ فوج جب روانہ ہو تو اس کے ساتھ چڑیوں کے غول بھی چھتری بنائے ہوئے اڑ رہے ہوں۔ اگر وہ اس طرح مختلف واقعات کی روشنی میں دیکھتے تو وہ بآسانی سمجھ لیتے کہ بعض عرب شعرا نے اپنے سواروں کی تعریف میں مذکورہ قسم کی جو بات کہی ہے وہ محض شاعرانہ تصویرکشی ہے نہ کہ کوئی حقیقت واقعہ۔

۱۴ جنوری ۱۹۸۳

ایک روسی شہری ایک بارپنساری کے یہاں سے کچھ سامان خرید کر لے آیا۔ گھر آکر پڑیہ کھولی تو اس کی نظر ردی کاغذ پر چھپی ہوئی ایک عبارت پر پڑی۔ یہ ایک آتشیں تحریر تھی۔ چنانچہ اس کو پڑھ کر وہ تڑپ

اٹھا۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ لینن کے خفیہ اخبار کا پڑھا ہوا نکلا ہے تو اس نے اس اخبار کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ لینن سے جا ملا اور روسی کمیونسٹ پارٹی کا ایک سرگرم ممبر بن گیا۔

یہ اس زمانہ کی بات ہے جب کہ روس میں زار کی حکومت تھی۔ زار کی حکومت لینن کو گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ وہ ایک پہاڑی علاقہ میں روپوش ہو گیا۔ اور وہاں سے ایک خفیہ اخبار کے ذریعہ اپنا پیغام لوگوں تک پہنچاتا رہا۔

انسان کے اندر اگر عمل کا جذبہ ہو تو کوئی رکاوٹ اس کے لئے رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ وہ ہر مشکل میں آسانی کو ڈھونڈ لے گا، وہ ہر گھاٹی میں اپنے لئے راستہ نکال لے گا۔

۱۵ جنوری ۱۹۸۳

ایک مرتبہ میں ٹرین سے کیرالا کا سفر کر رہا تھا۔ اسٹیشن پر اترا تو باہر جاتے ہوئے میرا ایک عیسائی مشنری کا ساتھ ہو گیا۔ راستہ میں باتیں ہوتی رہیں، یہاں تک کہ سڑک کا وہ موڑ آ گیا جہاں سے میرا اور اس کا راستہ الگ ہوتا تھا۔ جب ہم دونوں آخری طور پر رخصت ہونے لگے تو اس نے ایک چھوٹا سا انگریزی میں لیف لٹ نکالا اور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ لیف لٹ میں نے پڑھا اور پھر عرصہ تک وہ میرے پاس رہا۔

یہ ایک قابل تقلید طریقہ ہے۔ ہمارے پاس بھی چھوٹے چھوٹے عمدہ چھپے ہوئے دو ورقہ ہونے چاہئیں جن کو مسلمان اپنے پاس رکھیں اور سفر وغیرہ میں لوگوں تک پہنچائیں۔

۱۶ جنوری ۱۹۸۳

اقبال (۱۹۳۸ - ۱۸۷۶) نے پہلے اپنا یہ مشہور شعر کہا تھا:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اس کے بعد ان کے خیال نے مزید پرواز کی، انھوں نے پر فخر طور پر کہا:

چین وعرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

اقبال کی اس شاعرانہ بلند پروازی پر اکبر الہ آبادی نے کہا تھا:

رقیبوں کو کم سمجھ کر اقبال بول اٹھے ہندوستان کیسا سارا جہاں ہمارا

مگر یہی اقبال تھے جنھوں نے ۱۹۳۰ میں یہ نظریہ پیش کیا کہ ملک کو تقسیم کر کے مسلمانوں کو ایک "پاکستان" دے دیا جائے۔ لفظی دنیا میں اقبال کا مطلوب سارا جہان تھا۔ مگر عمل کی دنیا میں اس کا ایک بے حد چھوٹا

ٹکڑا ان کا مطلوب بن گیا۔

۱۹۳۰ میں اقبال نے مسلم لیگ کے اجلاس (الٰہ آباد) کی صدارت کی تھی۔ اس موقع پر خطبہ پڑھتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ سے میں نے یہ سبق حاصل کیا ہے کہ ان کی تاریخ کے نازک مواقع پر یہ اسلام تھا جس نے مسلمانوں کو بچایا نہ کہ مسلمانوں نے اسلام کو بچایا۔

مگر اسی خطبہ میں انھوں نے علیحدہ مسلم اسٹیٹ یا مسلم ہوم لینڈ کی تجویز بھی پیش کی جس نے بعد کو پاکستان کی شکل میں ایک متعین صورت اختیار کی۔ کیسا عجیب تھا اقبال کا یہ خطبۂ صدارت۔ زبان سے تو انھوں نے یہ کہا کہ اسلام مسلمانوں کو بچاتا ہے۔ اور پروگرام یہ پیش کیا کہ مسلمانوں کے ذریعہ اسلام کو بچاؤ۔

یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں الم تر انہم فی کل واد یہیمون کہا گیا ہے۔

۱۷ جنوری ۱۹۸۳

بائبل میں ایک اسرائیلی پیغمبر نے بنی اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"خداوند آسمان کو جو اس کا اچھا خزانہ ہے تیرے لئے کھول دے گا کہ تیرے ملک میں وقت پر مینھ برسائے اور وہ تیرے سب کاموں میں جن میں تو ہاتھ لگائے برکت دے گا اور تو بہت سی قوموں کو قرض دے گا پر خود قرض نہیں لے گا۔" استثناء ۲۸ : ۱۲

بائبل کی اس آیت میں قرض سے مراد معاشی قرض نہیں ہے بلکہ فکری قرض ہے۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کو فکری قیادت (Intellectual leadership) حاصل ہوگی۔ تم لوگوں سے متاثر نہیں ہوگے بلکہ لوگ تم سے اثر قبول کریں گے۔ تم دوسروں کی تقلید نہیں کروگے بلکہ دوسرے لوگ تمہارا مقلد بننے میں فخر محسوس کریں گے۔ فکری اعتبار سے تم اوپر ہوگے اور دوسرے لوگ نیچے۔

۱۸ جنوری ۱۹۸۳

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔ اسی طرح اس نے تمام چیزوں کو بہترین صورت دی ہے۔ کتنا باعظمت ہے بہترین تخلیق کرنے والا۔

یہ بات بظاہر ایک بیان ہے، مگر درحقیقت وہ زبردست دلیل ہے۔ مثلاً انسان جس نمونہ پر پیدا کیا گیا ہے، اس سے بہتر نمونہ انسان کے تصور میں نہیں آتا۔ دنیا میں بے شمار ماہر آرٹسٹ اور سنگتراش

ہوئے ہیں۔ مگر کوئی ماہر ترین اور ذہین ترین شخص بھی انسان سے بہتر کوئی اور ماڈل انسان کے لئے سوچ نہ سکا۔ انسانی فہم کے مطابق انسان کا موجودہ ماڈل آخری ماڈل ہے، اس سے بہتر کوئی اور انسانی ماڈل ممکن نہیں۔

یہی حال دوسری تمام چیزوں کا ہے۔ شیر جس جسمانی نمونہ پر بنایا گیا ہے وہ اس کا آخری نمونہ ہے۔ اس سے بہتر نمونہ شیر کے لئے کوئی آرٹسٹ دریافت نہ کر سکا۔ اسی طرح درخت کا ماڈل آخری ممکن ماڈل ہے، اس سے بہتر ماڈل کا درخت سوچنے سے انسان عاجز ہے۔ حتیٰ کہ گھاس جس نمونہ پر بنائی گئی ہے وہ بھی اس کا آخری نمونہ ہے۔ اس سے بہتر کوئی نمونہ گھاس کے لئے ذہن میں نہیں آتا۔ چیونٹی، بچھو، ہرن، غرض دنیا کی تمام چیزوں کا یہی حال ہے۔ اس دنیا کی کسی بھی چھوٹی یا بڑی چیز کا دوسرا ماڈل اختراع کرنا انسان کے بس سے باہر ہے۔

جو شخص دنیا کے اس پہلو پر غور کرے گا وہ پکار اٹھے گا: تبارک اللہ احسن الخالقین

۱۹ جنوری ۱۹۸۳

موتی رام صراف نے کہا کہ آجکل یہ حال ہے کہ کوئی شخص سڑک پر کھڑا ہو کر خدا کو برا بھلا کہے تو لوگ اس کو پاگل سمجھ کر گزر جائیں گے۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی گروہ کے پیغمبر یا اس کے بزرگوں کو اسی طرح برا بھلا کہے تو اس گروہ کے لوگ سخت غصہ میں آجاتے ہیں اور فوراً فساد پھوٹ پڑتا ہے۔

میں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آجکل کے لوگ انسان پرست ہیں نہ کہ خدا پرست۔ جس ہستی کو انھوں نے نہ پہچانا اور نہ اس کو معبود بنایا، اس کو برا بھلا کہنے سے ان کو کیوں غصہ آئے گا۔ البتہ جن انسانوں کو انھوں نے معبود کا مقام دے رکھا ہے، جب ان کو کوئی شخص برا کہہ دے تو ان کا بھڑک جانا بالکل فطری ہے۔

۲۰ جنوری ۱۹۸۳

ایک صاحب نے کہا کہ دین میں اتنا زیادہ اختلاف ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ میں نے کہا کہ کس قسم کا اختلاف۔ انھوں نے کہا مثلاً ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ خدا کے لئے واحد کا صیغہ ہی استعمال کرنا چاہئے۔ اگر جمع کا صیغہ استعمال کیا تو جہنم میں جانے کا اندیشہ ہے۔ یعنی خدا رزق دیتا ہے، کہنا چاہئے نہ کہ خدا رزق دیتے ہیں۔ اسی طرح کی عجیب عجیب باتیں۔

میں نے کہا کہ اس کا حل بہت آسان ہے۔ جو شخص آپ سے اس قسم کی بات کہے، اس سے پوچھئے کہ جو بات تم کہہ رہے ہو وہ قرآن میں کہاں لکھی ہے۔ اگر وہ قرآن سے اپنی بات کا ثبوت دے تو مانئے ورنہ مت مانئے۔

پھر میں نے کہا کہ اگر وہ شخص کہے کہ قرآن میں سب بات کہاں ہے۔ تو آپ کہئے کہ پھر حدیث سے اس کا ثبوت دو۔ اور اگر وہ کہے کہ حدیث میں سب بات کہاں ہے تو اس سے کہئے کہ جو بات نہ قرآن میں ہو اور نہ حدیث میں تو ایسی بات کی ہمیں ضرورت بھی نہیں۔

۲۱ جنوری ۱۹۸۳

دو اشخاص یا دو قوموں میں جھگڑا ہو تو عام طور پر لوگ یہ کرتے ہیں کہ اپنے کو صحیح اور دوسرے کو غلط ثابت کرنے میں ساری لسانی طاقت خرچ کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے عمل کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جھگڑا لا متناہی طور پر باقی رہے۔ کیوں کہ جو آپ کر رہے ہیں، وہی لازمی طور پر دوسرا بھی کرے گا۔ ایسی حالت میں جھگڑا ختم کیسے ہو سکتا ہے۔

اس قسم کے جھگڑوں کو ختم کرنے کی ایک ہی صورت ہے، وہ یہ کہ ایک فریق یک طرفہ طور پر اپنی شکایتوں کو ختم کر دے۔ اس طرح وہ زیادہ بہتر طور پر فریق ثانی کو راضی کر سکتا ہے کہ وہ بھی یہی طریقہ اختیار کرے اور نتیجۃً جھگڑا ختم ہو جائے۔

۲۲ جنوری ۱۹۸۳

ایک روایت بخاری اور مسلم اور ترمذی اور نسائی نے اپنی کتابوں میں درج کی ہے اور مسند احمد میں بھی وہ آئی ہے۔ بخاری کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابی بکرۃ رضی اللہ عنہ۔ قال لقد نفعنی اللہ بکلمۃ سمعتُھا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایامَ الجمل، بعد ما کِدتُ اَن اَلحَقَ باصحاب الجمل فأقاتِلَ معھم۔ قال لما بَلَغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انّ اھلَ فارِسَ مَلَّکوا بنتَ کسریٰ قال: لَن یُفلِحَ قومٌ وَلَّوا امرَھُم امراۃً

حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جنگ جمل کے موقع پر مجھے ایک بات سے فائدہ پہنچا جس کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا، جب کہ قریب تھا کہ میں اصحاب جمل سے مل جاؤں۔

اور ان کے ساتھ مل کر جنگ کروں۔ راوی کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی کہ اہل فارس نے اپنے اوپر کسریٰ کی لڑکی کو حاکم بنایا ہے تو آپ نے فرمایا: وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جو عورت کو اپنا حاکم بنائے

اصحاب جمل کی قیادت حضرت عائشہ جیسی خاتون کر رہی تھیں، مگر رسول اللہؐ کا ایک قول ابوبکرہ کے لئے کافی ہوگیا کہ وہ اس معاملہ میں حضرت عائشہ کا ساتھ نہ دیں۔ یہ صحابی کی روش تھی، اب اسی پر پاکستان کے اسلامی مفکرین کا اندازہ کیجئے جنہوں نے ۱۹۶۵ میں خود مس فاطمہ جناح کو صدارت کے لئے کھڑا کیا اور ان کی مکمل تائید کی، اگرچہ وہ الکشن میں ہار گئیں۔

۲۳ جنوری ۱۹۸۳

ایک شخص اپنے دوستوں کے ساتھ روزانہ دریا پر نہانے جایا کرتا تھا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ اس کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اس کو بخار آگیا۔ اس نے اپنے دوستوں سے کہا کہ آج مجھے بخار ہے۔ آج میں نہانے کے لئے نہیں جاؤں گا۔ دوستوں نے اس کی بات کا لحاظ نہیں کیا۔ وہ پرجوش الفاظ بول کر اس کو بھڑکاتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ ان کے ساتھ دریا کے لئے روانہ ہوگیا۔ مگر جب وہ نہا کر لوٹا تو اس کا بخار تیز ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کو نمونیہ اور سرسام ہوگیا اور اسی میں وہ مر گیا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا حال ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان ہر اعتبار سے کمزور ہوگئے تھے۔ دور جدید کے اعتبار سے وہ اپنے کو مستحکم اور طاقت ور نہیں بنا سکے۔ بالفاظ دیگر، وہ "بخار" میں مبتلا تھے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے اس راز کو نہیں سمجھا۔ وہ مسلمانوں کے نادان دوست ثابت ہوئے۔ انھوں نے کام اس کو سمجھا کہ بڑے بڑے الفاظ بول کر مسلمانوں کا جوش ابھار دیں۔ چنانچہ شاعری اور خطابت اور انشاپردازی کے ذریعے وہ قوم کو جہاد و قتال کے لئے ابھارتے رہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان جوش میں آکر دوسری قوموں سے لڑنے لگے۔ تیاری کے بغیر انھوں نے ہر ایک سے ٹکراؤ شروع کر دیا۔ مسلمانوں کا یہ ٹکراؤ عدم تیاری کی بنا پر، ان کے لئے الٹا پڑا۔ ساری دنیا میں وہ یک طرفہ طور پر شکست اٹھاتے رہے۔ ان کا انجام اس شخص کا سا ہوگیا جس کو شدید ٹمپریچر تھا مگر اس کے دوستوں نے اس کا علاج تو نہیں کیا، البتہ جوش دلا کر اس کو دریا میں کدا دیا۔

قدریں نہ ٹوٹتیں اور ملک آج کہیں زیادہ کامیاب اور ترقی یافتہ ہوتا۔ اس کی مثال وہ ممالک ہیں جہاں آزادی تدریج کے ساتھ آئی۔ مثال کے طور پر آسٹریلیا۔

۲۷ جنوری ۱۹۸۳

ہر آدمی کے ماضی میں اچھی باتیں بھی ہوتی ہیں اور بری باتیں بھی۔ ہر آدمی سے دوسروں کے لئے کچھ قابل تعریف باتیں سرزد ہوتی ہیں اور کچھ قابل شکایت باتیں۔

کسی آدمی سے آپ کا بناؤ ہو تو اس کو آپ کی اچھی باتیں یاد آئیں گی۔ اور اگر اس سے آپ کا بگاڑ ہو جائے تو اس کو آپ کی صرف بری باتیں یاد آنے لگیں گی۔ ایسی حالت میں کسی آدمی کے لئے بہترین عقلمندی یہ ہے کہ وہ دوسروں سے اپنے تعلقات کو بگڑنے نہ دے، حتی کہ اگر یہ نوبت آجائے کہ تعلقات کو معتدل رکھنے کے لئے اس کو یک طرفہ طور پر کچھ برداشت کرنا پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کرے۔ یہ ابتدائی قربانی اس نقصان سے بہت کم ہے جو تعلقات کے بگاڑ کی صورت میں آدمی کو اٹھانی پڑتی ہے۔

۲۸ جنوری ۱۹۸۳

اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام میں باقاعدہ تبلیغ کا کام صرف دور اول میں ہوا ہے۔ اس کے بعد اسلام زیادہ تر اپنے آپ پھیلتا رہا ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ساتھ خصوصی طور پر ایسے اسباب جمع کر دئے تھے کہ تبلیغ کے بغیر اس کی تبلیغ ہوتی رہے۔

اسلام سے پہلے جو مذاہب آئے، وہ عام طور پر تبلیغ کے مرحلہ میں رہے، وہ غلبہ کے مرحلہ تک نہیں پہنچے۔ مگر اسلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ خصوصی معاملہ ہوا کہ اسلام کو عالمی سطح پر ایک غالب تہذیب کے درجہ تک پہنچا دیا گیا۔ جب ایسا ہوتا ہے تو الناس علیٰ دین ملوکہم کا معاملہ پیش آنے لگتا ہے۔ لوگ باقاعدہ تبلیغ کے بغیر صرف تہذیبی دباؤ کے تحت اس کے نظریات اور اس کے عقائد کو اختیار کرنے لگتے ہیں۔ اسلام کی بعد کی تاریخ میں یہی عمل برابر ہوتا رہا۔ چنانچہ کہ جیسی باقاعدہ تبلیغ کے بغیر اسلام ساری دنیا مسلسل پھیلتا رہا۔

تاہم یہ صرف سیاسی اقتدار اور تہذیبی غلبہ کی بات نہیں ہے۔ صحابہ کے دور میں جو اسلامی انقلاب ظہور میں آیا، اس کے نتیجے میں ایسے مستقل اسباب پیدا ہو چکے ہیں کہ ہمیشہ کے لئے یہ صورت حال

جاری رہے کہ تبلیغ کے بغیر اسلام کی تبلیغ ہوتی رہے۔ اگرچہ عمل تبلیغ کی اہمیت باقی ہے اور اس کے لئے بے پناہ ثواب کا امکان بدستور موجود ہے، مگر بعد کے حالات کے نتیجہ میں ایسا ہو چکا ہے کہ مسلمان اگر تبلیغ کی ایجابی کوشش نہ کریں، وہ صرف اتنا کریں کہ تبلیغی عمل کو روکنے والے سلبی عمل سے باز رہیں، تب بھی اسلام برابر پھیلتا رہے گا۔ اس کا سیلاب رکنے والا نہیں۔

اسلام کے زیر اثر دنیا میں سائنسی انقلاب آیا۔ اس نے قدیم توہماتی نقطۂ نظر کو ختم کرکے علمی نقطۂ نظر پیدا کیا۔ ہر آدمی کے اندر فطری طور پر خدا اور مذہب کی تلاش کا جذبہ چھپا ہوا ہے۔ قدیم ماحول میں یہ فطری جذبہ مذہبی تعصب اور آبائی تقلید کے نیچے دبا رہتا تھا، اب آزادیٔ خیال کا دور ہے۔ اب ہر آدمی آزاد ہے کہ وہ کھلے غور و فکر کے ذریعہ کوئی رائے قائم کرے۔ تاریخی تحقیقات نے اب یہ ثابت کر دیا ہے کہ دوسرے تمام مذاہب محض روایات پر قائم ہیں، وہ ٹھوس تاریخی بنیاد سے محروم ہیں، جب کہ اسلام مکمل طور پر ثابت شدہ مذہب ہے، وہ تاریخی معیار پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ وغیرہ۔

اس طرح کی مختلف چیزیں ہیں جنھوں نے اسلام کے اندر ایک ذاتی زور پیدا کر دیا ہے، وہ انسان سے اپنی صداقت اپنے آپ منواتا ہے۔

مسلمان اگر باقاعدہ دعوت و تبلیغ کا کام کریں تو انھیں بے انتہا ثواب اور انعام ملے گا لیکن اگر وہ اتنا بھی کریں کہ وہ سلبی کارروائی سے باز رہیں تو اسلام کی اشاعت کے لئے یہی کافی ہے۔ بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے یہ سلبی کارروائی بہت بڑے پیمانہ پر انجام دی ہے۔ انھوں نے دیگر اقوام کے مقابلہ میں ایسی تحریکیں چلائیں جس کے نتیجہ میں مسلمانوں اور دوسری قوموں میں نفرت اور تناؤ کی فضا پیدا ہو گئی۔ یہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سب سے بڑا جرم ہے، کیوں کہ اس فضا نے اسلام کی اشاعت کے عمل کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔

۲۹ جنوری ۱۹۸۳

پہلے میں سوچتا تھا کہ موجودہ زمانہ میں تبلیغ دین کا کام نہیں ہو رہا ہے۔ بالفاظ دیگر، الہامی شریعت سے لوگوں کو واقفیت نہیں۔ پھر آخرت میں کس بنیاد پر ان کا حساب لیا جائے گا۔ مگر آجکل بنگلور کا جو حال ہے اس نے مجھے اس سوال کا جواب دے دیا۔

ایک ہے شرعی بنیاد، اور ایک ہے اخلاقی بنیاد۔ شرعی بنیاد مقدس کتاب کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر اخلاقی بنیاد خود اپنی ضمیر اور عقل کے ذریعہ لوگوں کو پیشگی طور پر معلوم ہے۔ آجکل یہ خیال ہے کہ تمام اخلاقی حدیں ٹوٹ گئی ہیں۔ ہر آدمی اپنے آپ کو آزاد سمجھتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے اور جس طرح چاہے رہے۔

یہ صورت حال دیکھ کر مجھے خیال آتا ہے کہ شرعی بنیاد تو درکنار۔ لوگ اخلاقی بنیاد ہی پر اپنے آپ کو ڈسکریڈٹ کر رہے ہیں۔ آج کا انسان جس لوٹ کھسوٹ اور جس بددیانتی اور بے انصافی میں مبتلا ہے، اس کا برا ہونا اس کو خود اپنے ضمیر اور اپنے شعور کے تحت پوری طرح معلوم ہے، اب اگر اس کو شرعی بنیاد کا علم نہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیوں کہ جو بنیاد اس کو اچھی طرح معلوم، اسی بنیاد پر وہ اپنے آپ کو مجرم ثابت کر چکا ہے۔ اس انسان کو اگر خدا پکڑے تو وہ یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں کہ آپ ہم کو اس چیز کے لئے پکڑ رہے ہیں جس کا ہمیں کوئی علم نہ تھا۔

۳۰ جنوری ۱۹۸۳

حدیث کا مطالعہ امت میں جتنے بڑے پیمانے پر کیا گیا، اتنے بڑے پیمانہ پر قرآن کا مطالعہ نہیں کیا گیا۔ مگر حدیث کا وہ عملی فائدہ امت کو نہ پہنچ سکا جو امت کو اس سے پہنچنا چاہئے تھا۔ اس کی کم از کم ایک خاص وجہ یہ ہے کہ احادیث میں بہت زیادہ اختلافات ہیں۔ امت کے علما چوں کہ ان اختلافات میں تطبیق کا کوئی متفقہ معیار دریافت نہ کر سکے، اس لئے حدیث کا مطالعہ بہت بڑے پیمانہ پر اختلافات پیدا کرنے کا سبب بن گیا۔

حدیث کے اختلافات میں تطبیق کا میرے نزدیک واحد قابل عمل معیار یہ ہے کہ اس کو حالات کے اختلاف پر محمول کیا جائے۔ یعنی یہ مانا جائے کہ انسانی حالات چوں کہ ہمیشہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں، اس لئے حدیثوں میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا۔ کیوں کہ حدیثیں زیادہ تر وہ نصیحتیں ہیں جو مختلف حالات کے اعتبار سے مختلف اوقات میں لوگوں کو دی گئیں۔

ایک مثال لیجئے۔ آپ اگر حدیث کی کتابوں میں "اشربہ" کا باب پڑھیں تو آپ پائیں گے کہ مختلف روایتوں میں واضح اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً بخاری اور دوسری کتب حدیث میں یہ روایتیں موجود ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پانی پیا، اسی طرح صحابہ کرام نے کھڑے ہو کر پانی پیا۔

دوسری طرف ایسی بھی حدیثیں ہیں جن میں واضح لفظوں میں کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع کیا گیا ہے۔ مثلاً مسلم اور ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا۔ (نھیٰ عن الشرب قائماً) اس مضمون کی روایتیں مختلف کتب حدیث میں الفاظ کے فرق کے ساتھ آئی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے: لا یشربن احدکم قائماً۔

اس اختلاف کی توجیہہ وتطبیق میں بڑی بڑی بحثیں کی گئی ہیں۔ کچھ لوگوں نے ایک نوعیت کی حدیث کی تضعیف کر کے دوسری نوعیت کی حدیث کو تسلیم کیا ہے۔ کسی نے ایک کو ناسخ اور دوسرے کو منسوخ قرار دیا ہے۔ امام نووی نے ممانعت کو کراہت تنزیہی پر محمول قرار دیا ہے، اور رسول اللہ اور صحابہ کرام کے کھڑے ہو کر پانی پینے کو جواز کے درجہ میں رکھا ہے۔

مگر میرے نزدیک ان میں سے کوئی توجیہہ بھی درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ فرق حالات کی بنا پر ہے۔ نارمل حالات میں ایک شخص خواہ بیٹھ کر پانی پئے یا کھڑے ہو کر، اس سے کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا۔ مگر ایک شخص مثلاً بھاگا ہوا چلا آرہا ہے۔ وہ آتا ہے اور ہانپتے ہوئے کہتا ہے کہ پیاس لگ رہی ہے، پانی لاؤ۔ اب اس کے سامنے پانی لایا جاتا ہے۔ وہ کھڑے کھڑے وہیں پینے لگتا ہے۔ تو ایسے شخص کے بارہ میں یہی کہا جائے گا کہ بیٹھ کر پانی پیو۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ جب دو قسم کا حکم ہے تو لازماً ایک مطلوب ہوگا اور دوسرا غیر مطلوب۔ حالانکہ یہ مفروضہ غلط ہے۔ یقیناً بعض اوقات اس بنا پر بھی فرق ہوتا ہے۔ مگر بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیک وقت دونوں حکم مطلوب ہوتے ہیں، کوئی حکم ایک قسم کے حالات میں، اور کوئی حکم دوسرے قسم کے حالات میں۔

۳۱ جنوری ۱۹۸۲

اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ بڑا عجیب زمانہ ہے۔ ایک طرف اس کی صورت میں ملک کو ایک ایسا بادشاہ حاصل تھا جس کی سادگی، اخلاص اور تقویٰ پر سب لوگوں کا اتفاق ہے۔ دوسری طرف اس کو حکومت کے لئے نہایت طویل وقفہ ملتا ہے جس میں وہ یہ کامیابی حاصل کرتا ہے کہ پورے ملک میں شرعی قانون نافذ کر دیتا ہے۔ ملک بھر کے علماء کو جمع کر کے فتاویٰ عالمگیری مرتب کراتا ہے، وغیرہ وغیرہ

مگر اسی اورنگ کے زمانہ میں اخلاقی زوال کی مثالیں بھی انتہا درجہ پر نظر آتی ہیں۔ اورنگ زیب

کی اپنی فوج کا یہ حال تھا کہ اس کے سردار مرہٹوں سے مل جاتے تھے۔ حتیٰ کہ خود مغل کے شہزادے بھی غداری کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ مثلاً ستارہ میں اورنگ زیب کی فوجیں شہزادہ محمد اعظم کے ماتحت تھیں۔ مرہٹے شہزادہ کو اس بات پر راضی کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ ان کی رسد رسانی میں رکاوٹ نہ ڈالے گا۔ چنانچہ وہ قلعہ جس میں محاصرہ کے وقت صرف دو ماہ کی رسد تھی، چھ ماہ تک بھی ختم نہ ہوا۔ ۱۷۰۴ میں جب اورنگ زیب جنوبی دکن چھوڑ کر کھیڑہ کی طرف روانہ ہوا تو تھوڑے ہی دنوں میں ستارہ، برنالہ، پاوگڑھ کے قلعے مغلوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔

اورنگ زیب کو خود بھی ان اخلاقی کمزوریوں کا بخوبی علم تھا۔ وہ اپنے رقعات میں بار بار اس کا ذکر کرتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتا ہے: آدم ہوشیار، امانت دار، خدا ترس، آباداں کار کم یاب:

نیست جز آدم دریں عالم کہ بسیار است ذمیت

وہ ایک اور جگہ لکھتا ہے: حالا یکس برائے دیوانی بنگالہ کہ بہ حلیہ راستی وکاردانی آراستہ باشد می خواہم، یافتہ نمی شود۔ از نایابی آدم کار آہ آہ (بنگال کی دیوانی کے لئے میں ایک شخص چاہتا ہوں جو سچا اور معاملہ فہم ہو، مگر وہ نہیں ملتا۔ کام کے آدمی نہ ملنے پر افسوس)

اورنگ زیب کے زمانہ میں اسلامی اقتدار، علماء، صوفیا، قانون اسلامی کا نفاذ ہر چیز موجود تھا۔ اس کے باوجود سارا معاملہ بگڑا ہوا تھا۔ اس واقعہ کو تین سو سال گزر چکے ہیں مگر اس پوری مدت میں مجھے کوئی ایک شخص بھی نہیں معلوم جس نے اس سے صحیح سبق لیا ہو۔ ہر شخص تقریباً اسی نہج پر سوچتا رہا جس کا اظہار بعد کو اقبال نے اس طرح کیا تھا:

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

کسی نے یہ نہ سوچا کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی (مثلاً سید احمد شہید بریلوی کے زمانہ میں) اس مٹی کو بار بار نم کیا گیا۔ بلکہ اس کو جل تھل کر دیا گیا، اس کے باوجود وہ زرخیز نہ ہوئی۔

اصل یہ ہے کہ مسلمان کے نام سے اب جو قوم ہے وہ پوری طرح زوال کا شکار ہے۔ اس کے افراد میں جان نہیں رہی۔ اس کا اظہار اورنگ زیب کے زمانہ میں ہو گیا تھا۔ اس کا واحد حل صرف یہ تھا کہ غیر مسلم اقوام میں تبلیغ کی جائے، تاکہ ان کے اندر سے جاندار افراد نکل کر مسلمانوں کے

درمیان شامل ہوں۔ اس طرح "نیا خون" ملنے سے مسلمانوں کی صف میں جان آئے گی اور وہ اسلام کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو سکیں گے۔ مگر اس مدت میں مسلمانوں نے سب کچھ کیا مگر وہی ایک کام نہ کیا جس کا کرنا سب سے زیادہ ضروری تھا۔

یکم فروری ۱۹۸۳

میرا شروع سے یہ طریقہ رہا ہے کہ جب میرے ذہن میں کوئی نیا خیال آتا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ کوئی ہو جس سے میں اس کے بارہ میں بات کروں۔ اس طرح کی گفتگو سے اپنے خیال کو مزید واضح کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اسی طرح جب میں کوئی مضمون حتی کہ کوئی خط لکھتا ہوں تب بھی میں چاہتا ہوں کہ کوئی ہو جس کو اسے دکھاؤں اور اس کے بارہ میں اس کا ردعمل معلوم کروں۔ اس معاملہ میں میرا طریقہ وہی ہے جس کا ذکر نصف شب کی آزادی (Freedom at Midnight) کے مصنفین نے کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب کے ہر باب کو لکھ کر ایک خاتون کو دکھاتے تھے اور اس کے بارہ میں اس کا ردعمل معلوم کرتے تھے۔ اس طرح تبادلہ اور تنقیح کرتے ہوئے انھوں نے اپنی پوری کتاب مرتب کی۔

یہ کام میں اپنی پوری علمی اور تحریری زندگی میں کرتا رہا ہوں۔ مثال کے طور پر "تعبیر کی غلطی" اور "مذہب اور جدید چیلنج" کا مسودہ میں نے پیشگی طور پر کئی لوگوں کو پڑھایا۔ اس کے بعد ان کو شائع کیا۔

۱۹۶۷ میں جب میں دہلی آیا تو جلد ہی میرے بچے بھی دہلی آ گئے۔ اس کے بعد سے اس نوعیت کا کام میں سب سے زیادہ اپنی لڑکی فریدہ خانم سے لیتا رہا ہوں۔ اس کو ایک عام قاری فرض کرتے ہوئے میں اپنی اکثر تحریریں پیشگی طور پر اس کو دکھاتا ہوں۔ اس سے خطوط کے جواب لکھواتا ہوں۔ نئے خیالات پر اس سے گفتگو کرتا ہوں۔ اس طرح ایک طرف مجھے ایک "عام قاری" کے ردعمل کا پیشگی اندازہ ہوتا رہتا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہوتی ہے کہ اس عمل کے دوران خود فریدہ خانم کی ذہنی تربیت ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ اب میرا خیال ہے کہ میرے مشن کو جتنا زیادہ فریدہ خانم نے سمجھا ہے غالباً کسی اور نے نہیں سمجھا ہے۔ نہ کسی مرد نے اور نہ کسی عورت نے۔

۲ فروری ۱۹۸۳

عربی کا ایک مقولہ ہے:

لاتجادل احمق فیصعب علی الآخرین تمییز ایکما الاحمق۔
بے وقوف سے جھگڑا نہ کرو کہ دوسروں کو یہ پہچاننا مشکل ہو جائے کہ دونوں میں سے کون بے وقوف ہے۔

ایک آدمی جھگڑے کی بات کرے اور دوسرا آدمی برداشت کرکے جھگڑے سے الگ ہو جائے۔ تو دونوں میں فرق نظر آئے گا۔ ایک جھگڑنے والا ہوگا اور دوسرا چپ رہنے والا۔ یہ فرق دونوں کے اخلاقی فرق کو لوگوں کے سامنے نمایاں کر دے گا۔ لوگ اپنے آپ پہچان لیں گے کہ کون شریف ہے اور کون غیر شریف۔

اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ ایک شخص جھگڑا شروع کرے اور پھر دوسرا شخص بھی اس سے جھگڑنے لگے تو دونوں کی حالت برابر ہو جائے گی۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر ایسا ہوگا کہ لوگ دونوں کو یکساں سمجھنے لگیں گے۔

۳ فروری ۱۹۸۳

اگر کوئی شخص کہے کہ میں پانی کے بجائے پٹرول پیوں گا، یا یہ کہ میں دریا میں کشتی کے بغیر چلوں گا تو عقلمند آدمی ایسے شخص کو فوراً منع کرے گا۔ کیوں کہ یہ اس قانون کے خلاف ہے جو قدرت نے اس دنیا کے لئے مقرر کیا ہے۔ قدرت کا مقرر کیا ہوا طریقہ یہ ہے کہ ہم پانی سے اپنی پیاس بجھائیں اور کشتی کے ذریعہ دریا کو پار کریں۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو صد فی صد اسی قانون قدرت کی پیروی کرنی ہے۔ جو شخص اس کے خلاف چلے گا اس کے لئے ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا ہے۔ اس دنیا میں انسان کے لئے کامیابی حاصل کرنے کا ایک مقررہ طریقہ ہے۔ یہ طریقہ کائناتی سطح پر قائم ہے۔ انسان کو بھی اس کی پیروی کرنی ہے۔ یہ طریقہ ایک لفظ میں (Conversion) ہے۔

اس دنیا میں ہر چیز کنورزن کے اصول پر ترقی کرتی ہے۔ یعنی ادنیٰ کو اعلیٰ میں کنورٹ کرنا۔ سورج کیا ہے، سورج غیر روشن مادہ کو روشن مادہ میں کنورٹ کرنے کا دوسرا نام ہے۔ ایک درخت کب سرسبز درخت بنتا ہے۔ اس وقت جب کہ وہ اس صلاحیت کا ثبوت دے کہ وہ پانی اور مٹی اور معدنیات جیسی غیر نباتی چیزوں کو نباتی چیزمیں کنورٹ کرسکے۔ وہ مٹی کو پتی اور پھول پھل جیسی چیزوں میں تبدیل کرسکے۔ یہی حال جانوروں کا ہے۔ گائے گھاس کھاتی ہے اور گھاس کو دودھ میں کنورٹ

کرتی ہے۔

انسان کا معاملہ بھی ٹھیک یہی ہے۔ ہر انسان جسمانی سطح پر اسی قانون قدرت کے تحت عمل کرتا ہے۔ وہ اپنے اندر غلہ اور سبزی داخل کرتا ہے اور اس کو گوشت اور خون میں کنورٹ کرتا ہے۔ کوئی آدمی اسی وقت زندہ رہتا ہے جب تک وہ اس صلاحیت کا ثبوت دے۔ جس دن وہ اپنے اندر سے اس صلاحیت کو کھودے اسی دن اس کی موت واقع ہو جائے گی۔

سماجی زندگی میں بھی آدمی کو اسی استعداد کا ثبوت دینا ہے۔ اس کو مشکلات میں آسانی کا راز دریافت کرنا ہے۔ اس کو اپنے ڈس ایڈوانٹج کو ایڈوانٹج میں تبدیل کرنا ہے۔ اس کو اپنے نہیں کو ہے بنانا ہے۔ یہی زندگی کا واحد راز ہے۔ جو لوگ ایسا نہ کرسکیں ان کے حصہ میں بے فائدہ شکایت اور احتجاج کے سوا کچھ اور آنے والا نہیں۔

۴ فروری ۱۹۸۳

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: استعینوا علی قضاء حوائجکم بالکتمان فان کل ذی نعمۃ محسود

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی ضرورتیں پوری کرنے میں اخفاء سے مدد لو۔ کیوں کہ ہر شخص جس کو نعمت ملے اس سے لوگ حسد کرنے لگتے ہیں۔

حسد اس دنیا کا سب سے زیادہ عام مرض ہے۔ حسد کو لوگوں کے اندر سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ لوگوں کے حسد سے بچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ اپنے کاموں میں حتی الامکان اخفاء اور رازداری کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

۵ فروری ۱۹۸۳

حضرت عمر فاروق اپنی خلافت کے زمانہ میں حج کے لئے گئے۔ انھوں نے حاجیوں کی کثرت کو دیکھ کر کہا: الوفد کثیر والحج قلیل (لوگ بہت ہیں مگر حج کم ہے)

حضرت عمر کو یہ بات اس زمانہ میں محسوس ہوئی جو کہ نبوت سے قریب کا زمانہ تھا۔ آج اگر حضرت عمر آئیں اور موجودہ حاجیوں کا حال دیکھیں تو ان کا تاثر کیا ہوگا۔ حضرت عمر کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں اصل اہمیت کی چیز کیفیت ہے نہ کہ کمیت

۶ فروری ۱۹۸۳

عراق نے ستمبر ۱۹۸۰ میں ایران (خوزستان) پر حملہ کیا تھا۔ اس کے بعد ایرانی لیڈر آیات اللہ روح اللہ خمینی نے اپنی ایک تقریر میں کہا:

جرم ما این است کہ اسلام را می خواہیم

ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم اسلام کو چاہتے ہیں۔

مگر واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔ امام خمینی کو جب ایران پر غلبہ حاصل ہوا تو پہلا کام انھوں نے یہ کیا کہ اپنے مخالفین کو پکڑ کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ حالاں کہ یہ اسلامی طریقہ کے سراسر خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب مکہ پر غلبہ حاصل ہوا تو وہاں آپ کے سخت ترین دشمن اور مخالف موجود تھے۔ مگر آپ نے انھیں قتل کرنے کے بجائے انھیں معاف کر دیا۔ اس اسوۂ رسول کے مطابق امام خمینی کو عمومی معافی کا اعلان کرنا چاہئے تھا نہ کہ عمومی قتل کا۔

امام خمینی کے ساتھی یہ کہتے ہیں کہ انقلاب کے بعد ایران میں جن لوگوں کو قتل کیا گیا وہ سب منافق تھے۔ یہ اور زیادہ لغو بات ہے۔ کیوں کہ قرآن اور حدیث میں کہیں بھی یہ حکم نہیں ہے کہ منافق کو قتل کر دو۔ قتل کا حکم مرتد کے لئے ہے نہ کہ منافق کے لئے۔

اگر یہ کہا جائے کہ امام خمینی نے جن لوگوں کو قتل کرایا وہ سب مرتد تھے تو یہ بھی سراسر لغو بات ہے۔ کیوں کہ مرتد وہ نہیں ہے جس کو کوئی مفتی مرتد کہے، مرتد وہ ہے جو خود اپنے ارتداد کا اعلان کرے۔ اور یہ یقینی ہے کہ ان لوگوں نے اپنے ارتداد کا اعلان نہیں کیا تھا۔

۷ فروری ۱۹۸۳

ایک صحابی اصحاب رسول کی روش کے بارہ میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب ہم لوگ سفر میں ہوتے تھے اور کسی منزل پر پڑاؤ کے لئے اپنی سواریوں سے اترتے تھے تو ہم اس وقت تک عبادت میں مشغول نہیں ہوتے تھے جب تک ہم اپنے اونٹوں کے کجاوے کھول نہ لیتے تھے۔ (لا نسبح حتی نحل الرحال) (ابو داؤد، آداب السفر)

اس چھوٹے سے واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن کا مزاج کیا ہے۔ یہ مومنانہ مزاج نہیں ہے کہ آدمی گھوڑے یا اونٹ پر سفر کر رہا ہو اور کہیں ٹھہرے تو فوراً وضو کر کے نماز کے لئے کھڑا ہو جائے اور

جانور کو اسی حالت میں چھوڑ دے۔ اس کو چاہئے کہ پہلے وہ جانور کو ہلکا کرے۔ اس کو سایہ اور چارہ دے اور اس کی راحت کا انتظام کرے۔ پھر عبادت الٰہی میں مشغول ہو۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن دوسروں کے بارہ میں کتنا زیادہ حساس ہوتا ہے، حتی کہ جانوروں کے بارہ میں بھی۔

۸ فروری ۱۹۸۳

پلوٹارک (Plutarch) ایک یونانی مصنف ہے۔ وہ حضرت مسیح کا ہم عصر تھا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ آج تاریخی طور پر پلوٹارک کے بارہ میں ہم کو اس سے زیادہ معلومات حاصل ہیں جتنا حضرت مسیح کے بارہ میں حاصل ہیں۔ اس کی یونانی زبان میں لکھی ہوئی کتاب (Bioi Paralleloi) کا اصل نسخہ ابھی تک موجود ہے۔ یہ نسخہ اپنی اصل زبان میں ۱۵۱۷ میں شائع ہوا۔ تقریباً تمام قابل ذکر زبانوں میں اس کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ انگریزی زبان میں پہلی بار سر ٹامس نارتھ نے اس کا ترجمہ شائع کیا۔ یہ ترجمہ ۱۵۷۹ میں (Parallel Lives) کے نام سے چھپا۔

پلوٹارک نے اپنی اس کتاب میں یونانی اور رومی ہیروؤں کے واقعات بیان کئے ہیں۔ یہ واقعات بڑے عجیب ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ یونانیوں اور رومیوں میں کون سے اعلیٰ اخلاقی اوصاف تھے جنھوں نے ان کو ایک زمانہ میں تمام دنیا میں سب سے اونچا مقام دے دیا۔

مثلاً اس میں ایک رومی جنرل کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ ایک ملک میں فتوحات کرتے ہوئے اس کے قلعہ تک پہنچا۔ یہ قلعہ بہت بڑا تھا اور اس میں ضرورت کا تمام سامان موجود تھا۔ چنانچہ وہ لوگ قلعہ کا پھاٹک بند کر کے بیٹھ گئے۔ رومی جنرل کی فوج قلعہ کے باہر گھیرا ڈالے پڑی ہوئی تھی مگر ابھی اسے فتح نہیں کر پائی تھی۔

اس درمیان میں ایک واقعہ ہوا۔ قلعہ کے اندر ایک اسکول تھا جس میں بڑے بڑے سرداروں کے لڑکے پڑھتے تھے۔ اسکول کے استاد کے ذہن میں آیا کہ اس نازک موقع پر اگر میں رومی فوج کی مدد کروں تو قلعہ فتح کرنے کے بعد وہ مجھے بہت انعام دیں گے اور میرا رتبہ بڑھائیں گے۔ چنانچہ اس نے خاموشی کے ساتھ ایک روز بچوں کو ساتھ لیا اور ان کو بہلاتے ہوئے قلعہ کے پوشیدہ راستہ پر لے گیا۔ وہ اس راستہ سے گزر کر بچوں سمیت باہر آ گیا۔ اب وہ رومی جنرل سے ملا۔ اس نے کہا کہ یہ بڑے

بڑے سرداروں کے بچے ہیں، ان کو آپ بند ھک رکھ لیجئے اور پھر آپ کو موقع مل جائے گا کہ آپ دباؤ ڈال کر قلعہ والوں کو اپنی شرائط ماننے پر مجبور کر سکیں۔

پلوٹارک کا بیان ہے کہ رومی جنرل یہ سن کر خوش نہیں ہوا۔ اس نے مذکورہ استاد کو بری طرح ڈانٹا اور کہا کہ ہمارا یہ طریقہ نہیں کہ ہم کمینہ پن کے ساتھ قلعہ کو فتح کریں۔ ہم جو کچھ کریں گے بہادری کے ساتھ کریں گے۔ تم فوراً ان بچوں کو واپس لے جاؤ اور ہم کو تم قلعہ کا پوشیدہ راستہ بھی مت بتاؤ۔ استاد جب بچوں کو لے کر قلعہ کے اندر واپس آیا اور پوری کہانی بتائی تو اہل قلعہ بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ ایسے شریف لوگوں سے ہمیں جنگ نہیں کرنی ہے۔ چنانچہ انھوں نے خود اپنی طرف سے قلعہ کے دروازے کھول دئے۔

شرافت اور بلند اخلاقی اس دنیا میں سب سے بڑی طاقت ہیں۔ اگرچہ نادان آدمی تشدد اور ہتھیار کو سب سے بڑی طاقت سمجھ لیتا ہے۔

۹ فروری ۱۹۸۳

ہندستان کا چھٹا عام الکشن مارچ ۱۹۷۷ میں ہوا۔ اس الکشن میں جامع مسجد دہلی کے شاہی امام سید عبداللہ بخاری نے کانگرس کے مقابلہ میں جنتا پارٹی کا ساتھ دیا۔ الکشن کے دوران وہ کانگرس کی مخالفت اور جنتا پارٹی کی حمایت میں دھواں دھار تقریریں کرتے رہے۔ ایمرجنسی کے نفاذ کی وجہ سے ہندستانی عوام اندرا گاندھی اور کانگرس کے خلاف ہو گئے تھے۔ چنانچہ الکشن ہوا تو جنتا پارٹی جیت گئی اور کانگرس کو بری طرح شکست ہوئی۔

۲۴ مارچ کو اس جیت کی خوشی میں رام لیلا گراؤنڈ (دہلی) میں جلسہ ہوا اس میں جنتا پارٹی کے تمام لیڈر موجود تھے۔ سید عبداللہ بخاری نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا "آج سارے ہندستان کے ہندو اور مسلمان ایک ہیں۔ عربوں کا جہاں خون گرے گا وہاں ہندستان کا بھی خون گرے گا"۔ ڈائس پر بیٹھے ہوئے ایک ہندو لیڈر نے کہا "نہیں، جہاں عربوں کا پسینہ گرے گا وہاں ہمارا خون گرے گا"۔ اور پھر تالیوں سے جلسہ گاہ گونج اٹھی۔

۲۵ مارچ ۱۹۷۷ کو جمعہ تھا۔ جامع مسجد میں رویندر پرتاپ سنگھ (سنجے گاندھی کو ہرانے والے جنتا امیدوار) کا استقبال ہوا۔ اس موقع پر امام بخاری اور رویندر پرتاب دونوں نے تقریریں کیں۔

مسلم حاضرین اس قدر جوش میں تھے گویا کہ انھوں نے دوبارہ ہندستان فتح کرلیا ہے۔ مولوی بشیر احمد ارشد امینی (میواتی) میرے قریب بیٹھے تھے۔ وہ جذبات سے بے قابو ہو کر کھڑے ہوگئے اور چلا چلا کر کہنے لگے: شاہی امام زندہ باد، شاہی امام زندہ باد۔ یہ تو وہاں کے مسلمانوں کا حال تھا اور میرا حال یہ تھا کہ میں مسلسل رو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا اس قسم کی جذباتی قوم دنیا میں اپنے لئے کوئی جگہ پا سکتی ہے۔

۲۶ مارچ ۱۹۷۷ کو پرانی دہلی کی دیواروں پر بڑے بڑے اردو پوسٹر نظر آئے۔ ان پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا:

۶۲ کروڑ عوام کے بے تاج بادشاہ مولانا سید عبداللہ بخاری

یہ سیرت کے ایک جلسہ کا پوسٹر تھا جس میں امام بخاری شرکت کرنے والے تھے اور اس میں ان کا نام مذکورہ شاندار الفاظ میں درج کیا گیا تھا۔

دور اول میں مسلمانوں کو بھی فتوحات حاصل ہوئیں تب بھی انھوں نے اس قسم کی خوشیاں نہیں منائیں اور نہ کسی نے ان کی زبان سے اس قسم کے بڑے بڑے الفاظ سنے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان اپنی مزعومہ فتوحات پر اس طرح خوشیاں مناتے ہیں جیسے کہ انھوں نے ساری دنیا فتح کرلیا ہو۔ حالانکہ بار بار کے واقعات یہ بتاتے رہے ہیں کہ ان کی یہ فتوحات بھی جھوٹی تھیں اور یہ خوشیاں بھی جھوٹی۔

۱۰ فروری ۱۹۸۳

لوئی ہیتھ لیبر (Louise Heath Leber) نے کہا ہے کہ ارتقاء کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ یہ گھر کا سب سے بڑا کمرہ ہے:

There's always room for improvement. It's the biggest room in the house.

تاہم یہ بات صرف انسانی مصنوعات کے لئے صحیح ہے، خدائی مصنوعات کے لئے یہ بات صحیح نہیں۔ مکان نئے نئے قسم کے بنتے ہیں۔ کار کے ماڈل میں ترقی ہوتی رہتی ہے۔ ٹائپ رائٹر ایک کے بعد دوسرا آتا ہے جو پہلے سے بہتر ہوتا ہے اور زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ مگر قدرت نے جو چیزیں بنائی ہیں، ان میں سے ہر چیز اپنے آخری ماڈل پر بنی ہے۔ ہر چیز گویا آخری معیاری نمونہ ہے جس میں کوئی

مزید ترقی کم از کم انسان کے لئے ممکن نہیں۔

انسان کا ماڈل آخری ماڈل ہے۔ کوئی آرٹسٹ آج تک "انسان" کے لئے دوسرا اس سے بہتر ماڈل تجویز نہ کرسکا، اسی طرح شیر، بلی، درخت، گھاس، غرض ہر چیز چھوٹی بڑی چیز کی صورت اپنی آخری حد پر ہے۔ وہ جس ماڈل پر بنی ہے، اس کے لئے اس سے بہتر کوئی اور ماڈل تصور میں لانا ممکن نہیں۔

یہ ایک واضح ثبوت ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کے پیچھے ایک کامل خدا کا ہاتھ ہے۔ کائنات اگر محض اندھے ارتقائی عمل کے ذریعہ وجود میں آتی تو یہ ناممکن تھا کہ اس میں کاملیت کی یہ صفت پائی جائے۔

۱۱ فروری ۱۹۸۳

عن سهل بن معاذ عن ابيه۔ قال غزونا مع النبى صلى الله عليه وسلم۔ فضيق الناس منازل وقطعوا الطريق۔ فبعث النبى صلى الله عليه وسلم مناديا ينادى فى الناس ان من ضيق منزلا او قطع طريقا فلا جهاد له (ابو داؤد)

سہل بن معاذ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ کیا۔ راستہ میں پڑاؤ ہوا تو لوگوں نے خیمے قریب قریب لگالئے اور راستہ تنگ کردیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک منادی کو بھیج کر لوگوں کے درمیان اعلان کرایا کہ جو شخص راستہ میں تنگی پیدا کرے گا یا راستہ کو کاٹے گا تو اس کا جہاد جہاد نہیں۔

اس واقعہ سے اسلام کی اسپرٹ معلوم ہوتی ہے۔ جہاد کا ثواب قرآن وحدیث میں بہت زیادہ بتایا گیا ہے۔ مگر انسانی حقوق کے بارہ میں معمولی لاپروائی بھی اتنی سنگین ہوسکتی ہے کہ وہ آدمی کے جہاد کو غیر مقبول بنادے۔

۱۲ فروری ۱۹۸۳

وہ لوگ دنیا سے ختم ہوتے جارہے ہیں جن کو دلیل کے ذریعہ قائل کیا جاسکے۔ آدمی وہیں مانتا ہے جہاں اس کے لئے ماننے کے سوا کوئی اور چارہ نہ ہو۔ جب تک ماننا اس کی مجبوری نہ بن جائے، وہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

موجودہ دنیا دلیل سے چپ ہونے کی جگہ ہے اور آخرت طاقت سے چپ ہونے کی جگہ۔ خدا جب

آخری طور پر دیکھے گا کہ دلیل کے زور پر چپ ہونے والے لوگ دنیا سے ختم ہو چکے ہیں تو وہ قیامت برپا کئے جانے کا اعلان کر دے گا تاکہ لوگوں کو طاقت کے زور پر چپ ہونے کے لئے مجبور کیا جا سکے۔ مگر دلیل کے ذریعہ چپ ہونا عزت کا چپ ہونا ہے اور طاقت کے ذریعہ چپ ہونا ذلت کا چپ ہونا۔

۱۳ فروری ۱۹۸۳

"کیلنڈر کہانت کی قسم تو نہیں" ایک صاحب نے کہا۔ "کہانت کا مطلب ہے مستقبل کی خبر دینا۔ اور کیلنڈر میں بھی مستقبل کی خبر ہوتی ہے۔ اس لئے بظاہر وہ بھی کہانت کی تعریف میں آتا ہے۔ ایسی حالت میں کیلنڈر بنانا، چھاپنا، استعمال کرنا اور اس کی خرید و فروخت کرنا سب ناجائز ہونا چاہئے۔ کیوں کہ کہانت اسلام میں ناجائز ہے۔

ایک صاحب نے یہ باتیں کہیں۔ اس کو سن کر میں نے کہا: کیلنڈر تو ناجائز نہیں، البتہ آپ کا یہ طرز فکر یقیناً ناجائز ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن و حدیث میں غلو کہا گیا ہے اور غلو اسلام میں جائز نہیں۔

۱۴ فروری ۱۹۸۳

آخرت کے بارہ میں میری حساسیت اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ وقت کا سائرن بجتا ہے تو اچانک مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کے خاتمہ کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ کسی طرف سے دھماکہ کی آواز آتی ہے تو شبہہ ہونے لگتا ہے کہ یہ قیامت کا دھماکہ نہ ہو اور اب وہ وقت نہ آ گیا ہو جب کہ تمام انسان اپنے رب کے سامنے حساب کتاب کے لئے پیش کر دئے جائیں گے۔

۱۵ فروری ۱۹۸۳

جہاں تک "کرنے" کا سوال ہے، مسلمان کرنے کے معاملہ میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ مگر ان کا کرنا ہمیشہ ردعمل کے طور پر ہوتا ہے نہ کہ ایجابی طور پر۔ کسی سے ان کو زک پہنچ جائے تو وہ فوراً بھڑک اٹھتے ہیں اور "کرنے" کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خود اپنی طرف سے مثبت انداز میں اپنا منصوبہ بنا کر کام کرنا ان کو نہیں آتا۔ مگر کرنا حقیقۃً وہی ہے جو ایجابی نفسیات کے تحت منصوبہ بندی کے ذریعہ ہو۔ ردعمل کی نفسیات کے تحت کیا جانے والا کام کبھی کوئی حقیقی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ ایسا کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا نہ کرنا۔

۱۶ فروری ۱۹۸۳

گرو نانک کا جو کلام موجود ہے، اس میں سے دو شعر یہ ہیں:

بُرے نال سب بُرا کیندے　　معاف کرن کجھ سیانے
بُرے نال پھر بھلا کرنا　　ایہہ گرو نانک جانے

یعنی عام لوگ برائی کے بدلے میں برائی کرتے ہیں۔ مگر جو ہوشیار ہیں وہ برائی کو معاف کر دیتے ہیں۔ اور اس سے بھی اونچی بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص تمہارے ساتھ برائی کرے تو تم اس کے ساتھ بھلائی کرو۔

برائی کو نظر انداز کرنا یا برائی کے بدلے میں بھلائی کرنا یہ بزدلانہ فعل نہیں۔ یہ انتہائی دانش مندی کی باتیں ہیں۔ اگرچہ سطحی انسان اس راز کو نہیں جانتا۔

۱۷ فروری ۱۹۸۳

اکتوبر ۱۹۷۵ میں یہ خبر آئی تھی کہ نیروز رستم جی دارو والا نے اپنا ایک گردہ حمید دلوائی کو دے دیا تاکہ ان کی صحت کو بچایا جاسکے۔ ۳۳ سالہ دارو والا جو ابھی غیر شادی شدہ تھے، ۳۱ دسمبر ۱۹۷۵ کو انھیں پرادداجیل میں پھانسی دے دی گئی۔ جو لوگ حمید دلوائی سے اختلاف رکھتے ہیں، وہ شاید یہ سمجھیں کہ ایک "دشمن اسلام" کی مدد کرنے کے نتیجہ میں دارو والا کو یہ سزا ملی، مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ دارو والا پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے ۲ فروری ۱۹۷۱ کو ایک پارسی خاندان کے چار افراد کو قتل کر دیا ہے۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۷۱ کو مقدمہ کا فیصلہ ہوا اور دارو والا مجرم قرار دئے گئے۔ یہ واقعہ "گردہ دان" سے چار سال پہلے واقع ہوا تھا، اسی کے جرم میں دارو والا کو پھانسی دی گئی۔

اکثر خارق عادت واقعات اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ تاریخ، مقام، اشخاص وغیرہ کے تعینات کے بغیر مجہول شکل میں بیان کئے جاتے ہیں۔ اگر ان کو تعین کے ساتھ بیان کیا جائے تو تحقیق کے بعد فوراً ان کی حقیقت کھل جائے گی۔ متعین تحقیق بتائے گی کہ اس "کرامت" کا راز یہ تھا کہ کہیں کی بات کہیں جوڑ دی گئی۔ اس دنیا میں ہر بات تحقیق کے بعد ماننا چاہئے۔ یہی سنجیدگی اور ذمہ داری کا تقاضا ہے۔

۱۸ فروری ۱۹۸۳

اسلام کا ماخذ بنیادی طور پر قرآن ہے۔ اس کے بعد حدیث اور سیرت۔ مگر حدیث اور سیرت کے سلسلہ میں ایک دقت یہ ہے کہ اس کی ترتیب قرآن کی ترتیب پر قائم نہ ہو سکی۔ حدیث کی تدوین کا کام زیادہ تر فقہ کے ردعمل میں ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حدیث کی ترتیب میں فقہ کا پیٹرن رائج ہو گیا۔ فقہ کے ابواب مسائل کی بنیاد پر قائم کئے گئے تھے، اسی طرح حدیث کے ابواب بھی مسائل کی بنیاد پر قائم کر دئے گئے۔ میں ذاتی طور پر مسانید کی ترتیب کو زیادہ سائنٹفک سمجھتا ہوں۔

سیرت نگاری کا کام اس زمانہ کی تاریخ نگاری سے متاثر ہوا۔ اس زمانہ میں تاریخ جنگوں اور فتوحات کا نام تھی۔ چنانچہ اس کے زیر اثر سیرت کو بھی "کتاب المغازی" بنا دیا گیا۔ حتی کہ ہمارے سیرت نگار حدیبیہ کا واقعہ لکھتے ہیں تو اس پر یہ عنوان قائم کرتے ہیں: غزوۃ الحدیبیہ۔ حالانکہ حدیبیہ کے سفر کا غزوہ سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ صرف عمرہ کا سفر تھا نہ کہ غزوہ کا سفر۔

بعد کو سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ بھی اسی ابتدائی پیٹرن پر لکھی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیرت رسول عملاً غزوات کی کتاب ہو کر رہ گئی۔ ضرورت ہے کہ احادیث کا از سر نو جائزہ لے کر صحیح نبوی پیٹرن پر سیرت کی کتاب لکھی جائے۔

۱۹ فروری ۱۹۸۳

ایک دلچسپ لطیفہ نظر سے گزرا:

If Christopher Columbus had a wife at home,
could he have discovered America?

"You're going where? With whom? To find whom? Coming back when?
And I suppose she's giving you those three ships for nothing!"

— Quoted in Writewell Company Catalogue

اگر کرسٹوفر کولمبس کی ایک بیوی ہوتی تو کیا وہ امریکہ دریافت کر سکتا تھا۔ وہ کہتی کہ تم کہاں جا رہے ہو۔ کس کے ساتھ جا رہے ہو۔ کیا مقصد ہے تمہارے جانے کا۔ کب واپس آؤ گے۔ اور کیا میں یہ سمجھ لوں کہ وہ عورت تم کو بلا سبب تین جہاز دے رہی ہے۔

کولمبس ایک تجربہ کار ملاح تھا۔ اس کو نئے نئے علاقے دریافت کرنے کا شوق تھا۔ مگر اس کے

پاس وسائل نہیں تھے۔ اس نے ملکۂ اسپین سے درخواست کی۔ چنانچہ ملکہ نے ۱۴۹۲ء میں اس کو تین جہاز دئے۔ انھیں جہازوں کے ذریعہ اس نے اٹلانٹک پار کرکے امریکہ کو دریافت کیا۔

مذکورہ لطیفہ دلچسپ انداز میں یہ بتا رہا ہے کہ عورتوں کی فکر محدود ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ گھریلو دائرہ میں سوچتی ہیں۔ گھر سے باہر کے دائرے میں سوچنا عام طور پر ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔

عورت کا یہ مزاج بذات خود نہایت صحیح اور مفید ہے۔ عورت کو گھر کے انتظام کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس لئے اس کی فکر بھی پیدائشی طور پر داخلی فکر ہوتی ہے۔ غلطی دراصل وہاں سے شروع ہوتی ہے جب کہ عورت کو گھر کے دائرہ سے نکال کر مصنوعی طور پر باہر کے دائرہ میں کھڑا کر دیا جائے۔

۲۰ فروری ۱۹۸۳

جارج ہربرٹ (George Herbert) نے کہا کہ بڑے بڑے محل پتھروں کے جنگل ہیں:

Castles are forests of stones.

یہ ایک حقیقت ہے کہ بڑے بڑے محل اعلیٰ انسانی احساسات کا قبرستان ہوتے ہیں۔ مگر لوگ قدروں سے زیادہ پتھروں کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ محلوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اگر لوگ چیزوں کو اعلیٰ قدروں کی بنیاد پر جانچ سکیں تو انھیں اونچے اونچے محلوں سے وحشت ہونے لگے۔

۲۱ فروری ۱۹۸۳

دعوت مسلمانوں کا تعلق دوسری قوموں سے محبت کی بنیاد پر قائم کرتی ہے، اور قومیت مسلمانوں کا تعلق دوسری قوموں سے نفرت کی بنیاد پر ــــــ یہی ایک لفظ میں مسلمانوں کے ماضی اور حال کا خلاصہ ہے۔

دور اول کے مسلمان "دعوت" کی بنیاد پر اٹھے تھے، اس لئے ان کے دل دوسروں کے لئے محبت اور خیر خواہی سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ جہاں گئے ہر جگہ ان کا استقبال کیا گیا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمان "قومیت" کی بنیاد پر کھڑے ہوئے ہیں، اس لئے ان کے دل دوسروں کی نفرت سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کے پاس بھی ان کے لئے نفرت کے سوا اور

کچھ نہیں۔ آج کی دنیا میں کوئی علاقہ نہیں جہاں مسلمانوں کو عزت اور محبت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔

مسلمانوں کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ دوسری قوموں کو اپنے دل میں جگہ دیں، اس کے بعد دوسری قومیں انھیں وسیع زمین پر جگہ دینے کے لئے تیار ہو جائیں گی۔

۲۲ فروری ۱۹۸۳

الور (راجستھان) میں ایک میوزیم ہے۔ یہ کافی بڑا ہے اور اس میں قدیم زمانہ کی بہت سی نادر چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ اس کے ایک حصہ میں راجاؤں اور بادشاہوں کی تلواریں ہیں۔ انھیں میں سے ایک تلوار وہ ہے جو ۱۵۳۰ء میں بنائی گئی تھی۔ اس پر صانع کو بتانے کے لئے "عمل محمد صادق کابلی" لکھا ہوا ہے۔ یہ مغل شہنشاہ اکبر کی تلوار تھی۔ اس پر فارسی کا یہ شعر درج ہے:

بہر جا کہ شمشیر من کار کرد یکے را دو کرد و دو را چار کرد

(میری تلوار جہاں بھی چلی، اس نے ایک کو دو ٹکڑے کر دیا اور دو کو چار ٹکڑے کر دیا)

ساڑھے چار سو سال پہلے تلوار پر لکھا ہوا یہ شعر ہر ایک کو مکمل طور پر بامعنی معلوم ہوتا ہوگا۔ مگر آج وہ مکمل طور پر بے معنی ہے۔ آج اگر کسی شخص کو یہ تلوار حاصل ہو جائے تو وہ ان کارناموں میں سے کوئی بھی کارنامہ انجام نہیں دے سکتا جو اس تلوار نے چار سو سال پہلے کے دور میں انجام دیا۔

یہ زمانہ کا فرق ہے۔ مگر مسلمان آج بھی دنیا میں اس طرح جی رہے ہیں جیسے کہ انھیں زمانے کے فرق کی بابت کچھ خبر نہیں۔

۲۳ فروری ۱۹۸۳

امام اوزاعی اسلام کی تاریخ میں بہت بڑے عالم گزرے ہیں۔ انھوں نے ایک بار عباسی خلیفہ المنصور کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بادشاہ چار قسم کے ہوتے ہیں۔ بادشاہ کی چوتھی قسم جو انھوں نے بتائی وہ ایسا بادشاہ تھا جو خود تو بدعنوانی کرتا ہو اور اپنے ماتحتوں کو بدعنوانی سے بچنے کی تاکید کرے۔ امام اوزاعی نے اس چوتھی قسم کے بادشاہ کے بارہ میں کہا کہ یہ بہت برا ہوشیار ہے۔ (فذالک شر الاکیاس)

موجودہ زمانہ کے ہندستانی حکمراں اسی چوتھی قسم میں آتے ہیں۔ وہ خود ہر قسم کی سیاسی

اور مالی بدعنوانی کر رہے ہیں۔ اور اس کے بعد سرکاری ملازموں کے نام سرکلر جاری کرتے ہیں کہ انتظامیہ کو کرپشن اور بدعنوانی سے پاک کیا جائے۔ اس قسم کی باتیں مسخرہ پن کے سوا اور کچھ نہیں۔

۲۴ فروری ۱۹۸۳

یحییٰ بن یعمر ایک تابعی عالم تھے۔ حجاج بن یوسف نے ایک بار ان سے پوچھا کہ میں لحن (یعنی اعراب) میں غلطی تو نہیں کرتا۔ یحییٰ بن یعمر نے جواب دیا: ترفع ما یخفض وتخفض ما یرفع۔

حجاج کے سوال کے مطابق اس جملہ کا ایک مطلب یہ تھا کہ تم کسرہ (زیر) کی جگہ رفع (پیش) کہتے ہو۔ اور رفع کی جگہ کسرہ کہتے ہو۔ اسی کے ساتھ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی نکلتا تھا کہ تم بے انصاف ہو۔ اور جو شخص پستی کا مستحق ہے اس کو بلند کرتے ہو، اور جو شخص بلندی کے قابل ہے اس کو پست کرتے ہو۔ حجاج بن یوسف اس عالمانہ جواب پر بہت خوش ہوا اور یحییٰ بن یعمر کو خراسان کا قاضی مقرر کر دیا۔ (ابن خلکان)

یحییٰ بن یعمر کا جواب ایک اعتبار سے تنقیدی تھا۔ دوسرے اعتبار سے وہ مجیب کی ذہانت اور قابلیت کو بتا رہا تھا۔ حجاج بن یوسف کو جواب کے دوسرے پہلو نے اتنا متاثر کیا کہ پہلا پہلو اس کی نظر میں غیر اہم بن گیا۔ اگر وہ صرف پہلے پہلو کو دیکھتا تو وہ یحییٰ بن یعمر کو سزا دیتا۔ مگر دوسرے پہلو کی قدردانی کرتے ہوئے ان کو اس نے ایک اعلیٰ عہدہ پر مقرر کر دیا۔ انسانوں کی یہی وہ قسم ہے جس کو صاحب ذوق انسان (Man of taste) کہا جاتا ہے۔

۲۵ فروری ۱۹۸۳

امام احمد بن حنبل نے کہا تھا: تین چیزوں کی کوئی اصل نہیں۔ تفسیر اور ملاحم اور مغازی۔

حافظ عراقی کا ایک شعر ہے:

وَلْيَعْلَمِ الطَّالِبُ السِّيَرْ ... تَجْمَعُ مَا قَدْ صَحَّ وَمَا قَدْ أُنْكِرْ

طالب علم کو جاننا چاہئے کہ سیرت کی کتابوں میں صحیح روایتیں بھی جمع کی جاتی ہیں اور غیر صحیح روایتیں بھی۔

مثلاً طبرانی وغیرہ میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ ابوامامہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ اللہ نے جنت میں مریم بنت عمران، موسیٰ کی بہن کلثم اور فرعون کی عورت آسیہ کو میری بیوی بنایا ہے (عن ابی امامۃ قال سمعت النبی صلی

اللّٰہ علیہ وسلم یقول لعائشۃ اشعرتِ اَنّ اللّٰہ قد زوّجنی فی الجنۃ مریم بنت عمران وکلثُمَ اخت موسٰی وامرأۃ فرعون)

مذہبی داستان گوئی قدیم زمانہ سے لوگوں کا ذوق رہا ہے۔ اس قسم کے لوگوں نے بے شمار بے بنیاد قسم کے قصے کہانیاں گڑھے اوران کو سیرت کے نام پر پھیلا دیا۔ یہ بے بنیاد قصے اسلامی کتابوں میں شامل ہوگئے اور واعظوں نے ان کو بیان کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ اتنا زیادہ شائع ہوگئے کہ ان کو ختم کرنا ہی ممکن نہ رہا۔

محقق علماء نے موضوعات حدیث کے بارہ میں نہایت قیمتی کتابیں لکھی ہیں۔ قدیم کتابوں کے علاوہ موجودہ زمانہ میں لکھی جانے والی کتابوں میں سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ للالبانی نہایت مفید کتاب ہے۔ مگر جو باتیں عوامی سطح پر پھیل جائیں ان کو علمی کتابوں کے ذریعہ ختم کرنا ممکن نہیں۔

کتنے ظالم تھے وہ لوگ جنھوں نے دین میں اس قسم کے لغو اضافے کئے۔

۲۶ فروری ۱۹۸۳

اورنگ زیب عالمگیر ایک متنازعہ شخصیت بنا ہوا ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ اورنگ زیب ہندو دشمن تھا۔ اس نے مندروں کو ڈھایا۔ مسلمان کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ کیوں کہ ہندستان میں ایسے مندر ہیں جہاں اب بھی اورنگ زیب کے شاہی فرمان موجود ہیں جو اس کی تردید کرتے ہیں۔ مثلاً اترپردیش کے قصبہ چتر کوٹ میں ایک مندر ہے۔ یہاں شہنشاہ اورنگ زیب کا ایک شاہی فرمان موجود ہے۔ یہ فرمان اورنگ زیب کی تخت نشینی کے ۳۵ ویں سال ۱۶ جون ۱۶۹۱ کو لکھا گیا تھا۔ اس شاہی فرمان میں بالک داس کو دی جانے والی زمین کی حدود متعین کرنے کا حکم ہے اور یہ بھی درج ہے کہ اس زمین پر مالگذاری یا دوسرے ٹیکس نہیں لگیں گے۔ اس میں ان آٹھ گاؤں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی آمدنی مہنت کو ملتی تھی۔ اس دستاویز پر اورنگ زیب کے وزیر مالیات سعادت خاں کی مہر ہے اور وہ بہرمند خاں کاتب کی لکھی ہوئی ہے۔

یہ بات بجائے خود صحیح ہے۔ مگر یہی کل بات نہیں ہے۔ تصویر کا ایک رخ اور بھی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم یہاں ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:

"مآثر عالمگیری کا مصنف بڑے فخر سے لکھتا ہے کہ غیر مسلم افراد حتی الوسع عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز نہیں کئے جاتے تھے اور تمام ممالک محروسہ میں غیر اسلامی معابد اور پرستش گاہوں کا ایسا خاتمہ ہوا اور ان کی جگہ اس قدر کثرت سے مساجد تعمیر کرائی گئیں کہ ان کے شمار و اعداد کو قبول کرنے سے عقل حیران رہ جاتی ہے۔"

مسلمانوں کا عروج و زوال، از مولانا سعید احمد ایم اے، مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۴۷، صفحہ ۳۱۷

اگر اورنگ زیب نے کچھ مندروں کو عطیات دئے۔ اور دوسرے کچھ مندروں کو ڈھایا تو پہلے عمل سے دوسرا عمل صحیح ثابت نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب کا دوسرا عمل یقینی طور پر غلط تھا، خواہ اس نے اس کے سوا کتنے ہی صحیح عمل کئے ہوں۔

دہلی کی عظیم الشان جامع مسجد بھی آثار قدیمہ کے تحت ہے اور صفدر جنگ کی چھوٹی مسجد بھی آثار قدیمہ کے تحت ہے۔ ہندستان کی موجودہ حکومت نے صفدر جنگ کی مسجد پر تالا ڈال رکھا ہے۔ دوسری طرف اسی حکومت نے جامع مسجد کو پوری طرح مسلمانوں کے لئے کھول دیا ہے۔ مزید یہ کہ اس نے مسجد کے چاروں طرف صفائی کرا کر ایک وسیع رقبہ مسجد میں شامل کر دیا ہے جہاں اس سے پہلے مختلف قسم کی ذاتی تعمیرات کھڑی ہوئی تھیں۔

مگر مسلمان ایسا نہیں کرتے کہ وہ صفدر جنگ کی مسجد کے واقعہ کو نظر انداز کریں اور جامع مسجد کے واقعہ کو بیان کر کے حکومت کی تعریف کریں۔ پھر مسلمان کیوں یہ امید رکھتے ہیں کہ ہندو لوگ اورنگ زیب کے چترکوٹ مندر کے واقعہ کو یاد رکھیں گے اور دوسرے مندروں کے ساتھ اس کے سلوک کو بالکل بھلا دیں گے۔

۲۷ فروری ۱۹۸۳

نئی دہلی کی ایک کالونی کا واقعہ ہے۔ سڑک پر صفائی کرنے والی ایک ہریجن عورت ایک "کوٹھی" والی عورت سے لڑ گئی۔ دیر تک دونوں میں تیز کلامی ہوتی رہی۔ آخر میں ہریجن عورت نے کہا:

"تم اپنی امیری میں مست ہو، ہم اپنی غریبی میں مست ہیں۔"

یہ موجودہ زمانہ کے انسان کی بہترین تصویر ہے۔ آج کے انسان کا واحد مشترک ذہن بد دماغی ہے۔ ہر آدمی بد دماغی میں مبتلا ہے، خواہ وہ امیر ہو یا غریب، اور خواہ وہ جاہل ہو یا پڑھا

لکھا ہو۔

ایسی حالت میں واحد لائحہ عمل اعراض ہے۔ دوسروں کی طرف سے ناخوشگواری پیش آئے تو اس سے اعراض کرکے آدمی اپنے کام میں مشغول ہو جائے۔ اگر اس نے فریق ثانی سے الجھنے کی کوشش کی تو اس کے حصہ میں نقصان کے سوا کچھ اور آنے والا نہیں۔

۲۸ فروری ۱۹۸۳

۱۹۸۱ میں تین سائنس دانوں کو میڈیسن میں مشترک نوبل انعام دیا گیا تھا۔ ان کے نام یہ ہیں:

Roger Sperry (California)
David Hubel (Harvard)
Torsten Wiesel (Harvard)

ان سائنس دانوں نے ۳۰ سال تک انسانی دماغ (Brain) پر ریسرچ کیا ہے اور تحقیقی مقالات لکھے ہیں۔ ان کا مشترک بیان ہے کہ:

The human brain is a whole universe

انسانی دماغ ایک مکمل کائنات ہے (ٹائم ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۱)

ایک اور سائنس داں نے انسانی دماغ کے کمالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر ایک ایسا سپر کمپیوٹر بنایا جائے جس کا سازوسامان (infrastructure) سات منزلہ عمارت میں پھیلا ہوا ہو تو وہ انسانی دماغ کا صرف ایک سادہ خاکہ (rough sketch) ہوگا۔

انسانی دماغ بلاشبہ تخلیق کا شاہکار ہے۔ اس عطیہ خداوندی پر انسان کو شکر کے جذبہ سے خدا کے سامنے ڈھ پڑنا چاہئے تھا۔ مگر انسان اس کے بجائے سرکشی کرتا ہے۔ کیسی عجیب ہے یہ نادانی جو دانا انسان سے ظاہر ہوتی ہے۔

یکم مارچ ۱۹۸۳

عورت تاریخ کے ہر دور میں مرد کے تابع رہی ہے۔ موجودہ زمانہ میں ترقی یافتہ ملکوں میں عورت اور مرد کو مساوی بنانے کی کوشش کی گئی۔ مگر عملاً یہ فرق ختم نہ ہو سکا۔ عورت کو مغربی سماج میں آج بھی وہی "دوسرا درجہ" حاصل ہے جو قدیم زمانہ میں اس کو حاصل تھا۔

جدید تحقیقات نے بتایا کہ دونوں صنفوں کے درمیان اس فرق کا سبب حیاتیات میں ہے۔ یعنی دونوں کی حیاتی بناوٹ میں فرق ہے۔ اس لئے معاشرہ کے اندر بھی دونوں کے درجہ میں فرق ہو جاتا ہے۔ اب مساوات مرد و زن کے حامی "ڈاروِنزم" کے تحت اس کی توجیہہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عورت ارتقائی عمل میں زیادہ ابتدائی درجہ میں رہ گئی۔ جب کہ ڈارون نے خود کہا ہے کہ "مرد بالآخر عورت کے مقابلہ میں برتر ہو گیا۔"

Women remained at a more primitive stage of evolution. As Darwin himself put it, "Man has ultimately become superior to women."

۲ مارچ ۱۹۸۳

مسلمانوں کے ایک شاعر نے دور ماضی میں کہا تھا:

ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی وہ اسی تخیل کو اپنے سینہ سے لگائے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ یہ شعر جس زمانہ میں کہا گیا تھا وہ زمانہ بدل گیا۔ قدیم زمانہ میں اگر شمشیر زنی کرنے والوں کے نام سے سکہ ڈھالا جاتا تھا تو اب علم میں مہارت دکھانے والوں کا سکہ دنیا میں رواں ہوتا ہے۔ زمانہ کے اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنے "حال" کو کھو دیا ہے۔ اگر وہ اب بھی اس حقیقت کو نہ سمجھیں تو وہ اپنا "مستقبل" بھی کھو دیں گے۔ اس بے دانشی کے ساتھ مسلمانوں کے لئے بربادی کے سوا کوئی دوسری چیز اس عالم اسباب میں مقدر نہیں۔

۳ مارچ ۱۹۸۳

ابو بکر بن عباس خوارزمی (۳۸۳ - ۳۲۳ھ) ذہانت و حافظہ میں ضرب المثل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ارجان میں صاحب بن عباد وزیر سے ملنے گئے۔ دروازہ پر پہنچے تو دربان اندر گیا اور صاحب سے جا کر کہا کہ دروازہ پر ایک ادیب آپ سے ملنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ وزیر نے کہا کہ ان سے کہو "میں نے طے کر لیا ہے کہ میرے پاس کوئی ادیب اس وقت تک نہیں آئے گا جب تک

اسے عرب کے ۲۰ ہزار اشعار زبانی یاد نہ ہوں۔" خوارزمی نے یہ بات سنی تو دربان سے کہا جاؤ ان سے دریافت کرو کہ ۲۰ ہزار مردوں کے یا عورتوں کے۔

یہ سن کر وزیر ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے کہا کہ "یہ ابو بکر خوارزمی معلوم ہوتے ہیں"۔ اور فوراً ان کو اندر بلالیا ــــــ بعض کلام ایسے ہوتے ہیں کہ صرف الفاظ ہی آدمی کو مسخر کرنے کے لئے کافی ہو جاتے ہیں۔

۴ مارچ ۱۹۸۳

"گیتان جلی" رابندر ناتھ ٹیگور کی مشہور کتاب ہے۔ اسی کتاب کے انگریزی ترجمہ پر ان کو نوبیل انعام ملا تھا۔ یہ کتاب اصلاً بنگلہ زبان میں لکھی گئی تھی۔ اس کے بعد اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہوا۔ اس کی ایک نظم کا دو مصرعہ یہ ہے:

میں تجھ کو چاہتا ہوں، صرف تجھ کو اور کسی کو نہیں
میرے دل کو اس آرزو کی تکرار بے نہایت کرنے دے

کسی چیز سے جب آدمی کا تعلق دل چسپی اور محبت کے درجہ کا ہو جائے تو وہاں تکرار کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی ہر تکرار آدمی کو نیا لطف دیتی ہے۔ اس کی تکرار سے آدمی کبھی نہیں اکتاتا۔ اس کی ایک عام مثال سگرٹ ہے۔ آدمی اسی ایک سگرٹ کو بار بار پیتا ہے اور روزانہ پیتا رہتا ہے۔ مگر اس کو کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ وہ ایک چیز کی تکرار کر رہا ہے۔ حالاں کہ اسی شخص کو اگر کوئی غیر مرغوب چیز دی جائے تو دو چار بار کے استعمال کے بعد وہ اس سے اکتا جائے گا اور اس کو تکرار کہہ کر چھوڑ دے گا۔

میں نے کئی بار ایسے نوجوان دیکھے ہیں جنھوں نے ابھی کوئی پکچر دیکھی تھی۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک اس پکچر کو دیکھے ہوئے تھا مگر وہ اس کی کہانی اور اس کے مکالمے اس طرح ایک دوسرے کو سنا رہے تھے جیسے وہ کوئی نئی بات کہہ رہے ہوں۔ پکچر کے ساتھ ان کی بڑھی ہوئی دل چسپی نے ان کے لئے تکرار کا تصور حذف کر دیا تھا۔

جب کسی کے سامنے کوئی بات کہی جائے اور وہ اس کو "تکرار" کہہ کر بے لطف ہونے لگے تو سمجھ لیجئے کہ یہ بات اس کی زندگی میں دل چسپی بن کر داخل نہیں ہوئی ہے۔ اگر وہ اس کے

لیے حقیقی دل چسپی کی چیز ہوتی تو اس کی ہر تکرار اس کو نیا لطف دیتی نہ یہ کہ وہ اس کو بے لطف بنا دے۔

۵ مارچ ۱۹۸۳

اندر ملہوترا ٹائمس آف انڈیا کے مغربی نمائندہ ہیں۔ انھوں نے مسٹر ہرمن کی کتاب (جنگ کی ہوائیں) کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پچھلے پورے سال یہ کتاب اٹلانٹک کے دونوں کناروں پر سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں میں تقریباً سرفہرست رہی:

All through the last year, Mr. Herman's work *The Winds of War* remained close to the top of the weekly list of best-sellers on both sides of the Atlantic.

"اٹلانٹک کے دونوں کناروں" سے مراد یورپ اور امریکہ ہیں۔ یہ ایک خوب صورت ادبی اسلوب ہے۔ مگر یہ ادبی اسلوب واقعہ کی بنیاد پر بنا ہے۔ اس کے بالمقابل خیالی ادب وہ ہے جس کے لئے واقعہ سے مطابقت ضروری نہیں۔ مثلاً شبنم ایک مادی واقعہ ہے۔ اس کا ایک معلوم طبیعی مفہوم ہے۔ مگر شاعر جب اپنے خیالات کی دنیا میں ایک تصویر بناتا ہے تو اس کو اس سے بحث نہیں ہوتی کہ شبنم فی الواقع کس چیز کا نام ہے۔ اگر وہ اپنے فرضی محبوب سے ملاقات کا ذکر کر رہا ہو تو وہ کہے گا:

صبا نے وہ تگ و دو کی ہے اعلان مسرت میں　　کہ ٹپکا ہے پسینہ جا بجا شبنم کی صورت میں

اس کے برعکس اگر شاعر کے فرضی محبوب کا انتقال ہو جائے تو یہی شبنم "گریۂ شبنم" میں ڈھل جائے گی۔ اس وقت شاعر کو دکھائی دے گا گویا شبنم کے قطرے آسمان کے آنسو ہیں جو شدت غم کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے نکل پڑے ہیں۔

امریکی خلاباز مسٹر نیل آرم اسٹرانگ نے ۱۹۶۹ میں جب پہلی بار چاند پر قدم رکھا تو ان کی زبان سے نکلا —— یہ ایک آدمی کے لئے ایک چھوٹا قدم ہے مگر انسانیت کے لئے وہ ایک عظیم چھلانگ ہے:

That's one small step for a man, one giant leap for mankind.

یہ جملہ ایک عظیم سفر کے بعد نکلا۔ حقیقت یہ ہے کہ عظیم حالات ہی عظیم ادب کی تخلیق کرتے ہیں۔ جس آدمی نے بے شمار مراحل سے گزر کر ایسا قدم اٹھایا ہو جو فی الواقع انسانیت کے لئے ایک چھلانگ بننے والا ہو وہی وہ شخص ہوتا ہے جس کے احساسات ان الفاظ میں ڈھل جائیں جس کا ایک نمونہ مسٹر نیل آرم اسٹرانگ کے جملہ میں نظر آتا ہے۔

فرضی تخیل سے فرضی ادب پیدا ہوتا ہے اور حقیقی عمل سے حقیقی ادب۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فرضی ادب سے فرضی زندگی بنتی ہے اور حقیقی ادب سے حقیقی زندگی۔

۶ مارچ ۱۹۸۳

سید جمال الدین افغانی (۱۸۹۷-۱۸۳۸) نے کہا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اس پر اتفاق کرلیا ہے کہ وہ کبھی اتفاق نہیں کریں گے (اتَّفَقُوا اَنْ لا يَتَّفِقُوا)

اس قول کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ سید جمال الدین افغانی خود ایک اتفاق پسند آدمی تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جمال الدین افغانی جیسے لوگ ہی مسلمانوں کی بے اتفاقی کے اصل ذمہ دار ہیں۔ موجودہ زمانہ میں بے اتفاقی کی سب سے بڑی وجہ سیاست ہے۔ سیاسی طریق عمل اختیار کرنے کی وجہ سے جمال الدین افغانی جیسے لوگوں کا کام اول دن سے عدم اتفاق سے شروع ہوا۔ ان کے نظریہ کے مطابق اصلاح کا کام حکمرانوں کی تبدیلی سے شروع ہوتا تھا۔ چنانچہ اپنی تحریک کے آغاز ہی میں وہ اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں سے ٹکرا گئے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمال الدین افغانی جس ملک میں گئے، یا ان کے جیسے لوگوں نے جس ملک میں کام شروع کیا وہاں عملاً مسلمان دو طبقوں میں بٹ گئے۔ ایک حکمراں طبقہ اور اس کے موافقین، دوسرے انقلاب پسند طبقہ اور اس کے موافقین۔ اس طرح ہر ملک میں مسلمان دو طبقوں میں بٹ کر ایک دوسرے سے لڑنے لگے اور آج تک لڑ رہے ہیں۔ جمال الدین افغانی جیسے لوگ اگر یہ کہتے تو زیادہ صحیح تھا کہ ——— ہم نے اتفاق کرلیا ہے کہ ہم عدم اتفاق والی پالیسی پر چلیں گے۔

۷ مارچ ۱۹۸۳

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں انسان آزاد ہے کہ جو چاہے بولے اور جس قسم

کے الفاظ چاہے اپنے منھ سے نکالے۔ مگر آخرت میں ایسا نہ ہو سکے گا۔ آخرت میں آدمی کی یہ آزادی اس سے چھین لی جائے گی۔ آخرت میں صرف وہی باتیں الفاظ کی صورت میں ڈھل سکیں گی جو صحیح ہوں، غلط باتوں کے لئے وہاں کسی کو الفاظ ہی نہیں ملیں گے۔

کس قدر عجیب ہوگی وہ دنیا جہاں آدمی کو صرف موقفِ حق کے لئے الفاظ ملیں، اور موقف غیر حق کے لئے الفاظ پانا کسی کے لئے ناممکن ہو جائے۔ یہ بے بسی کی سخت ترین قسم ہے۔ مگر دنیا میں چوں کہ آدمی اس کا تجربہ نہیں کرتا اس لئے وہ اس کی سنگینی کو سمجھ نہیں پاتا۔

۸ مارچ ۱۹۸۳

ایران کے شاہ محمد رضا پہلوی (۱۹۸۰ - ۱۹۱۹) کو اپنے اقتدار پر اتنا اعتماد تھا کہ انھوں نے اپنے لئے "شہنشاہ" کا لقب اختیار کیا۔ انھوں نے ابتدائی دو بیویوں کو صرف اس لئے طلاق دے دی کہ وہ ان کے لئے وارث سلطنت پیدا نہ کر سکیں۔ آخر میں انھوں نے تیسری بیوی فرح دیبا سے اکتوبر ۱۹۶۰ میں شادی کی۔ ان کے بطن سے ولی عہد رضا پیدا ہوئے۔ مگر اس کے بعد خود شاہ کو سلطنت چھوڑ کر جلا وطن ہو جانا پڑا۔

مختلف اسباب کے تحت ایران میں خمینی انقلاب آیا۔ ۱۶ جنوری ۱۹۷۹ کو شاہ محمد رضا پہلوی ایران سے باہر جانے کے لئے اپنے خصوصی ہوائی جہاز میں داخل ہوئے تو وہ زار و قطار رو رہے تھے۔ اس کے بعد وہ مختلف ملکوں میں پھرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۲۷ جولائی ۱۹۸۰ کو قاہرہ کے ایک اسپتال میں ان کا انتقال ہو گیا۔ موت کے وقت شاہ کی جو دولت بیرونی بینکوں میں جمع تھی وہ دس ہزار ملین پونڈ سے بھی زیادہ تھی (ہندستان ٹائمس ۳۱ جولائی ۱۹۸۰)

شاہ رضا اگر اس طرح سوچتے کہ سلطنت کھونے کے باوجود ابھی میرے پاس "۱۰ ہزار ملین پونڈ" موجود ہیں اور ان کے ذریعہ میں دوبارہ ایک نئی زندگی شروع کر سکتا ہوں تو وہ نئے عزم کے ساتھ ایک کامیاب زندگی حاصل کر سکتے تھے۔ مگر سلطنت کو کھونے کا غم ان پر اتنا زیادہ طاری ہوا کہ وہ عظیم خزانہ کا مالک ہونے کے باوجود بے ہمت ہو گئے اور بالآخر سخت مایوسی کے عالم میں مر گئے ـــــ انسان کے لئے طاقت کا اصل سرچشمہ اس کی نفسیات ہے نہ کہ مادی وسائل۔

۹ مارچ ۱۹۸۳

اسلام دین رحمت ہے۔ وہ آدمی کی روحانی ترقی کا ذریعہ ہے۔ وہ آدمی کو اخلاقی اور انسانی اعتبار سے اوپر اٹھاتا ہے۔

اسی کے ساتھ اسلام کی دی ہوئی ایک اور عظیم رحمت وہ ہے جس کو اسلام کی تاریخ کہا جاتا ہے۔ یعنی پیغمبر اسلام اور آپ کے صحابہ کرام کی تاریخ جو کامل طور پر محفوظ حالت میں موجود ہے۔ اسلام کی یہ تاریخ اپنی زندہ مثالوں کے ذریعہ آدمی کو یہ حوصلہ دیتی ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاقی بلندیوں تک پہنچنے کی پر اعتماد کوشش کر سکے۔ اسلام اگر صرف اعلیٰ اصول پیش کرتا اور اس کے پاس اعلیٰ تاریخ نہ ہوتی تو اس کی تلقین بہت کم افراد کو متاثر کر سکتی تھی۔

۱۰ مارچ ۱۹۸۳

پچھلے پانچ ہزار سال کے اندر دنیا میں بے شمار اعلیٰ درجہ کے آرٹسٹ پیدا ہوئے ہیں۔ انھوں نے حقیقی اور فرضی انسانوں کی نہایت کامیاب تصویریں بنائیں۔ مگر کوئی آرٹسٹ انسان کے لئے موجودہ ماڈل کے سوا کوئی دوسرا ماڈل پیش نہ کر سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا موجودہ ڈھانچہ آخری پرفکٹ ڈھانچہ ہے۔ انسان کے لئے اس کے سوا کوئی اور ڈھانچہ ذہن میں لانا ممکن نہیں۔

یہی حال کائنات کی تمام چیزوں کا ہے۔ سمندر ہو یا پہاڑ، درخت ہو یا جانور یا کوئی اور چیز، ہر چیز کی تشکیل اپنے آخری کامل نمونہ پر ہوئی ہے۔ گھاس کا جو ماڈل ہے وہ اتنا مکمل ہے کہ اس کے سوا گھاس کا کوئی دوسرا ماڈل تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح شیر کا موجودہ ماڈل اپنی جگہ اتنا مکمل ہے کہ کسی دوسرے ماڈل کا شیر تصور میں نہیں آتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز اپنے آخری پرفکٹ ماڈل پر ہے۔ دنیا کی چیزوں کے لئے کوئی دوسرا ماڈل تجویز کرنا ممکن نہیں، خواہ وہ کوئی چھوٹی چیز ہو یا بڑی چیز۔

میں نے غور کیا کہ انسان اپنے ارادہ سے جو چیزیں وجود میں لاتا ہے کیا ان میں سے کوئی ایسی چیز ہے جو اس کائناتی نمونہ کے ہم سطح ہو، جو اپنے آخری پرفکٹ نمونہ پر ہو، جس کے آگے کوئی اور نمونہ ممکن نہ ہو۔ کافی غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ انسان کی "تخلیقات" میں صرف ایک چیز ایسی ہے جو کائناتی اشیاء کی مذکورہ خصوصیت کے ہم پلہ ہو، اور یہ

سجدہ ہے۔

ایک انسان جب اپنے آپ کو سجدہ کی حالت میں لے جاتا ہے اور اپنے پورے وجود کو جھکاتے ہوئے اپنا سر زمین پر رکھ دیتا ہے تو یہ اظہار عبدیت کا ایسا نمونہ ہوتا ہے جس کے آگے اس کا کوئی اور نمونہ ممکن نہیں۔ انسان کا سجدہ عبدیت کی آخری پرفکٹ تصویر ہے۔ سجدہ کی یہ صورت اگرچہ خدا کی بتائی ہوئی ہے، مگر وہ انسانی ارادہ سے عمل کی صورت اختیار کرتی ہے۔ اس اعتبار سے وہ انسانی واقعہ بن جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن میں ہے: واسجد واقترب اور اسی لئے حدیث میں آیا ہے:

اقرب مایکون العبد من ربہ وھو ساجد (بندہ سجدہ کے وقت اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے) اسی مفہوم میں ایک قول یہ ہے: الصلاۃ معراج المؤمنین۔

۱۱ مارچ ۱۹۸۳

اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ کی مخلوق میں غور وفکر کرو، اللہ کی ذات میں غور وفکر نہ کرو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے (تفکروا فی خلق اللہ ولا تفکروا فی ذات اللہ فتھلکوا)

اللہ کی مخلوق ہمارے معلوم دائرہ کی چیز ہے، جب کہ اللہ کی ذات ہمارے معلوم دائرہ سے باہر کی چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کی مخلوق میں غور وفکر کرنے سے معرفت کی روشنی حاصل ہوتی ہے۔ آدمی کے یقین میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اللہ کی ذات میں خوض کرنے لگتے ہیں، ان کا خوض انھیں صرف تشکیک اور انتشار ذہنی تک پہنچاتا ہے۔

عقل مند شخص وہ ہے جو اپنی سوچ کو معلوم دائرہ تک محدود رکھے، اور نادان وہ ہے جو معلوم دائرہ اور نامعلوم دائرہ کے فرق کو نہ سمجھے اور پہلے دائرہ میں چلتے ہوئے دوسرے دائرہ میں داخل ہو جائے۔ ایسا شخص اپنے آپ کو فکری تباہی سے نہیں بچا سکتا۔

۱۲ مارچ ۱۹۸۳

حدیث میں زبان کے محتاط استعمال پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور زبان سے غلط لفظ نکالنے پر سخت وعید بتائی گئی ہے۔ اس بنا پر اسلامی لٹریچر میں کثرت سے اس کا تذکرہ ملتا

ہے۔ نظم اور نثر دونوں میں اس کے بارہ میں کافی مواد موجود ہیں۔ یہاں میں صرف ایک عربی شعر نقل کرتا ہوں :

احفظ لسانك ايها الانسان　　لا يلدغنك انه ثعبان

اے انسان ، اپنی زبان کی حفاظت کر ، وہ اژدہا ہے کہیں تم کو ڈس نہ لے۔

مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت کم لوگ ہیں جو واقعی معنوں میں سمجھتے ہوں کہ حفاظت زبان کے کیا معنی ہیں۔ بیشتر لوگ بس روایتی طور پر اس قسم کے ناصحانہ الفاظ بول دیتے ہیں، بغیر یہ جانے ہوئے کہ اس تعلیم کے حقیقی عملی تقاضے کیا ہیں۔

مثلاً ایک شخص کو اس کے عزیز کے بارہ میں ایک لغو خبر دی جائے تو اس کا ذہن اس کی تحقیق میں لگ جائے گا، وہ تحقیق کے بغیر کبھی اس کو ماننے پر راضی نہ ہوگا۔ مگر اسی آدمی کو اس کے مبغوض شخص کے بارہ میں کوئی لغو خبر بتائی جائے تو اس کا ذہن بلا تحقیق اس کو قبول کرے گا۔ چونکہ وہ مذکورہ شخص کو غلط سمجھتا ہے اس لئے اس کے بارہ میں جب وہ کوئی بری خبر سنتا ہے تو اس کا ذہن شعوری یا غیر شعوری طور پر مان لیتا ہے کہ خبر صحیح ہوگی۔

اس معاملہ میں مجھے اکابر تک کے تجربے ہوئے ہیں، مگر کسی کو میں نے اس کے بارہ میں محتاط نہیں پایا۔

۱۳ مارچ ۱۹۸۳

۱۹۱۳ میں کانپور میں ایک سڑک کی توسیع کے سلسلہ میں محلہ مچھلی بازار کی مسجد کا غسل خانہ توڑ دیا گیا تھا۔ اس پر مسلمانوں نے زبردست ہنگامہ کیا۔ حکومت نے گولی چلائی اور کئی مسلمان ہلاک ہو گئے۔ بعد کو لارڈ ہارڈنگ نے اس قضیہ کا فیصلہ کیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ "امرتسر کے اجلاس کانگریس (۱۹۱۹) کے بعد گاندھی جی کے مشورہ پر مسلمانوں کا ایک وفد وائسرائے لارڈ ہارڈنگ سے ملا۔ مولانا حسرت موہانی بھی اس وفد میں شریک تھے۔ گر عرض معروض اور جواب کے بعد جب وائسرائے سے ہاتھ ملانے کا اعزازی لمحہ آیا تو حسرت چپکے سے اٹھ کر بے ہاتھ ملائے کترا کر اس طرح نکل گئے کہ کسی نے دیکھا بھی نہیں"۔

مسلمان اپنے رہنماؤں کی اس طرح کی باتوں پر فخر کرتے ہیں، مگر مجھے تو یہ باتیں باعث شرم

معلوم ہوتی ہیں۔ انگریز مسلمانوں کے لئے مدعو کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر مسلمانوں نے ان کو صرف حریف اور رقیب، یا ظالم اور غاصب کی نظر سے دیکھا۔ اگر وہ ان کو مدعو سمجھتے تو وہ مسلم لیڈروں کے لئے محبت کا موضوع بنتے۔ مگر جب انھوں نے دوسری نظر سے دیکھا تو وہ ان کے لئے صرف نفرت کا موضوع بن کر رہ گئے۔

۱۴ مارچ ۱۹۸۳

مکان کی پائداری کی ضمانت پختہ اینٹیں ہوتی ہیں، اسی طرح قوم کی ترقی کی ضمانت یہ ہے کہ اس کے افراد جاندار ہوں۔ بے جان افراد کے اوپر کسی زندہ قوم کی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔

میرے نزدیک مسلمان کا اصل مسئلہ وہ "خارجی سازشیں" نہیں ہیں جس کو لوگ نہایت اہتمام کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان آج بالکل بے جان ہو گئے ہیں۔ وہ اس قابل نہیں رہے کہ ان کی بنیاد پر کوئی مستحکم تعمیر قائم کی جا سکے۔

۱۵ مارچ ۱۹۸۳

مدینہ کے منافقین بظاہر عام مسلمانوں کی طرح رہتے تھے، اس لئے ظاہری حالات کے اعتبار سے ان کو پہچاننا مشکل تھا۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایک منافق کا حال نام بنام معلوم تھا۔ مگر آپ نے ان کی بابت کسی کو نہیں بتایا۔ صرف ایک صحابی حذیفہ بن الیمان کو آپ نے ان منافقین سے باخبر کر دیا تھا۔ اسی لئے وہ "امین سر رسول اللہ" کہے جاتے تھے۔

روایات میں آتا ہے کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اپنے بارے میں اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ ان میں سے نہ ہوں۔ چنانچہ آپ حذیفہ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ میں تم کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام منافقین میں شمار کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ وقد خشی عمر رضی اللہ عنہ علی نفسہ ان یکون منہم۔ فجاء الی حذیفۃ یسألہ قائلا۔ سألتك باللہ ھل عدنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من المنافقین۔ فیقول لہ لا)

حضرت عمر کا یہ واقعہ ان کے کمال ایمان کی دلیل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عبدیت کے احساس اور عظمت خداوندی کے ادراک کا آخری درجہ ہے، جس سے آگے کوئی اور ایمانی درجہ نہیں۔

۱۶ مارچ ۱۹۸۳

عربی میں گھوڑے کو فرس کہتے ہیں۔ گھوڑے کی سواری میں مہارت کو فروسیہ کہا جاتا ہے۔ ایک عربی کتاب میں حسب ذیل عبارت نظر سے گزری:

للفروسية اربعة انواع۔ ركوب الخيل والكر والفر۔ وركوب الخيل بالقوس۔ وركوب الخيل المطاعنة بالرماح۔ وركوب الخيل والمبارزة بالسيف۔

یعنی خالی گھوڑا دوڑانا۔ گھوڑے پر سوار ہوکر تیراندازی کرنا۔ گھوڑے پر سوار ہوکر نیزہ مارنا۔ گھوڑے پر سوار ہوکر تلوار چلانا۔

کہا جاتا ہے کہ خالد بن الولید اور ابوبکر صدیق اور حمزہ بن عبد المطلب ان چاروں اقسام کے ماہر تھے۔

قدیم زمانہ میں فروسیہ کی بڑی اہمیت تھی۔ اسی بنا پر قرآن میں کہا گیا کہ: واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل (الانفال) لیکن آج اگر کوئی شخص اس کو لفظی معنی میں لے کر فروسیہ کی تبلیغ کرنے لگے تو یہ شریعت اسلامی کی روح سے ناواقفیت کی دلیل ہوگی۔

۱۷ مارچ ۱۹۸۳

مجھے اسلامی تاریخ کے چند لمحات بہت ہی نادر معلوم ہوتے ہیں۔ ان لمحات میں جو کلمات کہے گئے، اس سطح کے کلمات دوبارہ تاریخ میں کہے نہ جاسکے۔

پہلا لمحہ خود پیغمبر اسلام کی ذات سے متعلق ہے۔ ہجرت کے وقت جب آپ غار ثور میں چھپے ہوئے تھے۔ آپ کے دشمن وہاں بھی تلوار لئے ہوئے پہنچ گئے۔ ابوبکر صدیق نے اندیشہ ناک لہجہ میں کہا کہ وہ تو یہاں بھی آگئے۔ آپ نے فرمایا: یا ابابکر ما ظنک باثنین اللہ ثالثهما ـــــ یہ نصرت خداوندی پر کامل یقین کا کلمہ ہے۔

دوسرا لمحہ وہ ہے جب کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔ تمام لوگ سراسیمہ تھے۔ اس وقت ابوبکر صدیق آتے ہیں۔ آپ کے اوپر سے چادر اٹھا کر دیکھتے ہیں اور پھر مسجد نبوی میں جاکر کہتے ہیں: من كان يعبد محمداً فان محمداً قد مات ومن كان يعبد

اللہ فان اللہ حیی لایموت —— یہ خدا اور بندہ کو فرق کرکے دیکھنے کا کلمہ ہے۔

تیسرا لمحہ وہ ہے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت عمر فاروق سخت جذبہ میں آجاتے ہیں۔ وہ اس کو ماننے سے انکار کردیتے ہیں کہ رسول اللہ کی وفات ہوگئی ہے۔ وہ مسجد نبوی میں تلوار لئے ہوئے کھڑے ہیں کہ ابوبکر صدیق مسجد کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ وہ عمر کو منع کرتے ہیں مگر جب وہ نہیں مانتے ہیں تو الگ ہٹ کر تقریر شروع کردیتے ہیں اور اس میں قرآن کی آیت (　　) پڑھتے ہیں۔ اس آیت کو سنتے ہی عمر فاروق بالکل ڈھ پڑتے ہیں۔ انھوں نے خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا: وقعت علی الارض وما تحملنی رجلای —— یہ حق کے اعتراف کا کلمہ ہے خواہ وہ اپنی مرضی کے خلاف کیوں نہ ہو۔

چوتھا لمحہ وہ ہے جس کا تعلق پانچویں خلیفہ راشد عمر بن عبد العزیز سے ہے۔ ان کے ایک عامل جراح بن عبد اللہ نے کہا کہ اسلام قبول کرنے والوں کی حوصلہ افزائی نہ کرنا چاہئے۔ کیوں کہ بہت بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہوگئے تو جزیہ کی رقم کم ہوجائے گی اور سرکاری مالیات پر زبردست اثر پڑے گا۔ عمر بن عبد العزیز نے جواب دیا: ویحك ان محمداً بعث هادیا ولم یبعث جابیا —— یہ دعوتی شعور اور پیغمبرانہ مشن کی معرفت کا کلمہ ہے۔

۱۸ مارچ ۱۹۸۳

عن اُمّ سلمة رضی اللہ عنھا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا خرج من بیتہ قال: بسم اللہ توکّلت علی اللہ، اللھم انی اعوذ بك اَنْ اَضِلَّ او اُضَلَّ، او اَظْلِمَ او اُظْلَمَ، او اَجْھَل او یُجْھَلَ عَلَیَّ

حضرت ام سلمہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے گھر سے نکلتے تھے تو اس طرح فرماتے تھے۔ شروع اللہ کے نام سے، میں نے اللہ پر بھروسہ کیا۔ اے اللہ میں تجھ سے پناہ چاہتا ہوں کہ میں گمراہ کروں یا گمراہ کیا جاؤں۔ میں کسی پر ظلم کروں یا مجھ پر ظلم کیا جائے۔ میں جہالت کروں یا مجھ پر جہالت کی جائے (ابو داؤد، ابن ماجہ) مشکوٰۃ جزء ثانی، صفحہ ۵۵۔

یہ محض ایک لفظی دعا نہیں ہے۔ یہ الفاظ یہ بتاتے ہیں کہ آپ جب گھر سے باہر نکلتے تھے تو کن احساسات اور کیفیات کے ساتھ نکلتے تھے۔ یہ الفاظ در اصل اس ذہنی حالت کا خارجی اظہار ہیں جو

اس وقت آپ کے اوپر چھائی ہوئی ہوتی تھی۔ اور آپ کے سینہ میں امنڈ رہی ہوتی تھی۔

۱۹ مارچ ۱۹۸۳

فتح مکہ کے بعد مختلف قبائل عرب کے وفود مدینہ آئے۔ انھیں میں سے ایک وفد قبیلہ ثقیف کا تھا۔ یہ لوگ اس وقت مشرک اور کافر تھے۔ جب وہ مدینہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مسجد نبوی میں اتارا اور مسجد کے اندر ہی ان کا خیمہ لگایا گیا تاکہ وہ قرآن کو سنیں اور لوگوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں (وانزل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفد ثقیف فی المسجد وبنی لہم خیاما لکی یسمعوا القرآن ویروا الناس اذا صلوا، زاد المعاد لابن قیم، الجزء الثالث، صفحہ ۲۶)

یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ اسلام کی دعوتی روح پوری طرح زندہ تھی۔ اب موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ مسجد میں غیر مسلموں کا داخلہ پسند نہیں کرتے۔ اور اگر کوئی غیر مسلم اتفاق سے مسجد کے اندر آجائے تو نماز کے وقت اس کو باہر کر دیتے ہیں۔ کتنا فرق ہے کل میں اور آج میں۔

بعد کا اضافہ:

نومبر ۱۹۸۷ میں ہندستانی وزیر اعظم راجیو گاندھی کٹھمنڈو (نیپال) گئے۔ ان کی اہلیہ سونیا بھی ان کے ساتھ تھیں۔ کٹھمنڈو میں قیام کے دوران دونوں نے وہاں کے ایک ہندو مندر میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ مندر کے پجاریوں نے مسز سونیا کو اس لئے مندر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی کہ وہ عیسائی ہیں، اور مذکورہ مندر میں کسی غیر ہندو کو داخلہ کی اجازت نہیں۔ اس مندر کا نام پشپا وتی مندر ہے۔ حکومت نیپال کے افسروں نے اس سلسلہ میں مذکورہ مندر کے ذمہ داروں سے رابطہ قائم کیا۔ مگر وہ آمادہ نہیں ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ راجیو اکیلے مندر میں آسکتے ہیں۔ مگر مسز سونیا کو داخلہ کی اجازت نہیں، کیوں کہ وہ بنیادی طور غیر ہندو ہیں۔

اس سے پہلے اڑیسہ کے ایک مشہور مندر میں مسز اندرا گاندھی کو محض اس بنا پر داخلہ کی اجازت نہیں ملی تھی کہ انھوں نے ایک غیر ہندو سے شادی کی ہے۔ (نئی دنیا ۳۰ نومبر ۱۹۸۷)

اسی ہندو روایت کے زیر اثر ہندستان کے مسلمانوں میں یہ مزاج پیدا ہوگیا ہے کہ وہ غیر مسلموں کا داخلہ مسجد کے اندر پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ ہندستان اور پاکستان کے علاوہ

دوسرے مسلم ممالک میں کہیں بھی اس قسم کا مزاج نہیں ہے۔ ہندستان کے مسلمان ہندستان کو تو اپنے دین سے متاثر نہ کرسکے، البتہ وہ خود ہندستان کے دین سے متاثر ہو کر رہ گئے۔

۲۰ مارچ ۱۹۸۳

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ زیادہ تر فخری نفسیات کے تحت لکھی گئی ہیں۔ وہ داعیانہ نفسیات کے تحت نہیں لکھی گئی ہیں۔

فخری نفسیات میں تمام چیزوں کی تعبیر تسکین خویش کی بنیاد پر کی جاتی ہے، اور داعیانہ نفسیات میں تمام چیزوں کی تعبیر مخاطب کی رعایت کی بنیاد پر۔ یہی وہ فرق ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابیں خواہ ان کے اپنے لئے تو کشش رکھتی ہیں، مگر غیر مسلموں کے لئے ان کتابوں میں کوئی کشش نہیں۔

۲۱ مارچ ۱۹۸۳

ابوجعفر محمد بن جریر الطبری طبرستان میں ۲۲۴ھ (مطابق ۸۳۹ء) میں پیدا ہوئے۔ اور بغداد میں ۳۱۰ھ (مطابق ۹۲۲ء) وفات پائی۔ موصوف کی دو کتابیں بہت مشہور ہیں۔ ایک، جامع البیان فی تفسیر القرآن، دوسرے، تاریخ الامم والملوک۔

امام ابن جریر طبری ابتداءً فقہ شافعی کے مقلد تھے۔ ان کی اپنی بھی ایک فقہ تھی جس کے پیرو ان کے والد کے نام کی نسبت سے "جریریہ" کہلائے۔ تاہم یہ فقہی مذہب زیادہ پھیل نہ سکا۔ امام احمد بن حنبل سے وہ کئی امور میں سخت اختلاف کرتے تھے۔ وہ احمد بن حنبل کو مجتہد نہیں مانتے، وہ ان کو صرف محدث تسلیم کرتے تھے۔

اس زمانہ میں بغداد میں امام ابن حنبل کے پیروؤں کی اکثریت ہو گئی تھی۔ یہ لوگ علامہ طبری کے سخت دشمن ہو گئے۔ حتی کہ ایک بار ایسا ہوا کہ ایک ہجوم نے ان کے مکان کو گھیر لیا اور تشدد پر آمادہ ہو گئے۔ تاہم بغداد کے صاحب الشرط کی مداخلت سے یہ ہنگامہ فرو ہو گیا۔ ان کے مخالفین جب تشدد کی کارروائی میں ناکام رہے تو انھوں نے علامہ ابن جریر پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔

ابن جریر آج اپنی بے مثال کتابوں کی وجہ سے تمام مسلمانوں کے درمیان عزت کی نظر سے

دیکھے جاتے ہیں۔ مگر اپنی زندگی میں ان کا وہ حال ہوا تھا جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اکثر بڑی شخصیتوں کے ساتھ ایسا ہی کچھ پیش آیا ہے۔ اپنے زمانہ میں وہ لوگوں کے عتاب کا شکار رہے، اور بعد کے زمانہ میں "اکابر" کی فہرست میں شامل ہو کر معزز اور مقدس بن گئے۔

۲۲ مارچ ۱۹۸۳

طرابلس یونیورسٹی کے ایک صاحب (پروفیسر مولانا) نے قرآن کی بعض آیتوں کے بارہ میں سوال کیا جن کا تعلق امور غیب سے تھا۔ اس سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے میں نے قرآن فہمی کے بارہ میں ایک اصولی بات کہی۔ میں نے کہا کہ انسان کے دائرۂ فہم کے اعتبار سے علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کی نمائندگی سائنس کرتی ہے۔ دوسرا وہ جس کا نمونہ ہم کو فلسفہ کی صورت میں نظر آتا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ دیکھئے، سائنس کے لوگوں کے یہاں ذہنی انتشار نہیں پایا جاتا۔ جب کہ فلسفیوں میں شاید ہی کوئی شخص ہو جس کے یہاں ذہنی انتشار نہ پایا جاتا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس نے علم کی دو قسمیں کر دی ہیں۔ قابل دریافت اور ناقابل دریافت۔ وہ اپنی تحقیق کو صرف قابل دریافت دائرہ میں محدود رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس داں ذہنی انتشار میں مبتلا ہوئے بغیر اپنی تحقیق کو جاری رکھنے میں کامیاب رہتا ہے۔ اس کے برعکس فلسفی قابل دریافت اور ناقابل دریافت کے فرق کو نہیں مانتا۔ وہ دونوں دائروں میں یکساں طور پر داخل ہونا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ ساری عمر کوشش کرنے کے بعد بھی پوری دریافت نہیں کر پاتا اور حالت تشکیک میں مر جاتا ہے۔

قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو علم کے دونوں دائرہ میں کلام کرتی ہے۔ تاہم اس نے پہلی بار ایک ایسی قابل عمل حد بندی قائم کر دی ہے جو فلسفہ قائم نہیں کر سکا۔ وہ یہ ہے کہ تعمق کا طریقہ صرف ان امور میں اختیار کیا جائے جو قابل دریافت دائرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور وہ امور جن کا تعلق ناقابل دریافت دائرہ سے ہے ان میں مجمل ایمان پر قناعت کی جائے۔ یہی دوسرا دائرہ ہے جس کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ ابھموا ما ابھمہ اللہ (جس چیز کو اللہ نے مبہم رکھا ہے اس کو تم بھی مبہم رکھو) یعنی جتنا بتایا گیا ہے اس کو مجمل طور پر مان کر آگے بڑھ جاؤ۔ ایک حدیث میں یہی بات ان الفاظ میں بتائی گئی ہے: وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنہا (اللہ نے کچھ چیزوں کے بارہ میں سکوت اختیار فرمایا ہے اس کے بغیر کہ وہ بھولا ہو تو تم ان باتوں میں

خوش نہ کرو۔

۲۲ مارچ ۱۹۸۲

پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام (The Preaching of Islam) پہلی بار ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اشاعت اسلام کے موضوع پر اگرچہ یہ کوئی مکمل کتاب نہیں۔ تاہم ابھی تک اس خاص موضوع پر اس سے آگے کوئی کتاب لکھی نہ جاسکی۔

اس کتاب میں جنوبی ہند میں اسلام کی اشاعت کی تاریخ بتاتے ہوئے (صفحہ ۲۷۲) مصنف نے ایک مشنری رپورٹ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کے مغربی ساحل پر موپلا میں اسلام اتنی تیزی سے پھیل رہا ہے کہ چند سال کے اندر مغربی ساحل میں ادنی نسل کے تمام ہندوؤں کا مسلمان ہوجانا عین ممکن نظر آتا ہے:

> In fact the Mopillas on the west coast are said to be increasing so considerably through accessions from the lower classes of Hindus, as to render it possible that in a few years the whole of the lower races of the west coast may become Muhammadans. Report of the Second Decennial Missionary Conference held at Calcutta 1882-83, pp. 228, 233, 248, Calcutta 1883.

سو برس پہلے کے دور میں "مغربی ساحل" پر ہونے والے جس عمل کا ذکر یہاں کیا گیا ہے، وہی عمل کم وبیش پورے ملک میں جاری تھا۔ مگر بعد کو سیاسی اور قومی لڑائیوں سے جو ماحول پیدا ہوا، اس نے اس تبلیغی عمل کا خاتمہ کر دیا۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے امکانی مواقع کو استعمال نہیں کیا، البتہ انھوں نے ممکن مواقع کو برباد کرنے کا شاندار کارنامہ ضرور انجام دیا ہے۔

۲۴ مارچ ۱۹۸۲

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "ہندستان میں عربوں کی حکومتیں" یہ کتاب پہلی بار ندوۃ المصنفین دہلی سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔ عنوان کے مطابق اس کتاب میں ان عرب مسلمانوں کے کارناموں کا ذکر ہے جو انھوں نے قدیم ہندستان میں انجام دیے۔ ۴۰۴ صفحات کی اس کتاب کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے:

"اب ہمارا یہ تاریخی، علمی، دینی اور ثقافتی سفر ختم ہوتا ہے۔ اور پھر ہم ایک ہزار سال پیچھے آرہے ہیں، اور جو کچھ دیکھا ہے اس کو اس ملک میں اپنے شاندار ماضی کا ورثہ سمجھ کر سینے سے لگاتے ہیں کہ اس کی گرمی سے ہماری ملی زندگی میں حرارت پیدا ہوگی۔"

پچھلے سو سال کے اندر برصغیر ہند میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اسی ذہن کے تحت لکھا گیا ہے۔ ہمارے تمام شعراء، خطباء اور مصنفین اسی انداز پر کلام کرتے رہے ہیں۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ یہ سراسر غلط خوراک تھی جو ہمارے رہنماؤں نے موجودہ مسلمانوں کے لئے تجویز کی۔ وہ اس راز کو نہ سمجھ سکے کہ "شاندار ماضی" کی کہانیاں سنانے سے صرف جھوٹا فخر پیدا ہوگا نہ کہ حقیقی جذبۂ عمل۔

موجودہ زمانہ میں کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ مسلمانوں کے اندر حال کا شعور پیدا کیا جاتا۔ انھیں بتایا جاتا کہ زمانہ میں کیا تبدیلیاں آئی ہیں اور ان تبدیلیوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے وہ دوسری قوموں سے کتنا زیادہ پچھڑ گئے ہیں۔ مسلمان عملاً دور جدید کی ایک پس ماندہ قوم بن چکے تھے۔ مگر "شاندار ماضی" کے قصے سنا کر فرضی طور پر ان کے اندر یہ نفسیات بنائی گئی کہ تم دوسروں سے بہت آگے ہو۔ کہنے والوں نے جو کچھ کہا وہ اگرچہ یہ تھا کہ "ہم دوسروں سے آگے تھے" مگر مسلمانوں کے ذہن میں یہ بیٹھ گیا کہ "ہم دوسروں سے آگے ہیں"۔ اس قسم کی نفسیات سے صرف جھوٹا احساس برتری پیدا ہو سکتا تھا اور صرف وہی پیدا ہوا۔ اور حقائق کی موجودہ دنیا میں جھوٹے احساس برتری سے زیادہ مہلک چیز اور کوئی نہیں۔

۲۵ مارچ ۱۹۸۳

ایک مسلمان شاعر (ہمدم) نے ایک اردو اخبار میں اپنا ایک "تازہ قطعہ" لکھ کر روانہ کیا۔ یہ پوسٹ کارڈ غلطی سے ہمارے یہاں آگیا۔ میں نے اس کا پتہ صحیح کرکے دوبارہ اس کو لیٹر بکس میں ڈلوا دیا۔ مذکورہ قطعہ یہ تھا:

ہم کو نہ ستائے اب کہہ دو یہ زمانے سے — ہم ڈرتے نہیں لوگو سر اپنا کٹانے سے
دنیا سے مسلماں کو کیا کوئی مٹائے گا — یہ قوم ہے وہ ہمدم بڑھتی ہے گھٹانے سے

اس قطعہ میں جو نفسیات نظر آرہی ہے یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی عام نفسیات ہے۔ اور یہی موجودہ

زمانہ میں ان کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

۲۶ مارچ ۱۹۸۳

عن ابن عباس، ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال یوم الفتح: لا ھجرة بعد الفتح ولکن جہاد ونیة (اخرجه الجماعة الا الموطا)

حضرت عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا: فتح کے بعد ہجرت نہیں، البتہ جہاد اور نیت ہے۔

اس حدیث کے مطابق بظاہر ہجرت کا حکم صرف فتح مکہ تک تھا۔ مکہ فتح ہو جانے کے بعد اب ہجرت کا حکم باقی نہیں رہا۔ مگر دوسری طرف کتب حدیث میں ایک اور روایت موجود ہے جو ان الفاظ میں آئی ہے:

عن معاویة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا تنقطع الھجرة حتی تنقطع التوبة ولا تنقطع التوبة حتی تطلع الشمس من مغربھا (رواہ احمد وابوداؤد والدارمی)

بظاہر ان دونوں روایتوں میں تضاد ہے۔ اس کی تطبیق میں شارحین کو بڑی مشکلیں پیش آئی ہیں، حتی کہ کچھ لوگوں نے دوسری روایت کی صحت سے انکار کر دیا ہے۔ مگر دونوں روایتوں میں کوئی واقعی ٹکراؤ نہیں۔

اصل یہ ہے کہ احادیث میں کچھ حدیثیں وہ ہیں جو وقت یا مخاطب کی نسبت سے صورت معاملہ کی وضاحت کرتی ہیں۔ اور کچھ حدیثیں وہ ہیں جو مطلق طور پر ایک اسلامی حکم کو بیان کر رہی ہیں۔ اول الذکر نوعیت کی احادیث کو خطابی اور ثانی الذکر کو اطلاقی کہا جا سکتا ہے۔

اس تقسیم کی روشنی میں دیکھئے تو مذکورہ دونوں حدیثوں کا ٹکراؤ ختم ہو جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایک ہجرت وہ ہے جو بطور اصولی حکم کے مطلوب ہے۔ دوسری ہجرت وہ ہے جو مکہ کی ۱۳ سالہ تبلیغ کے بعد اہل ایمان پر فرض ہوئی تھی۔ مکہ کی ہجرت وقتی حالات کے اعتبار سے فرض تھی۔ بعد کو جب مکہ فتح ہوا اور وہاں سے شرک کا خاتمہ کر دیا گیا تو اب مکہ سے ہجرت کی ضرورت باقی نہ رہی۔ البتہ ہجرت، ایک اصولی حکم کی حیثیت سے، بدستور باقی ہے۔ جب بھی کسی مقام پر

وہ حالات پیدا ہوں جو اسلام کی ابتدائی تاریخ میں مکہ اور مدینہ میں پیدا ہوئے تھے تو دوبارہ ہجرت مسلمانوں کے اوپر فرض ہو جائے گی۔ اس اعتبار سے ہجرت کا حکم قیامت تک کے لئے باقی ہے۔

۲۷ مارچ ۱۹۸۳

سورہ واقعہ میں ارشاد ہوا ہے: لا یمسہ الا المطہرون (قرآن کو نہیں چھوتے مگر صرف پاک لوگ) اس کا مطلب فراء نے یہ بتایا ہے کہ قرآن کا ذائقہ اور اس کا فائدہ صرف وہ لوگ پاتے ہیں جو اس کے مومن ہوں (لا یجد طعمہ ونفعہ الا من آمن بہ، تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع، صفحہ ۲۹۸)

یہ اس آیت کی ایک شاذ تفسیر ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اس کو مذکورہ آیت کی تفسیر نہ مانیں۔ تاہم الگ سے وہ ایک بالکل صحیح بات ہے۔ اور اس کا تعلق قرآن ہی سے نہیں ہے بلکہ ہر اس کتاب سے ہے جس میں کوئی فکر اور نظریہ پیش کیا گیا ہو۔

ایک فکری کتاب کو اگر کوئی شخص معاندانہ ذہن سے پڑھے تو وہ اس کے مطالب کو صحیح طور پر اخذ نہیں کر سکتا۔ فکری کتاب کو سمجھنے اور اس سے حظ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی سنجیدہ ہو، اور اس سے استفادہ کے جذبہ سے اس کو پڑھے۔ یہ بات جس طرح دوسری فکری اور نظریاتی کتابوں کے لئے صحیح ہے، اسی طرح وہ قرآن کے لئے بھی صحیح ہے۔

قاضی ابوبکر بن العربی، مالکی نے مذکورہ آیت کے بارہ میں لکھا ہے کہ یہ قول صحیح ہے کہ قرآن کی لذت وہی لوگ پا سکتے ہیں جو گناہوں سے پاک اور تائب اور عابد ہوں۔ امام بخاری نے اس کو مختار بتایا ہے (ابن العربی، احکام القرآن، جلد ۲، صفحہ ۲۳۱)

۲۸ مارچ ۱۹۸۳

دارالعلوم دیوبند اب عربی اور دینی علوم کی مشہور ترین درس گاہ ہے۔ اس میں ہزاروں طلبہ پڑھتے ہیں اور اس کا بجٹ ایک کروڑ روپیہ تک پہنچ گیا ہے۔ مگر آغاز میں وہ ایک معمولی مدرسہ سے بھی کم تھا۔

۱۵ محرم ۱۳۸۳ھ (۳۰ مئی ۱۸۶۷ء) کو دیوبند کی چھتہ مسجد میں یہ تعلیمی ادارہ شروع ہوا۔

اس وقت اس میں صرف دو آدمی تھے۔ ایک استاد اور ایک طالب علم۔ اس کے پہلے استاد کا نام ملا محمود تھا، اور اس کا پہلا طالب علم وہ نوجوان تھا جس نے بعد کو مولانا محمود حسن (شیخ الہند) کے نام سے شہرت پائی۔

یہ استقلال کا کرشمہ ہے۔ کوئی کام اگر شروع کیا جائے اور شروع کرنے کے بعد اس کو برابر جاری رکھا جائے تو طویل مدت گزرنے کے بعد بالآخر وہ اسی طرح کامیاب ہوتا ہے جس طرح دیوبند کا تعلیمی ادارہ کامیاب ہوا۔

۲۹ مارچ ۱۹۸۳

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: استعینوا علی قضاء حوائجکم بالکتمان (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی حاجتوں کو پورا کرنے میں رازداری سے مدد لو)

یہ ایک نہایت اہم نصیحت ہے۔ اس کا تعلق فرد کے معاملات سے بھی ہے اور قوم کے معاملات سے بھی۔ اس دنیا میں ہمیشہ حسد اور عداوت پائی گئی ہے اور آئندہ بھی یہ چیزیں موجود رہیں گی۔ ایسی حالت میں حاسدوں اور دشمنوں کے فتنہ سے بچنے کا راز یہ ہے کہ اپنے معاملات کو مخفی رکھا جائے تاکہ انھیں ہمارے نازک معاملات کی اطلاع نہ ہو سکے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غزوات کے سفر میں ہمیشہ رازداری سے کام لیتے تھے۔ مثال کے طور پر جس زمانہ میں آپ مکہ کی طرف مارچ کا پروگرام بنا رہے تھے تو آپ نے حضرت عائشہ اور حضرت ابو بکر تک کو اس سے پیشگی طور پر باخبر نہیں کیا۔

۳۰ مارچ ۱۹۸۳

اس دنیا میں انسان کی معراج یہ ہے کہ وہ عجز کا تجربہ کر سکے۔ وہ خدا کی الوہیت کے مقابلہ میں اپنی عبدیت کو جان لے۔ تمام پیغمبروں اور ان کے اصحاب کو اسی عجز کا تجربہ ہوا۔

اس تجربہ کی اعلیٰ صورت یہ ہے کہ قوت کی سطح پر اس کا تجربہ ہو۔ یعنی آدمی "اولوالایدی والابصار" پیدا ہو، وہ بظاہر قوت و طاقت کا مالک ہو۔ مگر اس ظاہری حالت کے پیچھے وہ باطنی حقیقت کو دیکھ لے۔ وہ بظاہر قوت رکھتے ہوئے اپنے ارادہ سے اپنے آپ کو عجز کے مقام پر بٹھا لے۔

میرا احساس ہے کہ میں بہت کمزور ہوں۔ بلکہ شاید تمام نسل انسانی میں سب سے زیادہ ضعیف انسان ہوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اتنا زیادہ کمزور کیوں پیدا کیا۔ خیال آیا کہ موجودہ زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں نہایت طاقت ور شخصیت کے لوگ پیدا کئے۔ مگر وہ اپنی طاقت ور حیثیت میں کھو گئے۔ وہ ابوبکر و عمر جیسے نہ بن سکے جو انتہائی طاقت ور شخصیت کے مالک تھے، اس کے باوجود انھوں نے عجز کی حقیقت کو دریافت کیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھ جیسے کمزور انسان کو پیدا کیا تاکہ وہ عجز کی حقیقت کا ادراک کر سکے۔ قوت کی سطح پر عجز کا تجربہ لوگوں کے لئے مشکل ہو گیا تھا، اس لئے ایک عاجز انسان کو پیدا کیا گیا تاکہ عجز کی سطح پر عجز کا تجربہ کرایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ عجز کامل کے تجربہ کے بغیر دین کامل کی نمائندگی اس دنیا میں ممکن نہیں۔

۳۱ اپریل ۱۹۸۳

پیغمبر اسلام کی بعثت کے بعد جو لوگ آپ کی نبوت کا اعتراف نہ کر سکے، ان کو قرآن نے "اندھا" بتایا ہے۔

یہ اندھے کون تھے۔ یہ مکہ کے منکرین تھے جو کہ ابراہیم و اسماعیل کی عظمت کو مانتے تھے۔ ان میں یہود اور عیسائی تھے جو موسیٰ اور عیسیٰ کی عظمتوں کا اقرار کر رہے تھے۔ پھر انھیں اندھا کیوں کہا گیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ابراہیم و اسماعیل اور موسیٰ و عیسیٰ زمانۂ ماضی کے پیغمبر تھے۔ سیکڑوں سال کے تاریخی عمل کے نتیجہ میں ان کی شخصیتیں تسلیم شدہ شخصیتیں بن گئی تھیں اور ان کی عظمتیں لوگوں کے ذہنوں میں قائم ہو چکی تھیں۔ جب کہ پیغمبر عربی لوگوں کی نظر میں ابھی صرف "محمد بن عبداللہ" تھے۔ ان کی شخصیت ابھی تسلیم شدہ شخصیت نہیں بنی تھی۔ وہ بڑے بڑے واقعات ابھی پیش نہیں آئے تھے جنھوں نے بعد کو آپ کی عظمت کو تاریخ کا ایک مسلمہ بنا دیا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص غیر قائم شدہ عظمت کو نہ دیکھ سکے وہ اندھا ہے، خواہ وہ قائم شدہ عظمتوں کو دیکھنے کے معاملہ میں اپنے آپ کو کتنا ہی زیادہ بینا ثابت کر رہا ہو۔

یکم اپریل ۱۹۸۳

علماء کی ایک تعداد کے نزدیک قرآن کو غیر مسلم کے ہاتھ میں دینا ناجائز ہے۔ اس کے بعد قرآنی

تبلیغ کی ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ قرآن کا صرف ترجمہ چھاپا جائے اور اس کو غیر مسلموں تک پہنچایا جائے۔ مگر علاوہ بھی ممکن نہیں۔ کیوں کہ ان علماء کے فتوے کے مطابق، قرآن کو متن کے بغیر چھاپنا جائز نہیں۔

اس استدلال کی بنیاد قرآن کی اس آیت پر ہے کہ : لا یمسہ الا المطھرون (الواقعہ) مگر یہ استدلال صحیح نہیں۔ اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ اس کو نہیں چھوتے ہیں مگر پاک لوگ۔ گویا کہ یہ ایک خبر ہے نہ کہ حکم۔ چنانچہ اہل تفسیر کی اکثریت نے " مطھرون " سے فرشتوں کو مراد لیا ہے۔ ابن کثیر لکھتے ہیں : قال ابن زید زعمت کفار قریش ان ھذا القرآن تنزلت بہ الشیاطین فاخبر اللہ تعالیٰ انہ لا یمسہ الا المطھرون، کما قال تعالیٰ (وما تنزلت بہ الشیاطین وما ینبغی لھم وما یستطیعون انھم عن السمع لمعزولون) وھذا القول قول جید (تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع، صفحہ ۲۹۸)

ابن زید نے کہا کہ کفار قریش کا گمان تھا کہ قرآن کو شیاطین اتارتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ قرآن کو صرف پاک لوگ (فرشتے) چھوتے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اس کو شیطان نہیں اتارتے اور نہ ان کے لئے سزاوار ہی ہے اور نہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ وہ آسمانی باتوں کو سننے سے روک دئے گئے ہیں۔ ابن کثیر اس کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ یہ بہترین قول ہے۔

قتادہ تابعی کا قول ہے کہ قرآن کو اللہ کے پاس صرف پاک لوگ (فرشتے) چھوتے ہیں۔ باقی دنیا میں تو یہاں اس کو مجوسی اور نجس اور منافق بھی چھوتے ہیں (لا یمسہ عند اللہ الا المطھرون فاما فی الدنیا فانہ یمسہ المجوسی والنجس والمنافق، احکام القرآن للجصاص، جلد ۳، صفحہ ۵۱۱)

ابراہیم نخعی اپنے استاد علقمہ بن قیس (م ۶۲) کے متعلق کہتے ہیں کہ ان کو جب مصحف کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ ایک نصرانی سے کہتے تھے، اور وہ ان کے لئے مصحف لکھ دیتا تھا (انہ کان اذا اراد ان یتخذ مصحفاً امر نصرانیاً فنسخہ، المحلی ابن حزم، جلد ۱، صفحہ ۸۴)

اسی طرح بیان میں کہا گیا ہے کہ حضرت عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ کے لئے حیرہ کے ایک نصرانی نے ایک مصحف ۷۰ درہم میں لکھا تھا (ان عبد الرحمن بن ابی لیلی کتب لہ نصرانی من اھل الحیرۃ مصحفاً بسبعین درھماً، مصنف عبد الرزاق، باب بیع المصحف، جلد ۸، صفحہ ۱۴۳)

پانچویں صدی ہجری کے ظاہری عالم ابن حزم اندلسی (م ۴۵۶) کسی قید اور شرط کے بغیر علی الاطلاق

مَسِ قرآن کے عمومی جواز کے قائل ہیں۔

جو لوگ مَسِ قرآن کے عمومی جواز کے قائل ہیں، ان کے استدلال کی ایک بنیاد یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہنشاہ ہرقل کے نام جو مکتوب روانہ کیا تھا، اس میں قرآن کی آیت بھی درج تھی۔ یہ مکتوب نبوی صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی میں مکمل طور پر نقل ہوا ہے۔

ہندستان کے مشہور عالم مفتی کفایت اللہ صاحب نے غیر مسلم کو ترجمہ قرآن دینا جائز بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قرآن کریم کا ترجمہ مسلمانوں کے حق میں قرآن کا حکم رکھتا ہے، اور غیر مسلموں کو تبلیغ کے لئے دینا جائز ہے (کفایت المفتی، جلد اول)

۱۲ اپریل ۱۹۸۳

عہد حاضر کے ہندو فلسفی جے کرشنا مورتی (۱۹۸۳-۱۸۹۵) نے کہا کہ عقلمند لوگوں کے پاس اقتدار نہیں، اور جن کے پاس اقتدار ہے وہ عقلمند نہیں:

The wise wield no authority, and those in authority are not wise.

یہ قول غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ غیر عقلمند لوگ اقتدار کے مناصب پر قابض ہیں۔ مگر یہ بات صحیح نہیں۔ جو لوگ اقتدار پر قبضہ حاصل کرتے ہیں وہ دوسروں سے کچھ زیادہ ہی ہوشیار ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ اقتدار کے منصب تک پہنچ ہی نہ سکیں۔

زیادہ صحیح بات وہ ہے جو لارڈ ایکٹن (۱۹۰۲-۱۸۳۴) نے کہی۔ اس نے کہا تھا کہ اقتدار بگاڑتا ہے، اور کامل اقتدار تو بالکل بگاڑ دیتا ہے:

Power corrupts, and absolute power corrupts absolutely.

حقیقت یہ ہے کہ ارباب اقتدار کی غلط کاری کا تعلق خود اقتدار سے ہے نہ کہ ذہنی صلاحیت سے۔ اقتدار ایک ایسا نشہ ہے جو آدمی کو بگاڑے بغیر نہیں رہتا۔ اقتدار کے باوجود بگاڑ سے صرف وہ شخص بچ سکتا ہے جو یا تو بہت زیادہ سنجیدہ ہو یا بہت زیادہ متقی۔ سنجیدگی آدمی کو حقیقت پسند بناتی ہے اور خدا کا خوف آدمی کو (Man cut to size) بنا دیتا ہے۔

۳ اپریل ۱۹۸۳

کام دو قسم کے ہوتے ہیں : خدا کو دکھانے کے لئے، اور انسان کو دکھانے کے لئے۔ بظاہر دونوں میں صرف ایک معمولی لفظی فرق ہے۔ مگر دونوں ایک دوسرے سے اتنا زیادہ مختلف ہیں کہ ایک اگر اس دنیا کا سب سے زیادہ باقیمت عمل ہے، تو دوسرا سب سے زیادہ بے قیمت عمل۔

ایک صورت یہ ہے کہ آدمی نے قرآن و حدیث میں غور کیا۔ اس کے دل میں خدا کی یاد جاگ اٹھی اور آخرت کی بازپرس کا احساس پیدا ہوا۔ اس احساس اور اس شعور کے تحت اس کے اندر عمل کی تڑپ پیدا ہوئی۔ وہ کانپتے ہوئے دل اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اس کو کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا —— یہ خدا کے لئے کرنا ہے۔ یہی وہ کام ہے جو مومن سے اس دنیا میں مطلوب ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو آخرت کی دنیا میں باقیمت قرار پائے گی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی یہ سوچے کہ لوگوں کے اندر مقبولیت حاصل کرنے کے لئے کونسا اشو کھڑا کرنا زیادہ کارآمد ہے۔ کون سے الفاظ بولے جائیں تو عوام کی بھیڑ کو اپنا ہم نوا بنایا جاسکتا ہے۔ وہ کون سا موضوع ہے جس کو لے کر اٹھیں تو ارباب دولت فوراً ہماری طرف متوجہ ہوجائیں گے —— یہ سب انسان کے لئے یا انسان کو دکھانے والے کام ہیں۔ جو لوگ اس قسم کے کاموں میں مصروف ہوں، وہ خدا کے نزدیک لعنت زدہ ہیں، خواہ وہ انسانوں کے درمیان بظاہر باعزت بنے ہوئے ہوں۔

۴ اپریل ۱۹۸۳

قسم معاويةُ مرةً قُطُفاً فاعطى شيخاً من اهل دمشق عطيةً لم تُعجبه فغضب الرجل وحلف ليضربنّ بها رأس معاوية۔ فاستدعاه الخليفة وكشف له عن رأسه وقال : اَوف بيمينك وليرفُق الشيخ بالشيخ۔

امیر معاویہ نے ایک بار لوگوں کو تحفے تقسیم کئے۔ چنانچہ انھوں نے دمشق کے ایک بزرگ کو عطیہ دیا جو ان کو پسند نہیں آیا۔ وہ شخص غصہ ہوا۔ اس نے قسم کھا کر کہا کہ میں اس کو معاویہ کے سر پر ماروں گا۔ امیر معاویہ نے ان کو بلایا اور اپنا سر کھول کر کہا کہ اپنی قسم پوری کرو۔ البتہ ایک بوڑھے کو دوسرے بوڑھے کے ساتھ نرمی کرنا چاہئے۔

امیر معاویہ اپنے وقت کی عظیم ترین سلطنت کے حکمراں تھے۔ ان کے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس آدمی کو بلائیں۔ اور اس سے کہیں کہ بادشاہ وقت کی شان میں ایسی گستاخی کرنے کی جرأت تم کو کیسے ہوئی۔ اس کے بعد جلاد کو حکم دیں کہ اس کی گردن مار دو۔ مگر امیر معاویہ نے اس کے بالکل برعکس عمل کیا۔ انھوں نے مذکورہ آدمی کی "گستاخی" کو نظر انداز کرتے ہوئے حکمت کا طریقہ اختیار کیا۔ اس طرح ایک ایسا معاملہ جو قتل وخون اور مسلمانوں کے درمیان باہمی نفرت کا ذریعہ بنتا، وہ صرف ایک جملہ میں ختم ہوگیا۔

۵ اپریل ۱۹۸۳

جینے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے دوسروں کی دنیا میں جینا۔ دوسرا ہے اپنی دنیا میں جینا۔ دوسروں کی دنیا میں جینے کا مطلب ہے تاجر بن کر جینا، عہدیدار بن کر جینا، عوامی لیڈر بن کر جینا۔ وغیرہ۔ جینے کی اس قسم میں آدمی کو دوسروں کی مرضی کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ اس کو وہ کرنا پڑتا ہے جس کو دوسرے لوگ چاہتے ہوں۔ آدمی دوسروں سے مصالحت کرکے ہی دوسروں کے درمیان جینے کے مواقع پا سکتا ہے۔

مگر ایک زندہ انسان کے لئے جینے کی یہ صورت ذہنی عذاب سے کم نہیں۔ کیوں کہ عوام سے مصالحت کرنے کے لئے آدمی کو سطحی بننا پڑتا ہے اور سطحیت کسی زندہ انسان کے لئے موت ہے۔ اپنی دنیا میں جینا ہی دراصل جینا ہے۔ مگر جینے کی یہ قسم صرف اس شخص کے حصہ میں آتی ہے جس نے خود کوئی نئی چیز دریافت کی ہو، جو اپنی ذاتی ڈسکوری کی بنیاد پر کھڑا ہو سکے۔

میرے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہے کہ اس نے مجھے "دریافت" کی نعمت عطا فرمائی۔ خدا کے فضل سے میرا یہ حال ہے کہ اگر ساری دنیا میرا ساتھ چھوڑ دے تب بھی میرے پاس تمام چیزوں سے زیادہ قیمتی چیز باقی رہے گی، اور وہ میری اپنی دریافت ہے۔ اگر میری کوئی اپنی دریافت نہ ہوتی تو میں اپنی دنیا میں ہرگز نہیں جی سکتا تھا۔ اور دوسروں کی دنیا میں جینے کی صورت میں زندگی میرے لئے ایک ایسا عذاب بن جاتی جس کا تحمل میرے لئے تقریباً ناممکن تھا۔

۶ اپریل ۱۹۸۳

جارج سارٹن (۱۹۵۶ ۱۸۸۴) تاریخ سائنس کا مشہور عالم تھا۔ اس نے مسلم سائنس دانوں

کی کتابوں کو براہ راست پڑھنے کے لئے عربی زبان سیکھی۔ اس سلسلہ میں اس نے شام، مصر، تیونس الجیریا اور مراکش کے سفر کئے۔ اس نے بہت کھل کر مسلم سائنسدانوں کے کام اعتراف کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے:

"انسانیت کا مشن مسلمانوں ہی کے ذریعہ مکمل ہوا۔ سب سے بڑا فلسفی الفارابی اور سب سے بڑا ریاضی داں ابوالکامل اور ابراہیم ابن سینا مسلمان تھے۔ سب سے بڑا جغرافیہ داں اور قاموس نگار المسعودی مسلمان تھا، اور سب سے بڑا مورخ الطبری بھی مسلمان تھا۔ راجر بیکن، گربرٹ، آرچی لیک اور تھامسن برن نے انھیں اداروں میں تعلیم حاصل کی۔ اور ریمنڈ نے یہیں سے فارغ ہوکر ۱۱۴۰ء میں فرانسیسی بندرگاہ مارسیلز میں سیاروں کی گردش کے بارہ میں نقشے اور جدولیں تیار کیں۔

George A. L. Sarton, Heritage of Islam, p. 313

اس قسم کی باتیں موجودہ زمانہ کے بہت سے مغربی محققین نے لکھی ہیں، اور مسلمان ان کو نقل کرکے خوش ہوتے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ان بیانات میں اصل بات حذف ہوگئی ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ تمام ترقیاں جو اسلامی انقلاب کے بعد پیدا ہوئیں، وہ سب توحید کے خانہ میں جاتی ہیں۔ اسلامی انقلاب نے جب شرک کو ختم کرکے نیچر کو معبودیت کے مقام سے ہٹایا اسی وقت نیچر پر غور و فکر کا دروازہ کھلا اور بالآخر تمام موجودہ ترقیاں ظہور میں آئیں۔ مسلم سائنس اور مغربی سائنس دونوں، باعتبار حقیقت غیر مشرکانہ نقطۂ نظر کا کارنامہ ہیں نہ کہ محض کوئی قومی کارنامہ۔ اور انسانی تاریخ میں سب سے پہلے جس نے غیر مشرکانہ طرز فکر پیدا کیا وہ اسلام کے ذریعہ آنے والا موحدانہ انقلاب تھا۔

۷ اپریل ۱۹۸۳

واعظین اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت میں یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ سب سے پہلے اللہ نے میرے نور کو پیدا کیا (اول ما خلق اللہ نوری)، اس روایت کا کوئی حوالہ یا سند نہیں بیان کی جاتی۔ اس بنا پر یہ بجائے خود مخدوش ہے۔ دوسری طرف ترمذی، کتاب القدر میں ایک روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: اول ما خلق اللہ القلم (سب سے پہلے اللہ نے قلم کو پیدا کیا)

ظاہر ہے کہ دونوں باتیں بیک وقت صحیح نہیں ہو سکتیں۔ اور چوں کہ دوسری روایت زیادہ قوی ہے، اس لئے یہی مانا جائے گا کہ صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا۔ تاہم یہ واضح ہو کہ یہاں "قلم" کا لفظ اپنے معنوی مفہوم میں ہے نہ کہ محض ظاہری مفہوم میں۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں کہ مروجہ قلم کو اس کی موجودہ صورت میں پیدا کیا گیا۔ بلکہ قلم کی جو حقیقت ہے اس کے اعتبار سے اس کی پیدائش عمل میں آئی۔

ایک روایت عبدالرزاق بن الہمام (م ۲۱۱ھ) کی مصنف میں ان الفاظ میں آئی ہے: یاجابر اوّل ماخلق اللہ نور نبیک من نورہ (اے جابر، سب سے پہلے اللہ نے تمہارے نبی کو اپنے نور سے پیدا کیا) اس سلسلہ میں پہلی بات یہ کہ عبدالرزاق بن ہمام محدثین کے یہاں معتبر نہیں۔ وہ شیعہ ہیں اور فضائل اہل بیت کے سلسلہ میں موضوع اور جھوٹی روایتیں بے تکلف نقل کرتے ہیں۔ ان کی دس جلدوں کی کتاب میں صحیح کے ساتھ ضعیف، مرسل، منقطع، منکر اور موضوع ہر قسم کی روایتیں موجود ہیں۔

درایت کے اعتبار سے یہ روایت سخت قابل اعتراض ہے۔ اس کے مطابق اللہ کی ذات کا ایک جزء علیحدہ ہو کر ذات محمدی کی صورت میں مجسم ہوا۔ یہ بالکل لغو بات ہے۔ اللہ کی ہستی ایک کامل ہستی ہے۔ ذات الٰہی کا ایک جزء، اگر علیحدہ ہو تو ذات الٰہی میں نقص لازم آجائے گا، اور یہ بلاشبہ ناقابل تصور ہے۔

۸ اپریل ۱۹۸۳

اکثر مجھ پر یہ تجربہ گزرتا ہے کہ موت کی قربت کا احساس میرے اوپر اتنی شدت کے ساتھ طاری ہوتا ہے کہ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے گویا اگلے ہی لمحہ میری زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ اس وقت میں عجلت کر کے کلمہ شہادت ادا کرتا ہوں اور یہ دعا پڑھنے لگتا ہوں:

رب اغفرلی خطیئتی یوم الدین

دعا اور کلمۂ شہادت کی ادائگی میں جلدی اس لئے کرتا ہوں کہ ڈر ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کو ادا کرنے سے پہلے میری موت آجائے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مجھے بخش دے، اس کی بخشش کے سوا اور چیز کا کوئی سہارا نہیں۔

۱۹ اپریل ۱۹۸۳

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لاتختلفوا فتختلف قلوبکم (اختلاف نہ کرو، ورنہ تمہارے دل باہم مختلف ہو جائیں گے) دوسری روایت یہ ہے کہ (اختلاف امتی رحمۃ (میری امت کا اختلاف رحمت ہے)

اہل علم کی ایک تعداد نے دوسری روایت کو موضوع یا کم از کم غیر معتبر بتایا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کی اسناد کمزور ہیں۔ نیز یہ کہ ان میں تضاد ہے۔ ابن حزم لکھتے ہیں کہ اگر ہم یہ مان لیں کہ اختلاف رحمت ہے تو یہ بھی ماننا ہوگا کہ اتفاق زحمت ہے (لوکان الاختلاف رحمۃ لکان الاتفاق سخطا)

مگر ابن حزم اور دوسرے حضرات کی یہ تنقید صحیح نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں روایتوں میں "اختلاف" دو الگ الگ معنوں میں ہے۔ پہلی روایت میں اختلاف کا لفظ اپنے آخری معنی کے اعتبار سے استعمال ہوا ہے اور دوسری روایت میں صرف ابتدائی معنی میں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ پہلی روایت میں اختلاف کا لفظ اختلاف میں اصرار کی حد تک جانے کے معنی میں ہے اور دوسری روایت میں مجرد اظہار اختلاف کے معنی میں۔

جس معاشرہ میں اظہار رائے کی آزادی ہو، اسی کے ساتھ لوگ یہ بھی جانتے ہوں کہ اختلاف کے باوجود انھیں ہر حال میں جماعت کے ساتھ متحد رہنا ہے، ایسے ماحول میں اختلاف رحمت بن جاتا ہے۔ مگر جہاں ہر آدمی اپنی رائے پر اصرار کرنے لگے، اختلاف کے بعد وہ کسی طرح متحد ہونے کے لئے تیار نہ ہو تو ایسے ماحول میں اختلاف صرف بربادی تک پہنچنے کا سبب بنتا ہے۔ پہلے اختلاف کی ایک حد ہے۔ اور وہ حد یہ ہے کہ جب تک وہ رحمت کا باعث ہے، اس وقت تک اختلاف، اس کے بعد اختلاف نہیں۔ اس کے برعکس دوسرا اختلاف کسی حد کو نہیں جانتا۔ وہ شروع ہونے کے بعد برابر جاری رہتا ہے، خواہ اس کے بعد مسلمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آپس میں لڑنے لگیں۔

۱۰ اپریل ۱۹۸۳

سید ابو الاعلیٰ مودودی (۱۹۷۹ - ۱۹۰۳) ایک طرف یہ دعویٰ کرتے رہے کہ پاکستان میں ان کی کوششوں سے اسلامی انقلاب آچکا ہے۔ حتی کہ ان کی جماعت کے ایک شخص نے ان کے بارہ میں ایک

کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے " سید مودودی کا عہد " ایک طرف ان حضرات کا یہ دعویٰ ہے۔ دوسری طرف یہ حال ہے کہ قیام پاکستان کے بعد خود " عہد ساز " ابو الاعلیٰ مودودی کی زندگی میں جماعت اسلامی پاکستان نے چار بار الکشن میں حصہ لیا اور ہر بار اس کو زبردست شکست ہوئی۔

جارج کینان نے کہا تھا کہ یہ ممکن ہے کہ ایک طاقت ور ملک ایک چھوٹی ریاست کو فوجی طور پر شکست دے دے مگر ایک انقلاب کو شکست دینا سخت مشکل ہے :

It is easy for a mighty country to defeat a small state militarily but it is difficult to defeat a revolution.
George F. Kennan

پاکستان میں اگر مسلم لیگ کی تحریک یا خود جماعت اسلامی کی تحریک سے اسلامی فکری انقلاب آگیا ہوتا تو ناممکن تھا کہ کوئی بھی " ایوب " یا کوئی بھی " بھٹو " اسلام پسندوں کو الکشن میں شکست دے سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے اسلام پسند قائدین یا تو نادانوں کی اس قسم سے تعلق رکھتے تھے جن کے پاس حالات کا اندازہ کرنے کے لئے خوش فہمیوں کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں ہوتا یا وہ ان شاطر لیڈروں میں سے تھے جو اپنی لیڈری کے لئے سیاسی جھوٹ بولنے کو جائز سمجھتے ہیں۔

۱۱ اپریل ۱۹۸۲

قال ملحد لاحد المومنين الست تقول لن يصيبك الا ما كتبَ اللهُ عليك۔ قال بلى۔ قال فارمِ بنفسك من ذروةِ هذا الجبل، فاذا قدّر اللهُ لك السلامة تسلم۔ فقال له۔ يا هذا، ان الله تعالى يختبر عبادَه وليس لعبد ان يختبر ربّه۔

ایک ملحد نے ایک مومن سے کہا، کیا تم یہ نہیں کہتے کہ تمہارے اوپر صرف وہ مصیبت آئے گی جو اللہ نے تمہارے اوپر لکھ دی ہو۔ اس نے کہا کہ ہاں۔ ملحد نے کہا کہ پھر تم اپنے آپ کو اس پہاڑ کی چوٹی سے گرا دو۔ اگر اللہ نے تمہارے لئے بچنا مقدر کیا ہوگا تو تم بچ جاؤ گے۔ مومن نے اس سے کہا کہ اے شخص، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے، بندہ کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے رب کو آزمائے۔

یہ نہایت حکیمانہ جواب ہے۔ اس قسم کا گہرا جواب دینا کسی کو کتابی علم کے ذریعہ نہیں آتا۔ یہ صلاحیت صرف اس ربانی علم سے پیدا ہوتی ہے جس کو خشیت الٰہی کہا گیا ہے۔

۱۲ اپریل ۱۹۸۲

مولانا علی میاں کے والد مولانا سید عبدالحیٔ (م ۱۹۲۳) ندوۃ العلماء کے ناظم تھے۔ ان کی ایک عربی کتاب کا نام ہے "جنة المشرق ومطلع النور المشرق" اصل کتاب غالباً ابھی تک مخطوطہ کی حالت میں ہے۔ البتہ اس کا اردو ترجمہ "ہندستان اسلامی عہد میں" کے نام سے ۱۹۷۲ میں ندوہ سے شائع کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے باب (ہندستان کی درس گاہیں) کے تحت دہلی کے ایک قدیم مدرسہ بازار دریبہ کا ذکر ہے۔ اس کے تحت حسب ذیل سطریں درج ہیں:

"یہ مدرسہ دہلی کے بازار دریبہ میں تھا۔ اسے نواب روشن الدولہ نے محمد شاہ کے عہد میں سنہری مسجد کے قریب ۱۱۳۴ھ میں بنوایا تھا۔ یہ مغلیہ حکومت کے اخیر تک باقی تھا۔ ۱۸۵۷ء میں اسے انگریزوں نے کوتوالی بنادیا (صفحہ ۱۶۵)

یہ وسیع مدرسہ جو برطانی دور میں کوتوالی بنایا گیا تھا، اب وہ چاندنی چوک کے گوردوارہ کا ایک حصہ ہے۔ ۱۸۵۷ میں مسلمانوں نے جو مسلح تصادم یا انگریزوں کے الفاظ میں "غدر" کیا، وہ میرے نزدیک محض ایک احمقانہ فعل تھا۔ اس کے بے شمار نقصانات مسلمانوں کو پہنچے۔ انھیں میں سے ایک نسبتاً چھوٹا نقصان وہ ہے جس کی مثال اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔

۱۳ اپریل ۱۹۸۲

ایک صاحب نے کچھ لوگوں کے اخلاق کی تعریف کی، اور کچھ دوسرے لوگوں کو بے اخلاق بتایا۔ میں نے کہا کہ آپ کے نزدیک لوگوں کے درمیان تقسیم یہ ہے کہ کچھ لوگ بااخلاق ہیں اور کچھ لوگ بے اخلاق۔ مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میرے نزدیک اصل تقسیم بااخلاق اور بے اخلاق کی نہیں، بلکہ ہوشیار مفاد پرست اور بیوقوف مفاد پرست کی ہے۔ ان دونوں کا کیس یکساں طور پر مفاد پرستی کا کیس ہے۔ مگر کچھ لوگ اسی ذاتی مقصد کو ہوشیاری کے ساتھ حاصل کر رہے ہیں جس کو دوسرے لوگ بیوقوفی کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ میرا یہ تاثر تجربات کی روشنی میں بنا ہے۔ جن حضرات کو لوگ بااخلاق

بتاتے ہیں، ان کا میں نے ذاتی تجربہ کیا۔ میں نے پایا کہ وہ لوگ اپنے سلوک میں دہرا معیار اختیار کئے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے لوگوں کے لئے خوش اخلاق ہیں۔ مگر جن لوگوں کو وہ اپنا نہ سمجھیں ان کے ساتھ وہ خوش اخلاقی برتنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

مثلاً ایک شخص ان کا استقبال کرے یا وہ ان کا مدح خواں ہو تو اس کے ساتھ ان کا سلوک نہایت عمدہ ہوتا ہے۔ مگر جو شخص ان پر تنقید کر دے یا جس سے انھیں اکرام اور اعزاز ملنے کی امید نہ ہو اس کے لئے وہ عام انسانوں کی طرح بد اخلاق بن جاتے ہیں۔ یہ فرق ثابت کرتا ہے کہ ان کا اخلاق اصول کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ ذاتی مفاد کی بنیاد پر ہے۔ وہ اصول کی بنیاد پر با اخلاق ہوتے تو وہ دونوں قسم کے لوگوں کے ساتھ اخلاق برتتے۔ مگر جس شخص کا اخلاق ذاتی مفاد کے تابع ہو وہ یہی کرے گا کہ جہاں اس کو ذاتی فائدہ نظر آئے گا وہاں وہ با اخلاق بن جائے گا، اور جہاں ذاتی فائدہ نہ ہوگا وہاں وہ بے اخلاق بنا رہے گا۔

۱۴ اپریل ۱۹۸۳

ایک صاحب نے پرجوش طور پر ایک شاعر کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے قوم کو اتحاد و ترقی کا سبق دیا تھا۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے مذکورہ شاعر کا یہ شعر پیش کیا:

زرد ہے پھولوں کی رنگت اڑ گیا کلیوں کا روپ　　آؤ مل کر اہتمام زینت بستاں کریں

اگر یہ دعویٰ صحیح ہو اور شاعر نے واقعۃً قوم کو اتحاد و ترقی کا پیغام دینا چاہا ہو، تب بھی اس کو شاعری کہا جائے گا نہ کہ کوئی حقیقی تعمیری پیغام۔ کوئی رقاصہ اگر رقص کی زبان میں عبادت کی تبلیغ کرے تو رقاصہ کی نیت خواہ جو بھی ہو مگر عملاً وہ ایک رقص کا مظاہرہ ہوگا نہ کہ عبادت الٰہی کی تبلیغ۔ اسی طرح اتحاد و ترقی کا جو پیغام شعر و شاعری کی زبان میں دیا جائے وہ عملاً صرف شاعری بن کر رہ جائے گا، وہ لوگوں کے درمیان اتحاد و ترقی کے پیغام کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔

۱۵ اپریل ۱۹۸۳

ابن السماک قدیم بغداد کے ایک واعظ تھے۔ ایک بار انھوں نے عباسی خلیفہ ہارون الرشید (۱۹۳ - ۱۴۸ھ) کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ لا تحرق وجهك في النار (ایسا نہ کرو کہ تمہارا

چہرہ آگ میں جلے) یہ سن کر ہارون الرشید رونے لگا۔

ابن السماک کے یہاں ایک ذہین خادمہ تھی۔ انھوں نے ایک بار خادمہ سے پوچھا کہ میرا وعظ کیسا ہوتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ آپ کا وعظ تو بہت اچھا ہوتا ہے۔ مگر آپ ایک بات کو بار بار کہتے ہیں، اس طرح آپ کا وعظ بہت لمبا ہو جاتا ہے۔ ابن السماک نے کہا کہ میری مجلس میں خواص بھی ہوتے ہیں اور عوام بھی۔ میں بات کی تفصیل اس لئے زیادہ کرتا ہوں کہ جو عوام ہیں وہ بھی میری بات کو سمجھ جائیں۔ خادمہ نے جواب دیا: جب تک عوام سمجھیں گے اس وقت تک خواص اکتا چکے ہوں گے۔

اس معاملہ میں زیادہ بہتر یہ ہے کہ آدمی اپنے لئے کسی ایک گروہ کا انتخاب کرلے۔ وہ یا تو خواص کو اپنا مخاطب بنائے یا عوام کو۔ اگر اس نے دونوں کو اپنا مخاطب بنانے کی کوشش کی، تو ایک گروہ کے تقاضے پورے کرنے کی کوشش میں وہ دوسرے گروہ کے مزاج کی رعایت نہ کرسکے گا۔

۱۶ اپریل ۱۹۸۳

احادیث کی جمع وتدوین کا کام کئی مرحلوں میں ہوا ہے۔ اس کا پہلا دور پہلی صدی ہجری کے آخر میں شروع ہوا اور دوسری صدی ہجری کے نصف اول میں ختم ہوگیا۔ بصرہ کے ربیع بن صبیح (م ۱۶۰ھ) مکہ کے ابن جریج (م ۱۵۰ھ) اور کوفہ کے سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ) وغیرہ اسی پہلے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

احادیث کی جمع وتدوین کا دوسرا دور دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں شروع ہوا۔ اور اس کے خاتمہ تک جاری رہا۔ مدینہ کے امام مالک (م ۱۷۹) وغیرہ اسی دور ثانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ امام مالک کی موطا بہت مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابتداءً موطا میں چار ہزار سے زیادہ حدیثیں تھیں۔ مگر امام مالک مسلسل تنقیح کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ان کے انتقال کے وقت اس میں ایک ہزار سے کچھ زیادہ حدیثیں رہ گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ موطا امام مالک کے بہت سے نسخے پائے جاتے ہیں، اور وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان مختلف نسخوں کی تعداد ۲۰ سے ۳۰ تک بتائی گئی ہے۔

مذکورہ دونوں دوروں میں تدوین حدیث کا کام زیادہ تر فقہ کے زیر اثر ہوا۔ چنانچہ

ان دونوں دوروں کی حدیث کی کتابیں فقہی ابواب وفصول پر مرتب کی گئی ہیں۔

تدوین حدیث کا تیسرا دور تیسری صدی ہجری کی ابتداء میں ہوا۔ سب سے پہلے مسند اسد بن موسیٰ اموی (م ۲۱۲ھ) مسند نعیم بن حماد خزاعی (م ۲۲۹ھ) وغیرہ لکھی گئیں۔ اس دور میں محدثین نے کثرت سے مسانید جمع کیں۔ ان میں مسند امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) سب سے زیادہ جامع اور ضخیم سمجھی جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو "خاتمۃ المسانید" لکھا ہے۔

میں ذاتی طور پر "مسند" والی ترتیب کو زیادہ سائنٹفک سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ اس میں حدیث اپنی اصل صورت میں قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ اس کے برعکس فقہی ترتیب میں دو واضح کمیاں ہیں۔ ایک یہ کہ اکثر اپنے فقہی ڈھانچہ میں لانے کے لئے محدث حدیث کی تقطیع کر دیتا ہے۔ وہ حدیث کا ایک حصہ ایک باب میں درج کرتا ہے اور دوسرا حصہ دوسرے باب میں۔

دوسرا مسئلہ "ترجمہ باب" کا ہے۔ محدث بطور خود حدیث کا ایک فقہی مفہوم مقرر کر کے اس کو ایک خاص باب کے تحت درج کر دیتا ہے۔ حالانکہ میں نے ذاتی تجربہ میں بار بار پایا ہے کہ حدیث کا اصل مفہوم محدث کے "ترجمہ باب" سے کہیں زیادہ وسیع اور بامعنی ہوتا ہے۔

۱۷ اپریل ۱۹۸۳

قرآن میں کہا گیا ہے کہ واسجد واقترب (العلق) یعنی سجدہ کرو اور خدا سے قریب ہو جا۔ حدیث میں اس کی تشریح ان الفاظ میں ملتی ہے: اقرب ما یکون العبد من ربہ وھو ساجد (بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ اس وقت قریب ہوتا ہے جب کہ وہ سجدہ میں ہوتا ہے) صحیح مسلم

اس آیت اور اس حدیث پر غور کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ سجدہ خدا اور بندہ کے درمیان مقام اتصال (Metting Point) ہے۔ سجدہ اظہار عجز کی آخری اور انتہائی صورت ہے۔ اور عجز ہی واحد چیز ہے جس کے ذریعہ بندہ اپنے خدا سے قریب ہو سکتا ہے۔

اس معاملہ کی ایک مادی تمثیل مقناطیس کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ مقناطیس کے ہر ٹکڑے میں ایک نگیٹیو سائڈ (منفی رخ) ہوتا ہے اور ایک پازیٹیو سائڈ (مثبت رخ)۔ ایک کو نارتھ پول اور دوسرے کو ساؤتھ پول کہا جاتا ہے۔ اگر آپ مقناطیس کے دو ٹکڑوں

کولیں اور دونوں کے پازیٹو سائڈ کو آمنے سامنے کریں تو وہ کبھی نہیں ملے گا۔ مگر جب آپ ایک کا پازیٹو سائڈ اور دوسرے کا نگیٹو سائڈ آمنے سامنے کریں تو دونوں فوراً جڑ جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ عظیم وکبیر ہے۔ کبریائی تمام تر اسی کو سزاوار ہے۔ اب انسان اگر بڑائی کے احساس کو لئے ہوئے خدا کی طرف متوجہ ہو تو یہ بڑائی کو بڑائی سے ملانا ہوگا، یہ ایسا ہی ہوگا جیسے مقناطیس کے پازیٹو سائڈ کو پازیٹو سائڈ سے ملایا جائے۔ ایسی حالت میں دونوں ایک دوسرے سے جڑ نہیں سکتے۔ اس کے برعکس جب انسان اپنے اندر سے بڑائی کے احساس کو خالی کرتا ہے اور خالص عجز کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو یہ گویا ایک مقناطیس کے پازیٹو سائڈ کو دوسرے مقناطیس کے نگیٹو سائڈ سے ملانا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں دونوں فوراً ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں۔

غیر ساجد کبر کا سرمایہ لے کر خدائے کبیر سے ملنا چاہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی مل نہیں پاتا۔ ساجد عجز کا سرمایہ لے کر خدائے کبیر سے ملتا ہے، یہی وجہ ہے کہ فوراً دونوں کے درمیان اتصال قائم ہو جاتا ہے۔

۱۸ اپریل ۱۹۸۲

میں نے ایک عرب عالم کا مضمون پڑھا۔ ان کی یہ بات مجھے پسند آئی کہ اختلاف برا نہیں۔ البتہ خلاف برا ہے۔ اختلاف ایک طبیعی امر ہے اور وہ اسلام کے دور اول میں بھی موجود تھا، مگر وہ خلاف تک نہیں پہنچا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ کو بنو قریظہ کی بستیوں کی طرف روانہ کیا تو بتاکید فرمایا کہ تم لوگ بنو قریظہ میں پہنچ کر ہی عصر کی نماز پڑھنا (لا یصلین احد الا فی بنی قریظة)، صحابہ میں سے کچھ لوگوں نے اس حکم کے الفاظ کو لیا اور بنو قریظہ میں پہنچ کر تاخیر کے ساتھ نماز پڑھی۔ کچھ لوگوں نے اس کو معنی پر محمول کیا اور اس کو تیز قدمی (الاسراع لبلوغ الھدف) کے معنی میں لیتے ہوئے راستہ میں نماز پڑھ لی۔ اور رسول اللہ نے دونوں کی تصدیق فرمائی۔

یہ واقعہ (اور اس طرح کے دوسرے واقعات) اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ بعض

امور میں تنوع ایک فطری امر ہے، اس لئے ان میں توحد پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے۔ مگر بعد کے زمانہ میں لوگ (خاص طور پر فقہا) اس حقیقت کو ملحوظ نہ رکھ سکے، اور امت میں بے شمار خرابیاں پیدا ہو گئیں۔

صحابہ اور تابعین تک یہی صورت حال قائم رہی۔ میرے علم کے مطابق عمر بن عبد العزیز اس امت میں آخری قابل ذکر شخص تھے جو اس راز کو جانتے تھے:

قد ذكر ابن القيم في اعلام الموقعين ان سيدنا عمر و ابن مسعود اختلفا في ١٠٠ مسئلة وعدد مؤلفوا كتاب تاريخ التشريع الاسلامي (السايس، والسبكي والبربري) عشرين مسئلة اختلف فيها الصحابة۔ لم يستنكر احد هذا الخلاف۔ انما اعتبره الجميع امراً طبيعياً لا يقطع وداً و لا يفرق صفاً۔ ولهذا ايده عمر بن عبد العزيز فيما يذكر الشاطبي في (الاعتصام) وقال: ما احب ان اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يختلفون۔ لانه لو كان قولاً واحداً لكان الناس في ضيق وانهم ائمة يقتدى بهم۔ فلو اخذ رجل بقول احدهم لكان سنة۔

ابن قیم نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عبد اللہ بن مسعود کے درمیان ایک سو مسائل میں باہم اختلاف تھا۔ تاریخ تشریع اسلامی کے مصنفین نے ۲۰ مسائل شمار کئے ہیں جن میں صحابہ ایک دوسرے سے مختلف رائے رکھتے تھے۔ اس اختلاف کو کسی نے بھی برا نہیں مانا۔ تمام لوگوں نے اس کو طبعی معاملہ سمجھا جس سے نہ باہمی محبت ختم ہوتی اور نہ جماعتی انتشار پیدا ہوتا۔ اسی لئے حضرت عمر بن عبد العزیز نے اس کی تائید فرمائی ہے۔ جیسا کہ شاطبی نے لکھا:، انھوں نے کہا: مجھے یہ پسند نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اختلاف نہ کرتے۔ اس لئے کہ اگر صرف ایک ہی قول ہوتا تو لوگ تنگی میں پڑ جاتے۔ اور صحابہ ہی وہ رہنما لوگ ہیں جن کی پیروی کی جاتی ہے۔ ان کے اختلاف کی وجہ سے یہ ہے کہ آدمی ان کے جس قول کو بھی لے لے وہ سنت ہوگا۔

یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ فرق کو اختلاف کے معنی میں لے لیا جائے۔

۱۹ اپریل ۱۹۸۳

عربی کا ایک مقولہ ہے: مَن تَانّیٰ اَدْرَكَ مَا تَمَنّیٰ (جس نے خوب غور وفکر کیا اس نے اپنی آرزو کو پالیا) مطلب یہ ہے کہ جو شخص کوئی کام اس طرح کرے کہ اس کے لئے سوچنے سمجھنے کا حق اس نے پوری طرح ادا کر دیا ہو تو وہ ضرور اپنے مطلوبہ مقصد میں کامیاب رہے گا۔

موجودہ دنیا میں اقدام کے دو طریقے ہیں۔ ایک، عاجلانہ اقدام۔ دوسرے، منصوبہ بند اقدام۔ عاجلانہ اقدام وہ ہے جو بس وقتی جذبہ کے تحت شروع کر دیا گیا ہو۔ ایسا اقدام ہمیشہ ناکامی پر ختم ہوتا ہے۔ منصوبہ بند اقدام وہ ہے جو اس طرح کیا جائے کہ اس سے پہلے آدمی نے اس کے تمام پہلوؤں پر غور کر لیا ہو۔ وہ اس معاملہ میں واقف کاروں سے مشورہ کرے۔ اس طرح بخوبی طور پر سمجھ کر اور اس کے لئے ضروری تیاری کرکے اقدام کیا جائے۔ ایسا اقدام ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے، خواہ اس کی کامیابی جلد ظاہر ہو یا دیر میں۔

۲۰ اپریل ۱۹۸۳

ایک عام آدمی جب غصہ ہوتا ہے تو وہ اپنے غصہ کو شدید ترین لفظ میں ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی لغت کا آخری لفظ استعمال کرنے سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر غصہ کے وقت ایک ہندستانی، ایک عرب اور ایک یوروپین حسب ذیل الفاظ بولتا ہے:

ہندستانی : حرامی نمبر ایک

عرب : حرامی رقم واحد

یوروپین : Bastard No. one

اس قسم کے تجربات بتاتے ہیں کہ ان الفاظ کا کوئی مشترک مثنیٰ ہر آدمی کے ذہن میں موجود ہے۔ ان الفاظ کو اپنے ذہنی مثنیٰ سے جوڑ کر آدمی سمجھتا ہے کہ وہ جس جذبہ کا اظہار کرنا چاہتا تھا اس کا اظہار اس نے کر دیا۔ اگر ایسا نہ ہو تو غصہ میں بھرا ہوا انسان اپنے اندرونی احساس کی تسکین ان الفاظ میں نہ پا سکے۔

قرآن میں علم اشیا کی تعلیم (البقرہ) کا جو ذکر ہے، اس کا ایک مطلب شاید یہ بھی ہو۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام چیزیں، خواہ وہ صوری ہوں یا معنوی، ان کی معرفت انسان

کے ذہن میں پیشگی طور پر موجود ہے۔ اسی کو غالباً قرآن میں چیزوں کے نام کہا گیا ہے۔ ان ناموں کو کوئی ایک زبان کے لفظ کے ساتھ ہم رشتہ کرکے بولتا ہے اور کوئی دوسری زبان کے لفظ کے ساتھ۔

۲۱ اپریل ۱۹۸۳

ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنے مقام کے مسلمانوں کے بارہ میں شکایت کی کہ ان کی اکثریت بے نمازی ہے۔ اپنے بارہ میں انھوں نے بار بار "الحمدللہ" کہتے ہوئے بتایا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، پابندی کے ساتھ نماز ادا کرتا ہوں۔ ان کے لہجہ میں اپنے نمازی ہونے پر فخر اور بڑائی کا انداز تھا اور دوسروں کے بے نمازی ہونے کا ذکر وہ اس طرح کر رہے تھے جیسے کہ وہ ان کو بالکل حقیر اور کمتر سمجھتے ہوں۔

میں خاموشی سے ان کی تقریر سنتا رہا۔ آخر میں میں نے کہا ــــ سب سے زیادہ بے نمازی ہونا یہ ہے کہ آدمی کو اپنے نمازی ہونے پر فخر ہو۔

۲۲ اپریل ۱۹۸۳

۴۷ ۱۹ میں جب پاکستان بنا تو وہ دو حصوں میں تھا ــــ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان اختلافات شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ ۱ ۷ ۱۹ میں مشرقی پاکستان ٹوٹ کر الگ ملک بن گیا اور اس کا نام "بنگلہ دیش" قرار پایا۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد ہندستان میں اس پر بہت سی کتابیں چھپیں۔ مثلاً :

1. Pakistan Divided   2. Partition After Partition
3. Dismemberment of Pakistan,   4. Emergence of Bagladesh

اس ذیل میں ایک کتاب چھپی۔ یہ کتاب خود تو زیادہ اچھی نہ تھی۔ البتہ اس کا نام بہت بامعنی تھا۔ مصنف نے اس کتاب کا نام رکھا تھا: (Pakistan cut to size)

انگریزی زبان میں size کا لفظ قد، قامت کے معنی میں آتا ہے۔ اسی سے اس کے مختلف معانی بنے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے (this is about the size of it) یعنی یہ صحیح واقعہ ہے، یہ بیان واقعہ کے مطابق ہے۔ اسی سے (cut to size) کا استعمال ہے۔ یعنی

مصنوعی اضافہ کو گھٹا کر کسی چیز کو اس کے واقعی قامت کے بقدر کر دینا۔ پاکستان کی دوبارہ تقسیم کے لئے یہ نام (پاکستان کٹ ٹو سائز) صحیح ترین نام ہے۔ کیوں کہ یہ سراسر مصنوعی تھا کہ ایسا ملک بنایا جائے جس کا ایک حصہ مشرق میں ہو اور دوسرا مغرب میں، اور دونوں کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ ہو۔ پاکستان کی دوبارہ تقسیم نے اس کو اس کے واقعی حجم پر پہنچا دیا۔

مومن یا ایک سچے انسان کو بتانے کے لئے یہ بہترین لفظ ہے۔ مومن یا سچا ربانی انسان (man cut to size) ہوتا ہے۔ یعنی وہ انسان جو اپنے مصنوعی اضافوں کو ختم کر کے اپنی واقعی حیثیت پر آجائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ احتساب خویش واحد چیز ہے جو اس قسم کے سچے انسان کو وجود میں لاتا ہے۔

آدمی جب اپنا محاسب بنتا ہے تو بار بار اس کو یہ احساس ستانے لگتا ہے کہ "میں نے غلطی کی" اسی احساس سے آدمی کے اندر قطع حجم کا عمل جاری ہوتا ہے۔ ہر بار جب آدمی کے اوپر احساس خطا طاری ہوتا ہے تو گویا "پیاز" کا ایک چھلکا اس کے اوپر سے اتر جاتا ہے۔ اس طرح گھٹتے گھٹتے وہ اپنی آخری حد پر آجاتا ہے۔ اس سے پہلے اگر وہ "خدا" بنا ہوا تھا تو اب وہ خالص بندہ بن جاتا ہے۔

۲۳ اپریل ۱۹۸۳

" انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے اخلاق و عمل کے اعتبار سے ایک پرفکٹ (معیاری) انسان بنے۔ مگر موجودہ امتحان کی دنیا میں کسی انسان کے لئے پرفکٹ انسان بننا ممکن نہیں"۔ میں اس سوال پر غور کر رہا تھا کہ میری زبان سے نکلا: موجودہ دنیا میں کبھی کوئی شخص پرفکٹ انسان نہیں بن سکتا۔ پرفکٹ صرف وہ ہے جو اپنے امپرفکٹ ہونے کو جان لے۔

۲۴ اپریل ۱۹۸۳

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ: من نوقش فقد هلك (جس کی جانچ کی گئی وہ ہلاک ہوا) یہ بات موجودہ زمانہ میں "پاسپورٹ" اور "کسٹم" کی مثال سے بخوبی سمجھ میں آتی ہے۔ پاسپورٹ کی حیثیت ایمان کی ہے، اور کسٹم کی حیثیت آخرت کے حساب و کتاب کی۔ ہم کو ایمان تو حاصل ہے، مگر نجات کے لئے ضروری ہے کہ آدمی حساب کے مرحلہ میں

کامیاب ہوسکے۔ گویا پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہے۔ مگر کسٹم کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔ کسٹم پر اگر خدا نے کہہ دیا کہ تم گرین چینل سے نکل جاؤ، تب تو بچ جائیں گے۔ لیکن اگر سامان کھول کر دیکھا گیا تو اس کے بعد پھر بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

۲۵ اپریل ۱۹۸۳

اسلام، موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا فخر ہے، وہ ان کا ہدایت نامہ نہیں ـــــــ اسی ایک فقرہ میں موجودہ مسلمانوں کی پوری کہانی چھپی ہوئی ہے۔

میں ایک سوال کے بارہ میں برسوں تک سوچتا رہا ہوں۔ وہ یہ کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان جس قسم کی باتوں پر مشتعل ہوکر دوسری قوموں سے لڑ جاتے ہیں، اس قسم کی باتیں مزید شدت کے ساتھ دور اول میں بار بار پیش آئیں۔ مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب مشتعل ہوکر دوسروں سے لڑنے لگیں۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ آخر کار جس بات پر میرا دل مطمئن ہوا وہ یہ تھا کہ اس فرق کا سبب دونوں کے ذہنوں کا فرق ہے۔ رسول اللہؐ اور آپ کے اصحاب کے لئے اسلام کی حیثیت خدا کی ہدایت اور رہنمائی کی تھی، اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لئے اسلام قومی فخر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ یہی وہ خاص فرق ہے جس نے دونوں کے عمل میں فرق پیدا کیا ہے۔

فخر کی نفسیات ہو تو اسلام آدمی کے لئے پرسٹیج کا عنوان بن جائے گا۔ وہ اسلام کو اس نظر سے دیکھے گا کہ دوسرے لوگ اس کی ناموس پر حملہ نہ کریں۔ اس کے برعکس ہدایت نامہ سمجھنے کی نفسیات ہو تو آدمی اسلام کو رہنمائی کی چیز سمجھے گا۔ اول الذکر حالت میں اسلام کے عدم احترام پر آدمی کے جذبات بھڑکیں گے، اور ثانی الذکر حالت میں اسلام کی عدم اطاعت پر۔

۲۶ اپریل ۱۹۸۳

کسی شخص کا قول ہے کہ جو لوگ تاریخ کو بھلا دیں، وہ دوبارہ اس کے اعادہ کی غلطی کرتے ہیں:

Those who forget history are condemned to repeat it.

اپنے ماضی کا تنقیدی جائزہ لینا انتہائی ضروری ہے۔ ماضی کا تنقیدی جائزہ نہ لینا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی اپنی غلطیوں کو دہراتا رہے، وہ کبھی اپنی غلطیوں سے باہر نہ آسکے۔

۲۷ اپریل ۱۹۸۳

قال زیاد بن ابی سفیان : لیس العاقل الذی اذا وقع فی الامر احتال له ، ولکن العاقل یحتال للامر حتی لا یقع فیہ (زیاد بن ابی سفیان نے کہا : عقلمند آدمی وہ نہیں ہے جو کسی معاملہ میں مبتلا ہو جائے تو اس کی تدبیر کرے۔ بلکہ عقلمند آدمی وہ ہے جو معاملہ کی تدبیر کرے تاکہ وہ اس میں مبتلا نہ ہو)

۲۸ اپریل ۱۹۸۳

تربیت کا سب سے اہم ذریعہ یہ ہے کہ آدمی واقعات میں آیات کو دیکھنے لگے —— یہ بات مختلف شکلوں میں پورے قرآن میں موجود ہے، اور سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں نہایت واضح طور پر بتائی گئی ہے۔

۲۹ اپریل ۱۹۸۳

جاش بلنگ (Josh Billing) نے کہا کہ —— تجربہ ہماری عقل کو بڑھاتا ہے، مگر وہ ہماری غلطیوں کو کم نہیں کرتا :

Experience increases our wisdom, but doesn't reduce our follies.

۳۰ اپریل ۱۹۸۳

غالباً میر تقی میر کا شعر ہے :

صبح گزری شام ہونے آئی میر   تو نہ چیتا اور بہت دن کم رہا

یہ شعر بظاہر بہت آسان ہے، اس میں کوئی مشکل لفظ نہیں۔ مگر اس کو سمجھنے کے لئے صرف ان الفاظ کے معانی جاننا کافی نہیں جو شعر کے اندر موجود ہیں۔ اسی کے ساتھ کچھ اور باتیں جاننا بھی لازمی طور پر ضروری ہیں۔ اگر آدمی ان دوسری باتوں کو نہ جانے تو تمام تر سادگی کے باوجود وہ شعر کو سمجھ نہ سکے گا۔

پہلی بات یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ تمثیل ہے۔ یعنی اس میں سادہ طور پر صرف صبح وشام کا قصہ نہیں بیان کیا گیا ہے بلکہ صبح وشام کی مثال میں انسانی زندگی کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ دوسری بات یہ جاننا ضروری ہے کہ زندگی کو کسی اعلیٰ تر مقصد میں صرف کرنا چاہئے۔ اگر آدمی نے ایسا نہیں کیا تو عمر کا مختصر حصہ بہت جلد تمام ہو جائے گا اور آدمی کے پاس افسوس کے سوا کچھ اور نہ رہے گا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک بات کو سمجھنے کے لئے کچھ اور باتوں کا جاننا ہمیشہ ضروری ہوتا ہے۔ آدمی کا ذہن اگر ان مزید معلومات سے خالی ہو تو وہ کسی بات کو نہیں سمجھ سکتا، خواہ وہ کتنے ہی آسان الفاظ میں کہی گئی ہو۔

یکم مئی ۱۹۸۳

قيل لعمرو بن عبيد رحمه الله ما البلاغة۔ قال ما بلغك الجنة وعدل بك عن النار (عمرو بن عبید سے پوچھا گیا کہ بلاغت کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ جو تم کو جنت میں پہنچائے اور جہنم سے تم کو دور کر دے)

حضرت عمرو بن عبید سے ایک ادبی سوال کیا گیا تھا، مگر انھوں نے اس کا ایک دینی جواب دیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ "بلاغت" کے ادبی مفہوم سے ناواقف تھے۔ اس سوال میں مجیب کا زور دراصل سوال پر نہیں بلکہ سائل پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم لوگ ادبی مسائل میں الجھے ہوئے ہو، حالانکہ تمھیں جنت اور جہنم کے مسائل کی فکر کرنی چاہئے۔

۲ مئی ۱۹۸۳

سوامی ویویکانند (۱۹۰۲ - ۱۸۶۳) غیر معمولی صلاحیت کے آدمی تھے۔ کلکتہ میں بی اے کرنے کے بعد انھیں سچائی کی تلاش ہوئی۔ وہ رابندر ناتھ ٹیگور سے ملے اور ان سے پوچھا کہ "کیا آپ نے بھگوان کو دیکھا ہے"۔ ٹیگور نے کہا کہ نہیں۔ اس کے بعد وہ دکشنیشور کے مندر میں گئے اور وہاں شری رام کرشن سے ملے۔ ان سے بھی انھوں نے وہی سوال کیا۔ شری رام کرشن نے مثبت جواب دیتے ہوئے انھیں بتایا کہ "انسانوں میں خدا کو جلوہ گر دیکھ کر سب کی سیوا کرو، ہر جاندار کو بھگوان کا روپ مان کر اس کی سیوا کرنا ہی سچا دھرم ہے"۔

نوجوان ویویکانند میں جو جذبہ ابھرا تھا، وہ ایک فطری جذبہ تھا۔ وہ خدائے واحد کو پانے کا

جذبہ تھا، مگران کے گرو نے ان کے جذبہ کو پھیر دیا۔ ویویکانند توحید کی تلاش میں تھے۔ گرو نے اس کے جواب میں ان کو "ہمہ اوست" دے دیا۔ ویویکانند کی فطرت نہ دکھائی دینے والے خدا کو پانا چاہتی تھی، گرو نے دکھائی دینے والی چیزوں کو خدا بنا کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ خدا کا مسافر خدا کی مخلوق میں اٹک کر رہ گیا۔

۳ مئی ۱۹۸۳

حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیدوا العلم بالکتاب (علم کو لکھ کر محفوظ کرو) اس طرح کی اور بہت سی حدیثیں ہیں جو علم کے لئے کتابت کی اہمیت کو بتاتی ہیں۔ ایسی حالت میں سوال ہوتا ہے کہ اُس حدیث کا کیا مطلب ہے جو ابوسعید خدری کے واسطے سے صحیح مسلم میں آئی ہے، جس کے مطابق آپ نے فرمایا کہ مجھ سے نہ لکھو، اور جس نے مجھ سے قرآن کے علاوہ لکھا ہو وہ اس کو مٹا دے۔ اور میری بات کو بیان کرو، اس میں کوئی ہرج نہیں (لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحه وحدثوا عنی ولا حرج)

اس دوسری حدیث کی تشریح میں کئی قول نقل کئے گئے ہیں۔ میرے نزدیک صحیح قول یہ ہے کہ یہ ممانعت مطلق نہ تھی۔ بلکہ آپ نے ایک ہی مجموعہ میں قرآن اور حدیث دونوں کو لکھنے سے منع فرمایا تاکہ دونوں مل نہ جائیں، اور قاری دونوں کے ایک ساتھ ہونے کی وجہ سے مشتبہ نہ ہو جائے (قیل انما نهی عن کتابة الحدیث مع القرآن فی صحیفة واحدة لئلا یختلط فیشتبه علی القاری فی صحیفة واحدة)

۴ مئی ۱۹۸۳

ایک صاحب سے میں نے تبلیغی جماعت کے مشن اور الرسالہ کے مشن کے فرق کو بتاتے ہوئے کہا کہ تبلیغ والے فضیلتِ اعمال کو بتاتے ہیں اور ہم حقیقتِ اعمال کو بتاتے ہیں۔

۵ مئی ۱۹۸۳

چونکہ حدیث کی زبان عربی ہوتی ہے اور عرب اقوال کی زبان بھی عربی ہوتی ہے، اس مشابہت کی وجہ سے بہت سے عرب اقوال عام لوگوں میں اس طرح مشہور ہو گئے ہیں جیسے کہ وہ

حدیث رسول ہوں۔ مثال کے طور پر حسب ذیل مقولہ:

اِتَّقِ شَرَّ مَن اَحسَنتَ اِلَیہ — اس کے شر سے بچو جس پر تم نے احسان کیا ہے۔

یہ مقولہ بذات خود بہت بامعنی ہے، وہ ایک حکیمانہ مقولہ ہے، مگر وہ ایک عربی مقولہ ہے، وہ حدیث رسول نہیں ہے۔ اسی طرح اور بہت سے اقوال۔

۶ مئی ۱۹۸۳

امام ابوالحسن الاشعری (۹۳۵ - ۸۷۳) بصرہ میں پیدا ہوئے اور بغداد میں وفات پائی۔ وہ مشہور معتزلی الجبائی (م ۹۱۵ء) کے شاگرد تھے اور اسلام کی عقلی تشریح کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے اچانک ایک روز معتزلہ کے گروہ کو چھوڑ دیا اور اعتزال کی تردید اور اسلام کی نقلی تشریح کے امام بن گئے۔

امام ابوالحسن الاشعری کا یہ واقعہ عام مسلمانوں کے نزدیک ناحق کو چھوڑنے اور حق کو اختیار کرنے کا واقعہ ہے۔ اس بنا پر مسلمانوں کے درمیان ان کا ایک خاص احترام پایا جاتا ہے۔ مگر اسی واقعہ کو ایک مستشرق دوسری نظر سے دیکھتا ہے۔ اس نے الاشعری کے ڈرامائی طور پر ترک تعلق (Dramatic renunciation) کا ذکر اس طرح کیا ہے:

" الاشعری ابتداءً عقلی حلقہ میں شامل تھے۔ مگر انھوں نے دیکھا کہ ان کو عقلی علما کے درمیان ممتاز مقام حاصل کرنے کا موقع نہیں مل رہا ہے اور نہ بظاہر مل سکتا ہے تو انھوں نے شہرت کی خاطر رجعت پسند مکتب کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ واقعہ بصرہ کی جامع مسجد میں جمعہ کے دن ہوا۔ وہ اپنے شاگردوں کو درس دیتے ہوئے اچانک اٹھ کھڑے ہوئے اور مجمع سے باواز بلند مخاطب ہوتے ہوئے کہا: جو لوگ مجھے جانتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ میں کون ہوں۔ جو لوگ نہیں جانتے وہ سُن لیں کہ میں علی بن اسماعیل الاشعری ہوں۔ میرا عقیدہ تھا کہ قرآن مخلوق ہے، انسان کی آنکھ خدا کو نہ دیکھ پائے گی، اور ہم خود اپنے افعال بد کے موجد اور مختار ہیں۔ اب میں حق کی طرف واپس آتا ہوں، ان عقائد سے توبہ کرتا ہوں اور معتزلہ کی تردید اور ان کی غلط بیانیوں کی قلعی کھولنے کا بیڑا اٹھاتا ہوں۔ الاشعری ایک ایک کرکے اپنے سابق عقیدوں سے توبہ کرتے رہے اور ایک کے بعد ایک اسی کے ساتھ اپنے کپڑے پھاڑ کر پھینکتے رہے اور ہر بار یہ اعلان کرتے رہے کہ میں اس

عقیدہ کو یوں ترک کرتا ہوں جیسے اس جامہ کو پھاڑ کر پھینکتا ہوں۔ سب سے پہلے انھوں نے اپنی پگڑی اتار پھینکی۔ اس کے بعد جبہ اور پھر دوسرے کپڑے۔ بصرہ کے زود اعتقاد لوگوں پر اس کا زبردست اثر ہوا۔ الاشعری کی شہرت اتنی تیزی سے پھیلی کہ بہت جلد ان کو امام وقت مان لیا گیا۔ ابن خلکان نے ان کو دین حنیف کا بہت بڑا حامی لکھا ہے۔"

۷ مئی ۱۹۸۳

لیبیا میں ڈکٹیٹرانہ نظام ہے۔ وہاں حکومت پر تنقید کرنے کی اجازت نہیں۔ ۱۹۷۶ میں جب پہلی بار طرابلس گیا تو میں نے دیکھا کہ وہاں دیواروں پر اس طرح کے فقرے لکھے ہوئے ہیں:

نحن نضرب بالحديد اذا مست الثورة

لیبیا میں جو شخص ناقدانہ ذہن رکھتا ہو وہ فوراً جان لیتا ہے کہ موجودہ نظام حکومت کے تحت وہ یہاں نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ ایسے تمام لیبی اپنے ملک کو چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ ان میں جو تعلیم یافتہ (ڈاکٹر، انجینئر وغیرہ) تھے، انھوں نے باہر ملازمت کر لی۔ دوسرے لوگ باہر کے ملکوں میں تجارت کرنے لگے۔

اس قسم کے لیبیوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ان کو لیبیا میں الکلابُ الضالّة (گم راہ کتے) کہا جاتا ہے۔ بظاہر یہ بہت ناشائستہ بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر اسی ناشائستہ فعل میں آجکل کے تمام مسلمان مبتلا ہیں۔ وہ شخصیتیں جن کو مسلمانوں نے یا ان کے کسی حلقے نے "اکابر" کا درجہ دے رکھا ہے، اگر کوئی شخص ان کے اوپر تنقید کرے تو اس کو اسی نوعیت کے الفاظ سے نوازا جاتا ہے، اپنے ناقدین کے حق میں کوئی شخص بھی انصاف کرنے کے لئے تیار نہیں۔

۸ مئی ۱۹۸۳

ایک عربی جریدہ میں ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان تھا: المنكرون لعذاب القبر ونعيمه وشبهتهم والرد عليهم (قبر کے عذاب اور اس کی نعمت کے منکرین اور ان کا شبہہ اور ان کی تردید)

اس میں بتایا گیا تھا کہ ملاحدہ اور زنادقہ عذاب قبر اور نعیم قبر کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے قبروں کو کھول کر دیکھا تو ان میں نہ عذاب تھا اور نہ نعمت۔ ان کہنا ہے کہ ایسی تمام حدیثیں غلط ہیں

جن میں بتایا گیا ہے کہ قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے، یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے (القبر روضة من رياض الجنة او حفرة من حفر النار)

مضمون نگار نے مختلف انداز سے اس ملحدانہ نقطۂ نظر کی تردید کی ہے۔ مثلاً یہ کہ اللہ کی قدرت بہت بڑی ہے۔ وہ قادر ہے کہ ایسے واقعات کرے جن کو دیکھنے کے لئے انسان کی آنکھیں معذور ہوں۔ اور یہ کہ انسان کمزور ہے، وہ اس طرح کی چیزوں کو دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ (العبد اضعف بصرا او سمعا ان يثبت لمشاهدة عذاب القبر)

میرے نزدیک یہ دونوں باتیں غیر ضروری ہیں۔ اصل یہ ہے کہ امور غیب کے بارہ میں اس قسم کی جو حدیثیں ہیں وہ سب تمثیلی زبان (Symbolic language) میں ہیں۔ ان میں اصل حقیقت واقعہ بیان نہیں کی گئی ہے بلکہ اصل حقیقت واقعہ کو معروف تمثیل کے روپ میں واضح کیا گیا ہے۔

۹ مئی ۱۹۸۳

ایک صاحب اپنا بال ہمیشہ خود کاٹتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی تو اس کا بال بھی انھوں نے خود کاٹنا شروع کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں نہ اپنا سر حجام کے سامنے جھکاؤں گا اور نہ اپنی لڑکی کا سر۔

مگر جب لڑکی چار سال کی ہوئی تو اب اس کی تعلیم کا مسئلہ تھا۔ انھوں نے چاہا کہ اس کو انگلش اسکول میں داخل کریں۔ معیاری انگلش اسکولوں میں داخلہ کا قاعدہ ہے کہ وہ بچوں کا ٹسٹ لیتے ہیں تو اس کی ہر چیز کو جانچتے ہیں۔ بچی کے والد نے سوچا کہ اگر میں خود بال کاٹوں تو وہ اچھے نہیں ہوں گے اور اندیشہ ہے کہ صرف بال کے بے ڈھنگے پن کی وجہ سے بچی کا داخلہ نہ ہو سکے۔ چنانچہ انھوں نے یہ کیا کہ ٹسٹ کے لئے بچی کو لے جانے سے پہلے اس کو شہر کے "سیلون" میں لے گئے اور وہاں بچی کے بال کو جدید معیار کے مطابق درست کرایا۔

آدمی کا یہ حال ہے کہ جب تک اس کا ذاتی انٹرسٹ خطرہ میں نہ پڑے وہ غیر سنجیدہ باتیں کرتا ہے۔ مگر ذاتی انٹرسٹ کے زد میں آتے ہی وہ حقیقت پسند بن جاتا ہے۔ یہ بلاشبہ انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔

۱۰ مئی ۱۹۸۳

سید امیر علی (۱۹۲۸-۱۸۴۹) نے اپنی کتاب روح اسلام (.The Spirit of Islam) میں کسی مستشرق کا قول نقل کیا ہے کہ ایک منحوس گھڑی میں صلیب نے غرناطہ کے میناروں پر ہلال کی جگہ لے لی:

In an ill-omened hour the Cross supplanted the
Crescent on the towers of Granada (p. 399).

یقیناً وہ ایک منحوس گھڑی تھی جب کہ تاریخ یورپ کا یہ واقعہ ہوا۔ مسلمانوں نے پسماندہ اسپین کو علم وفن کا مرکز بنادیا تھا۔ مگر عیسائیوں کے مجنونانہ تعصب کی وجہ سے مسلمانوں کو اسپین سے نکلنا پڑا اور نہ صرف اسپین بلکہ سارے یورپ میں ترقی کی رفتار سیکڑوں سال پیچھے ہوگئی۔

فرانس کے محاذ پر عربوں کی ناکامی نے دنیا کی ترقی کو صدیوں کے لئے روک دیا۔ مسلمانوں کی نااتفاقی کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرینک (Franks) کے بادشاہ چارلس مارٹل (Charles Martel) نے تورس (Tours) کے مقام پر ۷۳۲ء میں مسلمانوں کو شکست دی۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی یورپ کی طرف پیش قدمی رک گئی۔

اسلام اسپین کے راستے سے سائنسی ترقی کا پیغام لے کر یورپ میں داخل ہو رہا تھا۔ مگر جب فرانس کی سرحد پر مسلمانوں کی شکست کے بعد یورپ عیسائیت کے حوالے ہوگیا تو سائنسی کھوج کرنے والوں کو بھیانک رکاوٹوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اطالوی عالم برونو (۱۶۰۰-۱۵۴۸) کو فلکیات میں جدید نظریات پیش کرنے کے جرم میں زندہ جلادیا گیا۔ سرویتس (۱۵۵۳-۱۵۱۱) اسپین کا ایک طبیعیاتی عالم تھا، اس پر الحاد کا الزام لگاکر اس کو نذر آتش کر دیا گیا۔ انکوئزیشن (The Inquisition) نے اس طرح ہزاروں لوگوں کو صرف اس جرم میں ہولناک سزائیں دیں کہ وہ علم کی دنیا میں جدید تحقیقات کر رہے ہیں۔

اسلام کے زیر اثر سائنس ترقی کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ مگر عیسائیت کے زیر اثر صدیوں تک کے لئے علمی ترقی ٹھپ ہو کر رہ گئی۔

۱۱ مئی ۱۹۸۳

ڈائری کی بہت سی باتیں جو سوال و جواب یا گفتگو کے انداز میں نہیں لکھی گئی ہیں بلکہ مضمون کے انداز میں ہیں، وہ حقیقۃً کسی سے گفتگو کا خلاصہ ہیں جس کو مضمون کی صورت میں درج کر دیا گیا ہے۔ اس کو مکالمہ کی بدلی ہوئی شکل سمجھنا چاہئے۔

۱۲ مئی ۱۹۸۳

فی الصحیحین عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم سُئل عن اولاد المشرکین فقال: اللہ اعلم بما کانوا عاملین۔ وفی صحیح ابی حاتم ابن حبان من حدیث جریر بن حازم قال: سمعت ابا رجاء یقول وھو علی المنبر، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا یزال امر ھذہ الامۃ قواماً (او مقارباً) ما لم یتکلموا فی الولدان والقدر۔ قال ابو حاتم: الولدان اراد بہ اطفال المشرکین (طریق الھجرتین، صفحہ ۳۸۷)

بخاری و مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اہلِ شرک کی اولاد کے بارہ میں پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ ان کے عمل کے بارہ میں زیادہ جانتا ہے اور صحیح ابن حبان میں حضرت جریر بن حازم سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو رجاء کو منبر پر کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس امت کا معاملہ درست رہے گا جب تک کہ وہ اولاد اور تقدیر کے بارہ میں کلام نہ کریں۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ اولاد سے مراد مشرکین کے لڑکے ہیں۔

ابن قیم الجوزیہ (۷۵۱-۶۹۱ھ) نے اپنی کتاب طریق الہجرتین میں مذکورہ روایت نقل کی ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے لکھا ہے کہ اطفال مشرکین کے بارہ میں علماء کے آٹھ اقوال (ثمانیۃ مذاہب) ہیں۔ (الوقف فیھم، انھم فی النار، انھم فی الجنۃ، انھم فی منزلۃ بین المنزلتین، انھم تحت مشیئۃ اللہ، انھم خدم اھل الجنۃ، ان حکمھم حکم آبائھم، انھم یمتحنون فی عرصات القیامۃ)

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان بعد کے زمانہ میں کس طرح غیر

ضروری بحثوں میں مبتلا ہو گئے۔ حتی کہ جس بحث میں انھیں پڑنے سے منع کیا گیا تھا، اس میں بحث کرکے آٹھ مختلف رائیں بنا ڈالیں۔ اسلامی طریقہ یہ ہے کہ صرف ان امور میں بحث کی جائے جو حقیقی عملی ضرورت ہو۔ جو چیز صرف ذہنی بحث کا درجہ رکھتی ہو، اس سے کامل پرہیز کیا جائے۔ مگر جب قوموں پر زوال آتا ہے تو اس کے افراد ذہنی بحث اور عملی ضرورت کا فرق نہیں سمجھ پاتے۔ وہ ایسی بحثوں میں پڑ جاتے ہیں جن میں الجھنا وقت کی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

۱۳ مئی ۱۹۸۳

ذکر کا مطلب یاد ہے۔ ذکر اللہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے اوپر عظمت و جلال کا اتنا غلبہ ہو کہ بار بار اس کی یاد آتی رہے اور مختلف شکلوں میں اس کا اظہار ہوتا رہے۔ مگر کچھ لوگوں نے ذکر کو تکرار لفظ کے معنی میں لے لیا۔ اس کے نتیجہ میں بہت سی غلطیاں پیدا ہو گئیں۔

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ کچھ لوگوں نے کہا کہ اسم ظاہر کے مقابلہ میں اسم مضمر سے ذکر کرنا (مثلاً ہو، ہو، کہنا) اس سے بھی زیادہ افضل ہے۔ قال بعضهم ان الذكر بالاسم المفرد وهو الله، الله افضل من الذكر بالجملة المركبة كقوله سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اكبر۔ وبالغ بعضهم في ذالك حتى قال الذكر بالاسم المضمر افضل من الذكر بالاسم الظاهر، فالذكر بقوله هُو، هُو افضل من الذكر بقولهم الله، الله (طريق الهجرتين، لابن قيم، صفحہ ۳۳۹)

کیسی کیسی بدعتیں ہیں جو بعد کے لوگوں نے دین میں نکالیں۔

۱۴ مئی ۱۹۸۳

نجران (یمن) کا علاقہ خلیفۂ اول ابو بکر صدیق کے زمانہ میں فتح ہوا۔ اس وقت اسلامی فوج کے سردار حضرت خالد بن ولید تھے۔ اس وقت نجران میں عیسائیوں کی بڑی تعداد آباد تھی۔ حضرت خالد نے عیسائیوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا، اس کو قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں نقل کیا ہے۔ اس میں یہ الفاظ بھی شامل ہیں:

لا يهدم لهم بيعة ولا كنيسة ولا يمنعون من ضرب النواقيس ولا من اخراج الصلبان في يوم عيدهم (ان کا کوئی عبادت خانہ اور کلیسا گرایا نہیں جائے گا۔ اور وہ ناقوس

۵۸۶ ق م میں بڑے لشکر کے ساتھ یروشلم میں داخل ہوا اور یہود کے مقدس شہر کو بالکل برباد کر دیا۔ ان حملوں میں اس نے بے شمار یہودیوں کو قتل کیا۔ بے شمار یہودیوں کو غلام بنا کر اپنے ملک (بابل) لے گیا اور یہود کے مقدس عبادت خانہ کو مسمار کر دیا۔

یہود بطور خود بخت نصر کی کارروائی کو سراسر ظلم قرار دیتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ ہمارے بندے تھے جن کو ہم نے تمہاری طرف بھیجا۔ گویا یہود کے نزدیک یہ ایک ظالمانہ فعل تھا، مگر قرآن کے مطابق ایک خدائی آپریشن۔

۱۷ مئی ۱۹۸۳

ایک صاحب نے کہا کہ میں نے آپ کا فلاں مضمون پڑھا۔ مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے کو مجدد ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کیا مضمون میں ایسا لکھا ہے یا آپ کو خود ایسا محسوس ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مضمون میں توصاف طور پر ایسا لکھا ہوا نہیں ہے، مگر مضمون کو پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا۔

میں نے کہا کہ جو بات میں نے مضمون میں لکھی ہے، اس کا جواب دینے کا ذمہ دار میں ہوں۔ آپ متعین سوال کریں تو میں اس کی وضاحت کروں گا۔ باقی جو بات میں نے نہیں لکھی ہے، آپ نے بطور خود محسوس فرمائی ہے، اس کا معاملہ اللہ کے ذمہ ہے جو عالم الغیب ہے۔ آپ قیامت کے دن اس کی بابت اللہ سے پوچھ لیجئے گا۔

۱۸ مئی ۱۹۸۳

ایک حقیقی دلیل اس دنیا میں خدا کی نمائندہ ہے۔ جو شخص دلیل کے آگے نہ جھکے، وہ خدا کے آگے نہیں جھکا۔ ایسا شخص آخرت میں اس حال میں حاضر ہوگا کہ وہاں وہ اپنا نام خدا کو نہ ماننے والوں کی فہرست میں لکھا ہوا پائے گا، خواہ دنیا میں وہ اپنا نام خدا کو ماننے والوں کی فہرست میں لکھائے ہوئے ہو۔

۱۹ مئی ۱۹۸۳

صبح کو فجر سے پہلے نیند کھلی۔ ابھی میں بستر پر تھا اور آنکھ بند کئے ہوئے تھا کہ اچانک خدا کا ایک کرشمہ یاد آیا اور میں حیرت میں ڈوب گیا۔

آنکھ کا معاملہ یہ ہے کہ اگر آپ اس کو بند کر لیں تب بھی وہ نارمل حالت میں محسوس ہوتی ہے۔ اور اگر کھلا رکھیں تب بھی نارمل حالت میں۔ دونوں میں سے کسی حالت میں بھی کسی قسم کا بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔ جب کہ منھ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ منھ کی نارمل حالت یہ ہے کہ اس کو بند رکھا جائے۔ اگر آپ منھ کو کھولیں اور اس کو دیر تک اسی حالت میں رکھیں تو سخت زحمت محسوس ہوگی اور جی چاہے گا کہ اس کو بند کر لیا جائے۔

ایک ہی جسم میں دو اعضا کے بارہ میں دو الگ الگ اصول ہونا بے حد حیرت ناک ہے۔ یہ خدا کی منصوبہ بندی کے کمال کو بتاتا ہے۔ مثلاً اگر اللہ تعالیٰ نے آنکھ کا اصول بھی وہی رکھا ہوتا جو منھ کا اصول ہے تو عملی طور پر ہم کو سخت دشواری پیش آتی۔

خدا کی ان گنت صفتیں ہیں۔ انھیں میں سے ایک صفت یہ ہے کہ منصوبۂ تخلیق کے تمام امکانی پہلوؤں کو وہ پیشگی طور پر سوچ سکا۔ انسان ایک مشین یا ایک مکان بناتا ہے تو عملی تجربہ کے بعد اس پر کھلتا ہے کہ فلاں پہلو کی رعایت وہ نہ کر سکا۔ مگر خدا نے کسی بھی تجربہ کے بغیر پیشگی طور پر تمام ممکن پہلوؤں کو اس طرح جان لیا کہ ایک بار تخلیق کر دینے کے بعد پھر اسے کبھی ترمیم اور نظرثانی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

۲۰ مئی ۱۹۸۳

گھوڑا جب سڑک پر دوڑتا ہے تو پختہ زمین پر اس کی ٹاپوں کے ٹکراؤ سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔ یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جو بتاتی ہے کہ دو چیزوں کے ٹکرانے سے نئی نئی چیزوں کا ظہور ہوتا ہے۔ اگر ٹکراؤ ختم ہو جائے تو نئی چیزوں کا ظہور بھی نہ ہو سکے۔

۲۱ مئی ۱۹۸۳

ایک عربی کتاب میں خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کا یہ واقعہ نظر سے گزرا: مر الفاروق رضی اللہ عنہ ببنیان عال۔ فقال لمن هذا۔ قیل لعامل فلان۔ فقال ابت الدراهم الا ان تخرج اعناقها۔ ثم استدعاه فحاسبه (حضرت عمر فاروق ایک بار ایک اونچی عمارت کے پاس سے گزرے۔ آپ نے اس کو دیکھ کر پوچھا کہ یہ عمارت کس کی ہے۔ بتایا گیا کہ آپ کے فلاں عامل کی ہے۔ حضرت عمر نے کہا کہ درہم ضرور اپنی گردنیں نکال کر رہتے ہیں۔

بچانے سے روکے نہیں جائیں گے۔ اور نہ انھیں اپنے تیوہاروں کے دن صلیب نکالنے سے منع کیا جائے گا)

اس معاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے مذاہب کے معاملہ میں اسلام کا مزاج کیا ہے۔ مگر ہندستان کے مسلمانوں کو اسلام کے اس مزاج کی کوئی خبر نہیں۔ وہ بے طاقت ہوتے ہوئے وہ کام کرنا چاہتے ہیں جو طاقت کی حالت میں بھی دور اول کے مسلمانوں نے نہیں کیا۔

۱۵ مئی ۱۹۸۳

ہلاکو (۱۲۶۵ - ۱۲۱۷) چنگیز خاں کا پوتا تھا۔ ہلاکو نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کو تباہ کیا اور آخری عباسی خلیفہ مستعصم کو قتل کیا۔ اس نے اسلامی دنیا کو جتنا نقصان پہنچایا، اتنا کسی اور شخص نے کبھی نہیں پہنچایا۔ اسی خونیں واقعہ پر شیخ سعدی نے کہا تھا:

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں   بر زوال ملک مستعصم امیرالمومنیں

اسی ہلاکو کا پرپوتا غازان خاں تھا۔ وہ نہ صرف ایک ظالم ترین انسان کی نسل سے تعلق رکھتا تھا بلکہ خود اس کی تربیت بدھسٹ کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت کے اعتبار سے وہ بدھ ازم کا ایک فرد تھا۔ مگر یہ غازان خاں ۱۲۹۵ء میں اس حال میں تخت سلطنت پر بیٹھا کہ وہ اسلام قبول کر چکا تھا۔ اس نے اپنی بقیہ زندگی اسلام کے پرجوش خادم کی حیثیت سے گزاری۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظالم بھی کسی وقت دوست بن جاتے ہیں۔ اور اسی طرح تعلیم و تربیت پر دوسرے عوامل فائق تر ثابت ہوتے ہیں۔

۱۶ مئی ۱۹۸۳

قرآن میں یہود کے تذکرہ کے ذیل میں ارشاد ہوا ہے: اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں بتا دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین (شام) میں خرابی کروگے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ پھر جب ان میں سے پہلا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے بندے بھیجے، نہایت زور والے۔ وہ گھروں میں گھس پڑے اور وعدہ پورا ہو کر رہا۔ (الاسراء ۴-۵)

یہاں اپنے بندے (عباداً لنا) سے مراد نبوخذ نصر (Nebuchadnezzar II) اور اس کی فوج ہے۔ اس نے پہلی بار ۵۹ ق م میں یہودی سلطنت پر حملہ کیا۔ دوسری بار وہ

اس کے بعد آپ نے اس عامل کو بلایا اور اس سے حساب لیا)

حضرت عمر فاروق کا یہ قول علم و دانش کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ علم کی یہ قسم کسی درسگاہ سے حاصل نہیں ہوتی۔ یہ وہ علم ہے جو تقویٰ کے ذریعہ کسی کے اندر پیدا ہوتا ہے۔

۲۲ مئی ۱۹۸۳

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ بے تکان بول رہے تھے۔ ان کا کلام زیادہ تر بے جوڑ اور غیر متعلق باتوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب وہ کافی دیر تک بول چکے تو میں نے نرمی سے کہا: آدمی کو چاہئے کہ بولنا جانے، اور اگر بولنا نہ جانتا ہو تو چپ رہنا جانے۔

پھر میں نے انھیں حدیث سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ وہ بولے تو بھلی بات بولے ورنہ چپ رہے) من كان يومن بالله واليوم الآخر فليقل خيرا او ليصمت)۔ یہی بات ایک مغربی مفکر نے اپنے الفاظ میں اس طرح کہی کہ یہ بہت بڑی بدبختی ہے کہ آدمی کے پاس نہ اتنی سمجھ ہو کہ وہ بات کر سکے اور نہ اتنی قوت فیصلہ ہو کہ وہ چپ رہے:

It is a great misfortune neither to have enough wit to talk well
nor enough judgement to be silent.

Jean De La Brupere

۲۳ مئی ۱۹۸۳

ایک صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ حدیث کو ماننا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ دیکھئے، ایک حدیث یہ بتائی جاتی ہے کہ الحرب خُدعة (جنگ دھوکا ہے) کیا یہ پیغمبر خدا کا قول ہو سکتا ہے۔ کیا پیغمبر لوگوں کو یہ تعلیم دے سکتا ہے کہ جنگ کرو اور جنگ میں دھوکا دو۔ اس طرح تو الکشن کی دھاندلی (rigging) عین جائز ہو جائے گی۔

میں نے کہا کہ الحرب خدعة دراصل الدفاع خدعة کے معنی میں ہے۔ یہ جنگ بمعنی جارحیت کا اصول نہیں ہے بلکہ جنگ بمعنی بچاؤ کا اصول ہے۔ الکشن میں تو آدمی خود سے کودتا ہے، وہ چاہے تو نہ کودے۔ مگر بچاؤ یا دفاع اس لڑائی کا نام ہے جب یک طرفہ طور پر کوئی دوسرا شخص اس کے اوپر حملہ آور ہو اور اس کو ایسے حالات میں مبتلا کر دے کہ وہ اپنے بچاؤ کی خاطر

لڑنے پر مجبور ہو جائے۔ ایسی یکطرفہ جارحیت کے مقابلے میں (خواہ وہ مسلح ہو یا غیر مسلح) اس سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے تدبیری طور پر "خدعہ" کا فعل کرنا جائز ہے۔

مثال کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے وقت مکہ سے مدینہ جانا تھا۔ مگر آپ نے مکہ سے نکل کر چند دن غار ثور میں قیام فرمایا جو کہ مدینہ کے الٹے رخ پر ہے۔ اسی طرح آپ کا طریقہ تھا کہ جب کسی مہم میں مشرق کی طرف روانہ ہونے والے ہوتے تو لوگوں سے مغرب کے راستہ کی تفصیلات پوچھتے تاکہ لوگ اس مغالطہ میں رہیں کہ آپ مغرب کی طرف سفر کرنے والے ہیں۔ اسی تدبیر کو شریعت میں توریہ کہا جاتا ہے۔

۲۴ مئی ۱۹۸۳

ایک مغربی مفکر این ایم بٹلر کا قول ہے کہ ایک بہت سنجیدہ عقیدہ جو ہر آدمی کو ماننا چاہئے، یہ ہے کہ کسی بھی چیز کو بہت زیادہ سنجیدہ طور پر نہ لیا جائے:

The one serious convictions that a man should have
is that nothing is to be taken too seriously.

(Nicholas Murray Butler)

اس میں شک نہیں کہ کچھ چیزیں حق ہیں، اور اصولاً وہ ہمیشہ حق رہیں گی۔ اور کچھ چیزیں باطل ہیں، اور وہ ہمیشہ باطل رہیں گی۔ مگر موجودہ مقابلہ کی دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اصولی تقاضے اور عملی تقاضے میں ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ ایسے مواقع پر عملی ضرورت کی بنا پر آدمی کو اپنے اندر لچک پیدا کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ لچک پیدا نہ کرے تو اس کا دوسرا انجام صرف یہ ہوگا کہ وہ تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔

جو آدمی عملی پہلوؤں کی رعایت نہ کر سکے اس کی مثال ایسی بائیسکل کی ہے جس کا ہنڈل پوری طرح کس دیا گیا ہو، اور وہ دائیں بائیں نہ گھومے۔ ایسی بائیسکل کے لئے یہی مقدر ہے کہ وہ کسی کھڈ میں جا گرے۔

۲۵ مئی ۱۹۸۳

انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ کمزور ہے، خدا کی سب بڑی طاقت یہ ہے

کہ وہ طاقت ور ہے۔ انسان کا کمزور ہونا اس کی تمام دوسری حیثیتوں کو باطل کر دیتا ہے۔ اور خدا کا طاقت ور ہونا اس کو یہ مطلق حیثیت دے دیتا ہے کہ وہ ہر حال میں انسان کو مغلوب اور مقہور کر سکے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کی عبدیت اپنی آخری شکل میں نمایاں ہو جاتی ہے۔ کسی شخص کا سفر معرفت اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ اس حقیقت کو نہ جان لے کہ وہ عجز کی انتہا پر ہے اور خدا قدرت کی آخری انتہا پر۔ اسی ادراک کے بعد آدمی کو ایمان کا "ذائقہ" ملتا ہے، اور اسی ادراک کے بعد آدمی کے اندر وہ تمام صفات پیدا ہوتی ہیں جن کو ایمانی صفات کہا جاتا ہے۔

۲۶ مئی ۱۹۸۳

اطباء حدیث کے طور پر یہ جملہ نقل کرتے ہیں: العلم علمان، علم الابدان وعلم الادیان (علم دو ہیں، بدن کا علم اور دین کا علم) مگر محدثین کے نزدیک یہ ایک مقولہ ہے نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ حدیث کی کتابوں میں طب سے متعلق تقریباً تین سو روایتیں پائی جاتی ہیں۔ خود صحیح بخاری میں "کتاب الطب" کے نام سے ایک مستقل باب موجود ہے۔

چنانچہ طب نبوی کے موضوع پر بہت سے لوگوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مثلاً ابو نعیم عبد اللہ اصفہانی، ابن قیم جوزی، شمس الدین محمد بن احمد، وغیرہ وغیرہ۔ عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی اس موضوع پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر سائرل الگوڈ نے انگریزی میں ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے:

Medicine of the Prophet

یہاں ایک سوال ہے کہ طب سے متعلق جو احادیث ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے۔ ابن خلدون (۸۰۸ - ۷۳۲ھ) اور شاہ ولی اللہ دہلوی کا کہنا ہے کہ طبی روایات کی شرعی حیثیت نہیں۔ یہ اس زمانہ کے حکماء، مثلاً حارث بن کلدہ وغیرہ کے تجربے ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب عادت کے تحت بیان فرمایا۔

بکر بن عبد اللہ ابو زید (مصری) کی کتاب ابن قیم الجوزیہ: حیاتہ و آثارہ (مطبوعہ

۱۹۸۰) میری نظر سے گزری۔ اس میں ابن قیم کی کتاب الطب النبوی کے تذکرہ کے تحت مصنف نے اس بات کی سخت تردید کی ہے کہ طب نبوی کی تشریعی حیثیت نہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے پیٹ کے علاج کے لئے شہد تجویز کیا۔ استعمال کے بعد بتایا گیا کہ اس کو اس سے فائدہ نہیں ہوا۔ آپ نے فرمایا: صدق اللہ وکذب بطن اخیك (صفحہ ۱۷۰) یعنی اللہ کا کلام سچا ہے، البتہ تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے۔ مگر اس روایت سے زیادہ سے زیادہ شہد کا استثناء ثابت ہوتا ہے کیوں کہ قرآن میں اس کو شفا للناس کہا گیا ہے محض اس روایت کی بنیاد پر بقیہ تمام نسخوں پر استدلال نہیں کیا جاسکتا ــــــ حقیقت یہ ہے کہ طب نبوی عربی ہے، نہ کہ الہامی معنوں میں طب نبوی۔

۲۷ مئی ۱۹۸۳

غزوۂ موتہ (۸ ھ) میں اسلامی لشکر کے تین سردار ایک کے بعد ایک شہید ہوگئے ــــ جعفر بن ابی طالب، زید بن حارثہ، عبداللہ بن ابی رواحہ۔ اس کے علاوہ بہت سے صحابہ شہید ہوئے۔ آخر میں خالد بن ولید کو اسلامی لشکر کا سردار بنایا گیا۔ انھوں نے دیکھا کہ فریق ثانی کا لشکر بہت زیادہ بڑا ہے، اس کے مقابلہ میں اسلامی لشکر بہت زیادہ کم ہے۔ ایسی حالت میں لڑائی جاری رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ بقیہ مسلمان بھی ہلاک ہو جائیں۔ اگرچہ یہ لوگ نہایت بہادر تھے۔ اور تمام لوگ لڑنے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ مگر خالد بن ولید نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اسلامی لشکر کو پیچھے ہٹالیا اور مدینہ واپس آگئے۔

مدینہ میں مسلمانوں نے ان کا استقبال فُرار (بھاگنے والے) کے لفظ سے کیا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ فُرار نہیں بلکہ کُرار ہیں (پیچھے ہٹنے والے نہیں بلکہ آگے بڑھنے والے ہیں) اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ اگر دشمن کی طاقت فیصلہ کن طور پر زیادہ ہو تو اس سے لڑائی چھیڑنا اسلام کا طریقہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر ایسی حالت پیش آئے اور اس وقت مسلمان تدبیر جنگ کے طور پر پیچھے ہٹ جائیں تو بظاہر اگرچہ یہ پیچھے ہٹنا ہے، مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ آگے بڑھنا ہے۔ کیوں کہ اس میں یہ ارادہ شامل ہے کہ پہلے مزید تیاری کی جائے، اس کے بعد زیادہ طاقت کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔

۲۸ مئی ۱۹۸۳

البرٹ آئن اسٹین (Albert Einstein) نے کہا کہ بہت کم لوگ ہیں جو یہ صلاحیت رکھتے ہوں کہ وہ ایسے موضوع پر سلامت طبع کے ساتھ اظہار خیال کرسکیں، جو ان کے سماجی ماحول کے تعصبات سے ٹکراتا ہو:

Few people are capable of expressing with equanimity opinions which differ from the prejudices of their social environment.

بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے قریبی حالات اور اپنے ماحول کی روایات کے دائرہ میں سوچتے ہیں۔ ماحول کی سوچ ہی ان کی اپنی سوچ بھی بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ایسی بات سمجھنا ان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے جو ان کے ماحول کی سوچ سے الگ ہو۔ مگر اس دنیا میں سچائی کو پانے والا صرف وہ شخص ہے جو اپنی قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔

۲۹ مئی ۱۹۸۳

اس زمانہ کی بات ہے جب کہ بادبان کے ذریعہ کشتیاں چلا کرتی تھیں۔ ایک بار کچھ لوگ کشتی پر سوار ہو کر جا رہے تھے۔ ہوا کسی قدر مخالف تھی جس کی وجہ سے کشتی کو آگے بڑھانے میں سخت مشکل پیش آرہی تھی۔ ایک مسافر نے شکایت کی۔ دوسرے شخص نے کہا:

تجری الریاح بمالا تشتھی السفن

(ہوائیں ایسے رخ پر چلتی ہیں جس کو کشتیاں نہیں چاہتیں، یعنی ہوا کا ہمارے موافق ہونا ضروری نہیں۔ وہ کبھی ہمارے موافق ہوگی اور کبھی ہمارے مخالف۔ ہماری کامیابی یہ ہے کہ ہم اس کے باوجود اپنا سفر جاری رکھ سکیں ——— قدیم شاعر نے جو بات بادبانی کشتی کے دور میں جان لی تھی، موجودہ زمانہ کے مسلمان اس کو مشینی کشتی کے دور میں بھی نہ جان سکے۔

۳۰ مئی ۱۹۸۳

پانچو گونزیلز (Pancho Gonzales) ٹینس کا مشہور کھلاڑی ہے۔ وہ ۹ مئی ۱۹۲۸ کو لاس اینجلس میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے کھیل میں بہت سے انعامات جیتے اور بڑی بڑی کامیابیاں

حاصل کیں۔ مگر وہ کہتا ہے کہ میں سب سے زیادہ جس واقعہ سے محظوظ ہوا، وہ کامیابی کا واقعہ نہ تھا۔ یہ وہ واقعہ تھا جب کہ آرتھر آشے نے اس کو ہرایا:

Pancho Gonzales said that the greatest tennis set in his experience was one in which Arthur Ashe defeated him.

اسی کا نام اسپورٹس مین اسپرٹ ہے۔ سچا اسپورٹس مین ہار جیت کو نہیں دیکھتا بلکہ کھیل کو دیکھتا ہے۔ ایک شخص اگر اچھے کھیل کا مظاہرہ کرے تو وہ اس سے اتنا زیادہ محظوظ ہوتا ہے کہ وہ بھول جاتا ہے کہ اس شخص نے خود مجھ کو شکست دے دی ہے۔ وہ اپنی ذات کے بجائے فن کو دیکھنے لگتا ہے۔ اس کے حریف نے اگر اس کو کسی اعلیٰ فن کاری کے تحت اسے ہرایا ہے تو وہ اس فن کاری میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ اپنی ذات اس کو یاد نہیں رہتی۔

۳۱ مئی ۱۹۸۳

ایک مثل ہے جو اکثر زبانوں میں کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا ہے —— جو لوگ شیشہ کے مکان میں رہتے ہوں، انھیں دوسروں کے اوپر پتھر نہیں پھینکنا چاہئے:

People who live in glass houses shouldn't throw stones.

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ کسی وجہ سے کمزور پوزیشن میں ہوں انھیں اپنے طاقت ور سے جنگ نہیں چھیڑنا چاہئے۔ کیوں کہ ایسی جنگ کا نتیجہ خود ان کے اپنے خلاف برآمد ہوگا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان تقریباً بلا استثناء یہی کر رہے ہیں۔ وہ ایک طاقت ور کے خلاف نہایت احمقانہ طور پر جنگ چھیڑ دیں گے اور اس کے بعد جب اس کا قدرتی خمیازہ بھگتنا ہوگا تو فریق ثانی کو ظالم قرار دے کر اس کے خلاف شکایت اور احتجاج کی لفظی مہم شروع کر دیں گے۔

کوئی شخص یا گروہ جب دوسرے کے مقابلہ میں کمزور پوزیشن میں ہو تو عمل کا آغاز ٹکراؤ سے نہیں کیا جائے بلکہ داخلی تیاری اور اندرونی استحکام سے کیا جاتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان اس سادہ سی بات کو اب تک سمجھ نہ سکے۔

یکم جون ۱۹۸۳

ایک عربی جریدہ میں ایک مضمون پڑھا۔ عنوان تھا: من اقوال الصحابة۔ اس میں درج تھا کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق نے ایک بار فرمایا۔ وہ ایک آدمی کی تلاش میں تھے جس کو کسی مقام کا حاکم بنا سکیں۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک ایسا آدمی چاہتا ہوں کہ جب وہ کسی گروہ میں امیر ہو تو وہ انھیں کے ایک شخص کی طرح رہے، اور جب وہ امیر نہ ہو تو ان کے درمیان امیر کی طرح بنا ہوا ہو:

قال عمر رضی اللہ عنہ وھو یبحث عن رجل یولیہ عملا: ارید رجلا اذا کان فی القوم وھو امیرھم کان کبعضھم واذا لم یکن امیراً فکانہ امیرھم۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس آدمی کے اندر ایسے اخلاقی اوصاف ہوں کہ عہدہ کے بغیر وہ لوگوں کے درمیان عزت واحترام کا درجہ حاصل کرلے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ اتنا بے نفس ہو کہ اگر اس کو عہدہ پر بٹھا دیا جائے تو اس کے اندر بڑائی کا احساس پیدا نہ ہو، اس کے باوجود وہ لوگوں کے درمیان عام آدمی کی طرح رہے ـــــ اچھے عہدیدار کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہوسکتی۔

۲ جون ۱۹۸۳

سئل المغیرة بن شعبة عن عمر بن الخطاب رضوان اللہ علیہ فقال: کان واللہ افضل من ان یَخدَعَ واعقل من ان یُخدَعَ۔ وھو القائل لست بخب والخب لا یخدعنی۔

مغیرہ بن شعبہ سے حضرت عمر فاروق کے بارہ میں پوچھا گیا۔ انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم وہ اس سے بلند تھے کہ وہ کسی کو دھوکا دیں اور اس سے زیادہ دانش مند تھے کہ کوئی انھیں دھوکا دے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں دغاباز نہیں، اور کوئی دغاباز مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔

دانش خدا کی عام نعمت ہے۔ خدا ہر زمانہ میں بے شمار لوگوں کو دانش اور ہوشیاری عطا فرماتا ہے۔ مگر مومن اور غیر مومن میں یہ فرق ہے کہ مومن دانش کے استعمال کی حد جانتا ہے، جب کہ غیر مومن دانش کے استعمال کی حد نہیں جانتا۔ یہ بلاشبہ دانش کا جائز استعمال ہے کہ آدمی دوسروں کی دغابازی سے بچے۔ مگر مومن کا خوف خدا اس بات کی ضمانت ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کی دغابازی سے اپنے آپ کو بچائے گا، مگر خود کبھی دوسروں کو دھوکا نہیں دے گا۔

۳ جون ۱۹۸۳

قدیم عرب میں قبیلۂ ثقیف ایک سرکش قبیلہ تھا۔ وہ طائف کے واحد محصور شہر میں رہتا تھا۔ یہ لوگ فتح کے بعد آخری زمانہ میں ایمان لائے۔ روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ثقیف کے لوگوں نے ارادہ کیا کہ وہ اسلام کو چھوڑ دیں اور مرتد ہو جائیں۔ اس وقت انھوں نے اپنے ایک بزرگ شخص عثمان بن ابی العاص سے مشورہ کیا۔ انھوں نے ان سے کہا : تم لوگ عربوں میں سب سے آخر میں اسلام لانے اور ان میں سب سے پہلے اسلام کو چھوڑ دینے والے نہ بنو۔ یہ رائے ثقیف کے لئے مفید ثابت ہوئی۔ وہ اپنے ارادے سے باز رہے :

لما ھمت ثقیف بالارتداد بعد وفاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم استشاروا عثمان بن ابی العاص وکان مطاعاً فیھم فقال لھم۔ لاتکونوا آخر العرب اسلاماً واولھم ارتداداً۔ فنفعھم اللہ برأیہ۔

انسانی خصوصیات میں سے آخری چیز غیرت ہے۔ ثقیف کے اندر اگرچہ گمراہی کے جذبات پیدا ہوئے، تاہم غیرت کا احساس پھر بھی ان کے اندر زندہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک جملہ ان کی اصلاح کے لئے کافی ہو گیا۔ اور جس آدمی کے اندر سے غیرت کا احساس رخصت ہو جائے، لمبی تقریر بھی ان کو تڑپانے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔

۴ جون ۱۹۸۳

زیاد بن ابی سفیان نے کہا کہ عقل مند وہ نہیں ہے جو معاملہ میں پڑ جانے کے بعد اس کی تدبیر کرے۔ عقل مند وہ ہے جو پہلے ہی تدبیر کرے تاکہ وہ معاملہ میں نہ پڑے (قال زید بن ابی سفیان لیس العاقل الذی وقع فی الامر احتال لہ۔ ولکن العاقل یحتال للامر حتی لایقع فیہ)

اس "عقل" کو حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ مشورہ ہے۔ وہ انسان بہت خوش قسمت ہے جس کو صاحب فہم افراد مشورہ دینے کے لئے مل جائیں۔ مشورہ کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس میں کئی آدمیوں کے تجربات اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ایک شخص کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ وسیع تر معلومات کی روشنی میں کوئی فیصلہ لے سکے۔

۵ جون ۱۹۸۳

علم حدیث میں ایک چیز وہ ہے جس کو "جرح و تعدیل" کہتے ہیں۔ راوی کے اوصاف وخصائل کی تحقیق کے بعد اس کے ان عیوب کا اظہار کرنا جو اس کی روایت کے قبول کرنے میں حارج ہوں، جرح کہلاتا ہے۔ اور راوی کے اخلاق و کردار کی تحقیق کے بعد یہ بتانا کہ راوی ثقہ ہے، تعدیل کہلاتا ہے۔

راویوں کی چھان بین کے اس کام میں سیکڑوں محدثین نے اپنی عمریں صرف کر دیں۔ وہ ایک ایک شہر گئے۔ راویوں سے ملے۔ ان کے پڑوسیوں سے ملاقاتیں کیں۔ ان کے حلقہ تعارف سے رابطہ قائم کیا۔ جو رواۃ اس زمانہ میں موجود نہ تھے ان کے دیکھنے والوں سے ان کے حالات معلوم کئے۔ اس طرح راویوں کے حالات کا ایک پورا انسائیکلوپیڈیا تیار کر ڈالا۔ اسی کو دیکھ کر ڈاکٹر اسپرنگر (Sprenger) نے کہا تھا کہ مسلمان اس خصوصیت میں ممتاز ہیں کہ انھوں نے اپنے پانچ لاکھ علماء کے حالات محفوظ رکھے۔

مگر یہ کام آسانی سے نہیں ہوگیا۔ اس پر اس زمانہ کے لوگوں کی طرف سے زبردست اعتراضات کئے گئے۔ کیوں کہ یہ طریقہ نہ صرف اشخاص پر تنقید سے تعلق رکھتا تھا، بلکہ بظاہر وہ غیبت اور تجسس تک پہنچتا تھا۔ محدثین کو بار بار یہ وضاحت کرنی پڑی کہ معرفت حدیث کا یہ طریقہ (جرح و تعدیل) غیبت نہیں ہے بلکہ شریعت اسلامی کے عین مطابق ہے۔

محدثین کے حالات میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں اس طرح کے واقعات کثرت سے موجود ہیں۔ مثلاً ابوتراب نخشبی نے امام احمد بن حنبل سے کہا کہ علماء اسلام کی غیبت نہ کیجئے۔ اس کے جواب میں امام احمد بن حنبل نے کہا: افسوس ہے تمہارے اوپر، تم کو جاننا چاہئے کہ ہمارا یہ کام نصیحت ہے کہ نہ کہ غیبت۔

۶ جون ۱۹۸۳

ایک مسلمان بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ہندستان کے موجودہ حالات کا ذکر کرتے ہوئے کہا: ملک کی آزادی کے لئے ہم نے سب سے زیادہ قربانی دی اور ہمیں کو سب سے زیادہ نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے ایک صحیح بات کو غلط الفاظ میں بیان کیا ہے۔ آپ کو یوں کہنا چاہئے کہ: ملک کی آزادی کے لئے ہم نے سب سے زیادہ بے وقوفی کی، اور بے وقوفی کرنے والوں کو ہمیشہ نظر انداز ہی

کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں نے ۱۸۵۷ میں مسلح بغاوت کے ذریعہ ہندستان کو آزاد کرنا چاہا۔ مگر اسلحہ کی طاقت میں انگریز ان سے بہت زیادہ بڑھا ہوا تھا اس لئے یہ بغاوت صد فی صد ناکام رہی۔ اس کے بعد مسلم لیڈروں نے "ریشمی رومال" جیسی تحریکیں چلائیں۔ ان کا مقصد بیرونی ممالک سے مدد لے کر ہندستان میں انگریزی اقتدار کو ختم کرنا تھا۔ مگر یہ تحریک بھی صد فی صد ناکام رہی۔ کیوں کہ باہر کے ملکوں نے ہمارے قائدین کی خوش فہمیوں کے برعکس ان کا ساتھ نہیں دیا۔ اس کے بعد ترکی کی خلافت کے نام پر جلسہ جلوس کا ہنگامہ کھڑا کیا گیا۔ اندازہ یہ تھا کہ ترکی کی مردہ خلافت دوبارہ زندہ ہو جائے گی۔ اور ہندستان کی آزادی میں مددگار ثابت ہوگی۔ مگر ۱۹۲۴ میں مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کے ختم شدہ ادارہ کے آخری خاتمہ کا اعلان کر دیا اور ہمارے رہنماؤں کی خلافت تحریک اچانک کٹی ہوئی شاخ کی طرح زمین پر گر پڑی۔

مسلم رہنما تشدد کے ذریعہ ہندستان کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ مگر یہ منصوبہ سراسر ناکام ہو گیا۔ اس کے بعد مہاتما گاندھی منظر پر آئے۔ انھوں نے عدم تشدد کی تدبیر کو کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۷ میں ہندستان آزاد ہو گیا۔ تحریک آزادی کے اس دوسرے دور میں مہاتما گاندھی کو قائد کا مقام حاصل تھا اور مسلم رہنماؤں کو صرف پیرو کا۔ ایسی حالت میں ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ تاریخ کے فیصلے کے تحت ہو رہا ہے۔ اس کی ذمہ داری تاریخی حقائق پر ہے۔ اس کے لئے ہندو یا حکومت کی شکایت کرنا ماضی کی بے وقوفی پر حال کی بے وقوفی کا اضافہ کرنا ہے۔

۷ جون ۱۹۸۳

چڑیا کو اڑتی ہوئی دیکھ کر خیال آیا کہ خدا اشاروں کی زبان میں ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں اس ڈھنگ پر بنائی گئی ہیں کہ ان سے انسان کو ہر قسم کا مفید سبق ملتا رہے۔

گھوڑے کو خدا نے زمین پر دوڑا دیا۔ اس کو دیکھ کر انسان کا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ وہ گاڑی بنائے۔ گاڑی بنیادی طور پر گھوڑے کی نقل ہے، اس فرق کے ساتھ کہ گھوڑے کے پاؤں کو گاڑی کے پہیہ کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح خدا نے مچھلی کو پانی میں تیرایا تاکہ انسان کشتی اور جہاز بنانے کی بات سوچ سکے۔ خدا نے چڑیوں کو ہوا میں اڑایا تاکہ اس کو دیکھ کر انسان کا

ذہن ہوائی جہاز بنانے کی طرف منتقل ہو۔

اسی طرح دنیا میں جو چیزیں ہیں، ان میں ہر قسم کے سبق رکھ دئے گئے ہیں، دنیا کے فائدے کے بھی اور آخرت کے فائدے کے بھی۔

۸ جون ۱۹۸۳

شیخ تاج الدین سبکی (م ۷۲۷ ھ، ۱۳۰۰ء) نے اپنی کتاب طبقات الشافعیہ الکبریٰ میں لکھا ہے کہ امت کے ہر امام کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا کہ لوگوں نے ان کو نشانہ ملامت بنایا، اور اس کے نتیجہ میں ہلاک ہونے والے ہلاک ہوئے (ما من امام الا وقد طعن فیہ طاعنون وھلک فیہ ھالکون)

ایک چیز ہے اختلاف رائے۔ اور دوسری چیز ہے طعن۔ دلیل کے ساتھ اختلاف رائے کرنا عین جائز بلکہ مفید ہے۔ مگر بے دلیل الزام لگانا اور شخصی عیب جوئی کرنا ہرگز جائز نہیں۔ اسی کا نام طعنہ زنی ہے، اور وہ بلا شبہہ ایمان کے منافی ہے۔

ہر زمانہ کے امام (بڑی شخصیتوں) کے ساتھ طعنہ زنی کیوں کی گئی۔ اس کا واحد سبب حسد ہے۔ انسان اپنے سوا کسی اور کو بڑا ماننا نہیں چاہتا، اس لئے جب وہ کسی کو بڑا ہوتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کی عیب جوئی کرکے اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ وہ واقعہ میں جب اپنے محسود کو چھوٹا نہیں کر پاتا تو لفظوں میں اسے چھوٹا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ منفی نفسیات کے زیر اثر وہ بھول جاتا ہے کہ اس طرح وہ خود اپنے آپ کو چھوٹا کر رہا ہے نہ کہ کسی دوسرے کو۔

۹ جون ۱۹۸۳

الرسالہ کے انداز پر تنقید کرتے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ آپ تو قوم کو بزدل بنا دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ علامہ اقبال نے کہا ہے:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ ان کے درمیان خیالی (Romantic) قسم کے رہنما اٹھے۔ کوئی اقبال کی طرح شاعر تھا، کوئی خطیب اور کوئی انشا پرداز۔ ان لوگوں نے حقائق پر دھیان نہیں دیا۔ بس الفاظ کے ذریعہ خیالی تصویریں بناتے رہے۔

مثلاً اقبال کا یہ شعر جسے آپ لوگ بڑی دھوم کے ساتھ پڑھتے ہیں، سراسر لغو ہے۔ اس کا حقیقت

سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصویر یہ بتائی گئی ہے کہ وہ عشق سے سرشار ہوکر بطور خود بھڑکتی ہوئی آگ میں کود پڑے۔ حالانکہ یہ بات واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔

اصل واقعہ کے مطابق، حضرت ابراہیم آگ میں جبراً ڈالے گئے تھے، نہ کہ خود سے آگ میں کود ے تھے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم کے دشمنوں نے باہم مشورہ سے یہ منصوبہ بنایا کہ انھیں آگ میں ڈال دو (قالوا حرقوہ) اور پھر آگ جلا کر اس میں انھیں پھینک دیا۔ (الانبیاء ۶۸)

روایات میں اس کی تفصیل آئی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بڑی تعداد میں لکڑی جمع کی۔ اس کے بعد ایک گڑھے میں آگ دہکائی۔ پھر حضرت ابراہیم کو باندھ کر منجنیق میں رکھا اور اس کے ذریعہ ان کو آگ میں پھینک دیا (ثم اوثقوا ابراهيم وجعلوه فى منجنيق ورموه فى النار، صفوة التفاسير، المجلد الثانى، صفحه ۲۶۸)

۱۰ جون ۱۹۸۳

شیعہ مذہب کا سارا انحصار اہل بیت کے تقدس پر ہے۔ مگر اہل بیت سے مراد ان کے نزدیک صرف حضرت فاطمہ اور ان کی اولاد ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تین اور صاجزادیاں تھیں ـــــ زینب، رقیہ، ام کلثوم۔ اور ظاہر ہے کہ اولاد رسول ہونے کے اعتبار سے سب یکساں ہیں، اس لئے تقدس کے معاملہ کو صرف فاطمہ سے وابستہ کرنے کی کوئی شرعی یا عقلی وجہ نہیں۔

مگر انسان کا دماغ اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کرنے میں بہت زرخیز واقع ہوا ہے۔ چنانچہ کچھ شیعہ علماء نے اپنے مسلک کی ایک تاویل دریافت کر لی۔ انھوں نے کہہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی صاجزادی صرف حضرت فاطمہ تھیں۔ بقیہ تین صاجزادیاں (زینب، رقیہ، ام کلثوم) آپ کی حقیقی صاجزادی نہ تھیں، وہ حضرت خدیجہ کے پہلے شوہر کی اولاد تھیں۔

حالانکہ یہ صرف ایک دعویٰ ہے، اس کا کوئی واقعی ثبوت موجود نہیں۔ خود قرآن (الاحزاب ۵۹) میں پردہ کے حکم کے تحت یہ الفاظ آتے ہیں: يا ايها النبى قل لازواجك وبناتك اس میں بنت کے بجائے بنات (جمع کا صیغہ) ہے جو بتاتا ہے کہ آپ کی صاجزادیاں کئی تھیں۔

۱۱ جون ۱۹۸۳

سائنسی تحقیقات کے مطابق آنسوؤں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو ریت یا دھوئیں وغیرہ کے سبب

سے آنکھوں سے بہنے لگتے ہیں۔ یہ آنکھ کی صفائی کا قدرتی انتظام ہے۔ اس قسم کے آنسو انسانوں اور جانوروں دونوں میں پائے جاتے ہیں۔

آنسوؤں کی دوسری قسم وہ ہے جو جذباتی دباؤ یا نفسیاتی ہیجان کے وقت نکلتے ہیں۔ غم یا خوشی کا شدید احساس ہو تو اس وقت آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ یہ دوسری قسم کے آنسو صرف انسان کے اندر پائے جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا تعلق نازک احساسات سے ہے، اور جانور اس قسم کے نازک احساسات نہیں رکھتے۔ کہا جاتا ہے کہ غم واندوہ کے تحت نکلے ہوئے آنسو دوسرے آنسوؤں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی کیمیائی ساخت مخصوص نوعیت کی ہوتی ہے جو دوسرے آنسوؤں میں نہیں پائی جاتی۔

میرے نزدیک آنسوؤں کی ایک تیسری قسم بھی ہے جس کو "ربانی آنسو" کہا جاسکتا ہے۔ یہ آنسو مذکورہ دونوں قسموں سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔ وہ خدا کے ساتھ انسانی روح کے ارتباط سے ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب کہ بندہ بندہ رہتے ہوئے اپنے رب سے مل جاتا ہے، جب وہ موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے حسیاتی طور پر دوسری دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت انسان حقیقت اعلیٰ کا براہ راست تجربہ کرتا ہے۔ تجربہ کے دوران اس کی روح پر جو ناقابل بیان احوال گزرتے ہیں، وہ خارجی طور پر آنسوؤں کی صورت میں بہہ نکلتے ہیں۔

۱۲ جون ۱۹۸۳

فلپ ڈورمر اسٹان ہوپ کا قول ہے کہ موجودہ لوگوں کے بارہ میں تحقیر کے بغیر بولو، اور قدیم لوگوں کو بت بنائے بغیر ان کے بارہ میں کلام کرو:

Speak of the moderns without contempt and of the ancients without idolatry.
— Philip Dormer Stanhope

انسان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی ہم زمانہ شخصیتوں کو حقیر سمجھتا ہے۔ وہ ان کے بارہ میں منصفانہ رائے قائم نہیں کر پاتا۔ اس کے برعکس ماضی کی شخصیتوں کو وہ بت بنا لیتا ہے۔ وہ ان کے بارہ میں مبالغہ آمیز قصیدہ خوانی کرتا ہے۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ آدمی کو حقیقت پسندی اور انصاف پر قائم رہنا چاہئے۔

خواہ وہ ماضی کی شخصیتوں پر کلام کر رہا ہو یا حال کی شخصیتوں پر۔

۱۳ جون ۱۹۸۳

ایک اجتماع کی تاریخ پر بعض لوگوں کو اعتراض تھا۔ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے کہا کہ لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ جون کا مہینہ اجتماع کرنے کے لئے بہت غیر موزوں ہے۔ مگر ایسا صرف وہ لوگ کہہ سکتے ہیں جو اس اجتماع کو عام قسم کا ایک سیمنار سمجھتے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جس مقصد سے یہ اجتماع رکھا ہے اس کے لحاظ سے جون کا مہینہ موزوں ترین مہینہ ہے۔ یہ اجتماع ہم نے اس لئے رکھا ہے کہ یہ دیکھیں کہ کیا قوم میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو جون کی گرمی کو دیکھ کر جہنم کی گرمی کو یاد کریں۔ خدا کی جنت کا شوق جن کی نظر میں دنیا کی مصیبتوں کو بے قیمت کر دیتا ہو۔ اس چند روزہ تجربہ میں آپ کو جو تکلیفیں پہنچیں گی وہ اس سے بہت کم ہیں جو پچھلے حق پرستوں کو پہنچیں۔ اگر آپ اس معمولی مصیبت کو برداشت نہ کر سکیں تو آپ سے کیا امید کی جا سکتی ہے کہ آپ حق کی خاطر اس سے زیادہ قربانیاں دے سکتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے قائد نے اپنی فوج کو پیاس کے باوجود دریا میں پانی پینے سے روک دیا۔ (بقرہ ۲۴۹) بدر کا غزوہ رمضان کے مہینہ میں پیش آیا۔ تبوک کا سفر ایسے وقت میں کرنا پڑا جبکہ فصلیں کاٹنے کے لئے بالکل تیار کھڑی تھیں۔ وغیرہ۔ اس قسم کے واقعات بالقصد اس لئے کئے گئے تاکہ پہلے ہی مرحلہ میں قوم کی استعداد کا اندازہ کر لیا جائے۔ اگر آپ ان معمولی مصیبتوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو یقیناً یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ سے اس کے آگے کی کوئی امید کرنا سخت ترین نادانی ہو گی۔

۱۴ جون ۱۹۸۳

ایران کے قدیم بادشاہ کو مسلمانوں کے مقابلہ میں نہاوند کے مقام پر فیصلہ کن شکست ہوئی تھی۔ مورخ طبری کا بیان ہے کہ اس کے بعد اس نے چین کے بادشاہ کے پاس اپنا ایک قاصد بھیجا تاکہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اس کی مدد حاصل کرے۔ شاہ چین نے قاصد سے مسلمانوں کے اوصاف پوچھے۔ اس کے بعد اس نے شاہ ایران کو خط لکھا:

بادشاہوں کا فرض ہے کہ وہ مغلوب بادشاہوں کی درخواست پر ان کی مدد کریں۔ میں

تمہاری مدد کے لئے ایسا لشکر بھیج سکتا ہوں جس کا اگلا سرا مرو میں ہو اور دوسرا سرا چین میں۔ مگر دشمن کے جو اوصاف مجھے بتائے گئے ہیں وہ بہت قابل توجہ ہیں۔ یہ لوگ جب تک ان اوصاف کے حامل ہیں، وہ پہاڑ کو بھی اپنی جگہ سے ہٹا دیں گے۔ حتی کہ میری حکومت کو ختم کرنا بھی ان کے لئے مشکل نہ ہوگا۔ اس لئے میری رائے ہے کہ تم ان سے صلح کر لو۔ ان کی برتری پر راضی ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ ان سے ٹکراؤ کیا جائے۔

شاہ چین کا یہ تبصرہ اس بات کا اعتراف ہے کہ اس دنیا میں کسی قوم کی اصل طاقت اس کا کردار ہے نہ کہ تعداد اور فوجی ہتھیار۔

۱۵ جون ۱۹۸۳

قال الامام ابو حنيفة : اذا جاء الحديث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فعلى الرأس والعين۔ واذا جاء عن الصحابة فعلى الرأس والعين۔ واذا جاء عن التابعين فهم رجال ونحن رجال۔

امام ابو حنیفہ نے کہا کہ جب کوئی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے تو سر آنکھوں پر۔ اور جب وہ صحابہ سے ملے تب بھی سر آنکھوں پر۔ اور جب وہ تابعین سے ملے تو وہ بھی آدمی ہیں اور ہم بھی آدمی ہیں۔

۱۶ جون ۱۹۸۳

ایک مسلمان ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی۔ ان سے ہندستانی مسلمانوں کے مسائل پر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمانوں کو ان اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا چاہئے جن کو قرآن میں اعراض اور صبر اور یک طرفہ حسن کردار کہا گیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ احکام مکی دور کے ہیں جب کہ ابھی امت نہیں بنی تھی۔ امت بن جانے کے بعد جو تعلیم دی گئی ہے وہ جہاد ہے۔ اب ہم کو جہاد اور مقابلہ کے طریقہ پر عمل کرنا ہے۔

میں نے کہا کہ " امت " بننے کا جو نظریہ آپ پیش کر رہے ہیں وہ بجائے خود قابل بحث ہے تاہم اس سے قطع نظر، یہ بتائیے کہ قرآن میں یہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ اعراض اور صبر جیسے احکام امت بننے سے پہلے کے لئے ہیں۔ امت بننے کے بعد کے لئے نہیں۔ امت بننے کے بعد جہاد و قتال کے حکم پر عمل کرنا ہے۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں قرآن کی کوئی آیت پیش نہ کر سکے۔

میں نے کہا کہ " امت " کا یہ تصور بالکل مفروضہ تصور ہے۔ اس کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ اعراض کے بارے میں قرآن میں یہ آیت ہے کہ واعرض عن الجاھلین (اعراف ۱۹۹) گویا اعراض اختیار کرنے کا سبب دوسروں کا جہل ہے ، نہ کہ امت بننا یا نہ بننا۔ اسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ لوگوں کی ایذا رسانی پر صبر کرو اور ان کے برے سلوک کے باوجود ان سے اچھا سلوک کرو ، اس طرح جو تمہارا دشمن ہے وہ تمہارا دوست بن جائے گا (حم السجدہ ۳۵-۳۴)۔ یہاں بھی اغیار کی " عداوت " کو وجہ صبر بتایا گیا ہے نہ کہ امت بننے یا نہ بننے کو۔

۱۷ جون ۱۹۸۳

ہندستان ٹائمس (۲۳ مئی ۱۹۸۳) کے صفحہ ۲۱ پر ایک مضمون چھپا ہے جس کا عنوان یہ ہے ——— اردشیر پہلی بار گیس کی روشنی بمبئی میں لائے :

Ardshir brought gas lighting into Bombay.

اردشیر ایک پارسی تھا۔ وہ مشہور واڈیا خاندان میں پیدا ہوا جو انیسویں صدی عیسوی میں پانی کا جہاز بناتا تھا جس کی ایک گاہک ایسٹ انڈیا کمپنی بھی تھی۔ اردشیر نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کو ٹکنکل چیزوں سے خاص دلچسپی تھی۔ اس نے انگلینڈ کا دورہ کیا تاکہ جدید ٹکنیک سے واقفیت حاصل کرے۔ واپس آکر اس نے ہندستان میں بہت سے صنعتی منصوبے چلائے۔ اس نے بمبئی میں پہلی بار چراغ کے بجائے گیس کی روشنی کو رائج کیا۔

مسلمانوں نے قدیم روایتی دور میں دنیا کو بہت سی نفع بخش چیزیں دی تھیں۔ مثلاً کھیتوں کی سینچائی کے لئے چرخی کے بجائے رہٹ ، وغیرہ ، مگر دور جدید میں ان کا نام صرف لینے والوں کی فہرست میں درج ہے ، دینے والوں کی فہرست میں ان کا نام کہیں درج نہیں۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس نے انھیں دور جدید میں بے قیمت کر دیا۔

۱۸ جون ۱۹۸۳

کسی مفکر کا قول ہے ——— سیاسی مدبر وہ شخص ہے جو سوال کو جانتا ہے۔ اور سیاسی لیڈر وہ شخص ہے جو جوابات کو جانتا ہے :

A statesman is a man who knows the question.
A politician is a man who knows the answers.

مدبر ایک سنجیدہ انسان ہوتا ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں کچھ کرنا چاہتا ہے، اس لئے وہ سوالات (مسائل) کو جاننا چاہتا ہے تاکہ ان کو جان کر انھیں حل کرے۔ سیاسی لیڈروں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ان کا مقصد صورت حال کا استحصال کرنا ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذہانت صرف اس میں دکھاتے ہیں کہ جب کوئی شخص ان کے خلاف کوئی بات کہے تو فی الفور اس کا ایک مسکت جواب لفظوں میں ڈھال کر پیش کر دیں۔

۱۹ جون ۱۹۸۳

ایک مطالعہ کے ذیل میں یہ حدیث سامنے آئی: عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یزال البلاء بالمؤمن او المؤمنۃ فی نفسہ او مالہ او ولدہ حتی یلقی اللہ وما علیہ من خطیئۃ (الترمذی) حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن مرد اور مومن عورت پر مصیبتیں پڑتی رہتی ہیں، اس کے جان میں اور اس کے مال میں اور اس کی اولاد میں، یہاں تک کہ وہ اللہ سے اس حال میں ملتا ہے کہ اس کے اوپر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔

مصیبتوں کے ذریعہ خطاؤں کی معافی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مصیبت پڑنا آٹومیٹک طور پر خطاؤں کی معافی کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ بات دراصل اس انسان کے اعتبار سے کہی گئی ہے جو مصیبتوں کا استقبال "مومن" کی حیثیت سے کرے۔

ایک شخص جس کے اندر ایمانی شعور زندہ ہو، اس کے لئے ہر مصیبت اس کو خدا سے مزید جوڑنے کا سبب بن جاتی ہے۔ اس کے ذریعہ سے اس کے اندر خدا کی یاد ابھرتی ہے۔ وہ اعلیٰ ایمانی کیفیات کا تجربہ کرتا ہے۔ وہ دنیا کے مقابلہ میں آخرت کا چاہنے والا بن جاتا ہے۔ ہر مصیبت اس کو قدرتِ خداوندی اور عجز انسانی کا سبق دیتی ہے۔ اس طرح وہ مصیبتوں کے ذریعہ معرفت کے مراحل طے کرتا رہتا ہے، اور پھر وہ اس حال میں خدا سے ملتا ہے کہ اس کی روح ربانی تجربات کے سمندر میں نہا کر مصفّٰی ومزکّٰی روح بن چکی ہوتی ہے۔

۲۰ جون ۱۹۸۳

اراکان، برما کا ساحلی ضلع ہے جو بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) سے ملتا ہے۔ ۱۹۴۷ میں برما کی سرحد پر مشرقی پاکستان وجود میں آیا تو اراکان کے مسلمانوں نے غیر ضروری طور پر مشرقی پاکستان سے اپنا تعلق

جوڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اراکان کے مسلم علاقہ میں آزادی کی تحریکیں چل پڑیں۔ اس کے نتیجہ میں اراکان کے مسلمان برما کی سوشلسٹ حکومت کی نظر میں معتوب ہوگئے۔ ان پر سختیاں کی جانے لگیں۔ ۱۹۷۸ میں تقریباً دو لاکھ آدمی اراکان کو چھوڑ کر مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کے علاقہ میں داخل ہونے پر مجبور ہوگئے۔

اراکان کے مسلمانوں کی تحریک آزادی بلاشبہ ایک احمقانہ تحریک تھی۔ مگر اس کو روکنے کے لئے کوئی مسلمان لیڈر نہیں اٹھا۔ البتہ جب اپنی حماقت کے نتیجہ میں وہ "مظلوم" ہوگئے تو تمام مسلمان لیڈروں نے ان کی حمایت میں بیان دینا شروع کر دیا۔ اخبار ریڈینس (۱۱ جون ۱۹۷۸) نے اپنے صفحۂ اول کے ایک مضمون میں بتایا تھا کہ برما میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۴ ملین ہے۔ وہ برما کی کل آبادی کا ۱۰ فی صد ہیں۔ وہ ملک کی دوسری سب سے بڑی کمیونٹی ہیں۔ اراکان ضلع کے مسلمان منظم منصوبہ کے تحت ستائے جا رہے ہیں۔ اور ان کو ان کی املاک سے محروم کیا جا رہا ہے۔

ریڈینس نے مزید لکھا ہے کہ ایوب خاں کے زمانہ حکومت میں وہ سابق مشرقی پاکستان جانے پر مجبور کر دئے گئے تھے۔ سابق فوجی حکمراں (ایوب خاں) نے وارننگ دی کہ مجھے امید ہے کہ برما یہ نہیں چاہتا کہ ہماری فوجیں سرحد کو پار کریں۔ اس وارننگ نے مسلمانوں کے خاتمہ کے عمل کو روک دیا، اگرچہ تھوڑی مدت کے لئے:

> During the days of Mr Ayub Khan, they were physically pushed into what was once East Pakistan. The Late Military General's warning "I hope you don't want our forces to cross the border" stopped Muslim extermination, but only for a short period. (p. 1).

یہ مدت مختصر کیوں رہی۔ اس کی ذمہ داری برما پر نہیں بلکہ خود مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ پاکستان میں صدر ایوب کے خلاف پرشور تحریک اٹھائی گئی جس میں مسٹر بھٹو کے ساتھ اسلام پسند گروہ کے لیڈر سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی پوری طرح شریک تھے۔ اس کے نتیجہ میں صدر ایوب کو استعفا دینا پڑا۔ اس کے بعد ایسے حالات پیش آئے کہ پاکستان برابر کمزور ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ اس قابل نہ رہا کہ اس کی ایک "دھمکی" پر برما کی حکومت متزلزل ہو جائے۔

۲۱ جون ۱۹۸۳

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب آزادی ہند (India Wins Freedom) میں لکھا ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے تقسیم کے نظریہ کا سب سے پہلا شکار جو شخص ہوا وہ سردار پٹیل تھے۔ غالباً بالکل آخر تک مسٹر جناح کے لئے پاکستان محض ایک سودا بازی کا معاملہ تھا:

> Till perhaps the very end Pakistan was for Jinnah a bargaining counter. (p. 183)

مسٹر جناح کے بارے میں یہ بات دوسرے کئی اصحاب نے بھی لکھی ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کانگرس قیادت اگر ہوشمندی سے کام لیتی تو تقسیم سے بچنا ممکن تھا۔ میرے نزدیک یہ بات درست نہیں۔

اصل یہ ہے کہ سودا بازی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ دو آدمیوں کی گفت وشنید کے دوران اس کو اختیار کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ عوام کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا ہو۔ مسٹر جناح کا معاملہ اول الذکر نوعیت کا معاملہ نہ تھا۔ اگر وہ تقسیم کی سودے بازی کو محض ذاتی سطح کی گفت وشنید میں اختیار کئے ہوئے ہوتے تو کسی مرحلہ میں وہ اس سے دست بردار بھی ہو سکتے تھے۔ مگر جناح اور ان کے ساتھیوں نے تقسیم کے موضوع پر سارے مسلم عوام کو بھڑکا دیا تھا۔ حتی کہ انھوں نے مبالغہ آمیزی کرکے اس کو آخری حدوں کے پار پہنچا دیا تھا۔ ایسی حالت میں خود مسلم لیگ کی قیادت کے لئے مطالبہ تقسیم سے پیچھے ہٹنا ممکن نہ تھا۔ عوامی ابال کو اس طرح پیچھے کی طرف لوٹانا کبھی ممکن نہیں ہوتا۔

۲۲ جون ۱۹۸۳

بطلیموس (Ptolemy) دوسری صدی عیسوی کا مشہور یونانی عالم فلکیات ہے۔ اس نے نظام شمسی کا زمین مرکزی (Earth-centered) نظریہ پیش کیا۔ اس موضوع پر اس کی کتاب المجستی بہت مشہور ہے۔ بطلیموس کا نظریہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال تک عالمی ذہن پر چھایا رہا، یہاں تک کہ سولھویں صدی عیسوی میں کوپرنیکس اور گلیلیو اور کیپلر کی تحقیقات نے اس کو غلط ثابت کر دیا، اور اب ساری دنیا میں کوئی اس کو ماننے والا نہیں۔

اس طرح کے کتنے نظریات ہیں جو محدود مدت کے لئے ذہنوں پر چھاتے ہیں اور پھر حرف غلط کی طرح مٹا دئے جاتے ہیں۔ مگر "توحید" کا نظریہ زمانہ کے بے شمار نشیب وفراز کے باوجود اپنی اہمیت کم نہ

کرسکا۔ بلکہ ہرنئی تحقیق اس کی اہمیت وواقعیت میں مزید اضافہ کر دیتی ہے۔ یہ واقعہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ توحید ایک واقعی حقیقت ہے نہ کہ محض ایک فرضی عقیدہ۔

(زمینی مرکزیت کے نظریہ کے لئے عیسائی نقطۂ نظر : (EB-4/522)

۲۳ جون ۱۹۸۳

امام بخاری نے محمد بن جبیر بن مطعم سے روایت کیا ہے کہ ان کے والد (جبیر بن مطعم) نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب کی نماز میں سورہ الطور پڑھتے ہوئے سنا۔ جب آپ اس آیت پر پہنچے: ام خلقوا من غیر شیٔ ام ھم الخالقون۔ ام خلقوا السماوات والارض بل لا یوقنون ام عندھم خزائن رحمۃ ربك ام ھم المصیطرون۔ تو ان الفاظ کو سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرا دل اسلام کی طرف اڑ جائے گا (کاد قلبی ان یطیر الی الاسلام) مفسر ابن کثیر اس ذیل میں لکھتے ہیں :

وجبیر بن مطعم کان قد قدم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد وقعۃ بدر فی فداء الاساریٰ وکان اذ ذاك مشرکاً فکان سماعہ ھذہ الآیۃ من ھٰذہ السورۃ من جملۃ ما حملہ علی الدخول فی الاسلام بعد ذالك (صفحہ ۲۴۴)

اور جبیر بن مطعم بدر کے واقعہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے تاکہ فدیہ دے کر اپنے قیدیوں کو چھڑائیں۔ اور وہ اس وقت مشرک تھے۔ اس لئے سورہ طور کی ان آیتوں کا سننا من جملہ ان اسباب کے تھا جس نے اس کے بعد انھیں اسلام میں داخل ہونے پر آمادہ کیا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دور اول کے لوگ شعوری انقلاب کے تحت ایمان لائے تھے۔ ان کا ایمان ان کے لئے حقیقت کی دریافت کے ہم معنی تھا نہ کہ محض روایتی تقلید کے ہم معنی جیسا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔

۲۴ جون ۱۹۸۳

حدیث میں آیا ہے کہ مَنْ فارق الجماعۃ شبراً فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ (جو شخص ایک بالشت بھر بھی الجماعت سے ہٹا اس نے اسلام کی رسی اپنی گردن سے نکال پھینکی۔ اسی طرح دوسری حدیث میں ہے ید اللہ علی الجماعۃ (الجماعۃ پر خدا کا ہاتھ ہے) اس طرح کے

مواقع پر عام طور پر لوگ الجماعت سے مراد سواد اعظم لیتے ہیں یعنی کسی زمانہ کے مسلمان یا کسی زمانہ کے اہل دین جس پر زیادہ تعداد میں متفق ہو جائیں۔ مگر الجماعۃ کی یہ تشریح صحیح نہیں۔

"الجماعت" کی تشریح خود حدیث میں موجود ہے۔ ایک حدیث مختلف طرق سے آئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سابق اہل کتاب ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے اور امت مسلمہ ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ان میں سے صرف الجماعت برحق اور مستحق جنت ہوگی۔ (واحدۃ فی الجنۃ وھی الجماعۃ) ترمذی کی روایت میں ہے کہ صحابہ کرام نے پوچھا کہ یہ الجماعت کون لوگ ہیں۔ آپ نے جواب دیا: وہ جو اس پر ہوں جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں (من کان علیٰ ما انا علیہ واصحابی)

رسول اور اصحاب رسول اس ملت میں اصل معیار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ "الجماعت" ہیں۔ ہر زمانہ کے مسلمانوں کو ہر معاملہ میں انھیں کی طرف دیکھنا ہے۔ بعد کے مسلمان دور اول کی اس الجماعت پر پرکھے جائیں گے نہ کہ خود اپنے زمانہ کے سواد اعظم یا اکثریتی گروہ کی بنیاد پر۔ مثلاً ہندستان میں مسلمان پہلی جنگ عظیم کے بعد خلافت کمیٹی میں بہت بڑی اکثریت کے ساتھ شامل ہو گئے۔ تقسیم ہند سے پہلے مسلمانوں کی بیشتر تعداد مسلم لیگ کے تحت جمع ہو گئی۔ آجکل مسلمانوں کی اکثریت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ساتھ شریک ہے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی الجماعت نہیں۔ الجماعت کی حیثیت صرف رسول اور اصحاب رسول کو حاصل ہے، اور ان کی یہ حیثیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ مثلاً آج کسی مسلمان کا صحیح یا غلط ہونا اس پر نہیں جانچا جائے گا کہ وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ساتھ شریک ہے کہ نہیں۔ بلکہ اس کو اس اعتبار سے جانچا جائے گا کہ اس کا رویہ رسول اور اصحاب رسول کے رویہ کے مطابق ہے یا نہیں۔

۲۵ جون ۱۹۸۳

ایک عربی کتاب میں یہ واقعہ پڑھا کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنے لڑکے کے ساتھ چلا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر وہ زندہ رہا تو وہ تم کو فتنہ میں مبتلا کرے گا، اور اگر وہ مر گیا تو تم کو غمگین کرے گا (رأی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما رجلا یسیر مع ابنہ فقال ان عاش فَتَنَكَ وان مات احزنك)

اس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ آدمی اپنی اولاد سے بے پناہ تعلق قائم کرتا ہے۔ حتی کہ اولاد ہر آدمی کی سب سے زیادہ محبوب چیز ہوتی ہے۔ مگر اکثر حالات میں اولاد سے اس کی توقعات پوری

نہیں ہوتیں۔ اگر بالفرض وہ کم عمری میں مرجائے تو باپ کو شدت محبت کی وجہ سے شدید صدمہ لاحق ہوتا ہے۔ اور اگر وہ زیادہ دنوں تک زندہ رہے تب بھی اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بیٹے کی محبت باپ کو کسی کسی آزمائش میں مبتلا کر دیتی ہے۔ مثلاً اولاد کی وجہ سے انفاق فی سبیل اللہ میں کمی۔ اولاد کا مستقبل بنانے کی خاطر غلط کارروائی کرنا، اولاد کے اصرار کی وجہ سے دوسروں کی حق تلفی کرنا، وغیرہ۔ دنیا میں سچے بیٹے بھی کم ہیں اور سچے باپ بھی کم۔

۲۶ جون ۱۹۸۳

محمد حسین آزاد اپنی کتاب "آب حیات" کی وجہ سے کافی مشہور ہیں۔ ان کے والد کا نام مولانا محمد باقر تھا۔ انھوں نے ۱۸۳۷ء میں دہلی سے "اردو اخبار" جاری کیا۔ ۱۸۵۴ میں محمد حسین آزاد بھی اس میں ایڈیٹر کی حیثیت سے شریک ہوگئے۔

۱۸۵۷ کے غدر (یا جنگ آزادی) کے زمانہ میں "اردو اخبار" نے انگریزوں کے خلاف دھواں دھار مضامین شائع کئے۔ مگر انگریزوں کے خلاف بغاوت مکمل طور پر ناکام ہوگئی۔ اس کے بعد پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ مولانا محمد باقر گرفتار کر لئے گئے اور انھیں گولی ماردی گئی۔ محمد حسین آزاد بھاگ کر روپوش ہوگئے۔ آخر میں انھوں نے سیاست سے علیحدگی اختیار کرلی اور انگریزوں کے ایک تعلیمی ادارہ (گورنمنٹ کالج لاہور) میں ملازم ہوگئے۔ اس کے بعد محمد حسین آزاد کی سیاسی مضمون نگاری ادبی مضمون نگاری میں تبدیل ہوگئی۔ آب حیات اسی دوسرے دور کی تصنیف ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں مسلمانوں کے درمیان بڑی تعداد میں اعلیٰ ذہن کے لوگ پیدا ہوئے۔ مگر وہ اپنی صلاحیتوں کا صرف دو استعمال دریافت کرسکے —— مشغلۂ سیاست یا مشغلۂ ادب۔ ان کی صلاحیت کا اصلی اور دور رس استعمال صرف مشغلۂ دعوت تھا۔ مگر وہ ان کی دریافت سے باہر رہا، اس لئے وہ اپنے آپ کو اس میں مشغول بھی نہ کرسکے۔

۲۷ جون ۱۹۸۳

انگریزی دور میں ہمارے علماء اور رہنماؤں نے انگریزوں کے خلاف اس قدر نفرت پیدا کی کہ وہ حد کو پار کر گئی۔ "نفرت انگریز" بجائے خود ایک نیکی بن گئی۔ انگریز جب ہندستان آئے تو مشینیں ایجاد ہو چکی تھیں اور اسٹیم پاور دریافت ہو چکی تھی۔ مگر بڑھی ہوئی نفرت کی بنا پر

لوگوں نے انگریزوں کی اچھی چیز کو بھی بری نظر سے دیکھا۔ اس کا ایک نمونہ اکبر الٰہ آبادی (۱۹۲۱-۱۸۴۶) کا یہ قطعہ ہے:

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا — حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے — شاہ ایڈورڈ کی دہائی ہے

اس منفی بلکہ مجنونانہ نفرت کے ذہن کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمان لمبے عرصے تک جدید علوم اور جدید ٹکنالوجی سے بیزار رہے۔ اور بالآخر جدید شعبوں میں دوسری قوموں سے کم از کم سو سال پیچھے ہو گئے۔

۲۸ جون ۱۹۸۳

امام حسن بصری تابعی کا قول ہے کہ تدبیر آدھا کسب ہے (التدبیر نصف الکسب) یہ بڑی حکیمانہ بات ہے۔ اس تدبیر کا تعلق ہر قسم کے "کسب" سے ہے۔ معاش حاصل کرنے کا معاملہ ہو یا اور کوئی معاملہ، ہر چیز میں تدبیر فیصلہ کن حد تک اہمیت رکھتی ہے۔ خوش تدبیری سے بگڑا ہوا معاملہ بن جاتا ہے، اور بدتدبیری سے بنا ہوا معاملہ بگڑ جاتا ہے۔

۲۹ جون ۱۹۸۳

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرو جو تم خود اپنے لئے پسند کرتے ہو (احبّ لاخیك ما تحبّ لنفسك) اس حدیث نبوی میں مختصر ترین الفاظ میں مفصل ترین بات کہہ دی گئی ہے۔ یہ اخلاق انسانی کی بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے بہتر الفاظ میں اخلاق انسانی کی تشریح نہیں کی جا سکتی۔ اگر آدمی سنجیدہ ہو تو یہی ایک جملہ اس کی پوری زندگی میں اخلاقی سدھار لانے کے لئے کافی ہے۔

۳۰ جون ۱۹۸۳

ابن عطاء اللہ السکندری کا قول ہے کہ اس شخص نے کیا پایا جس نے خدا کو کھو دیا، اور اس شخص نے کیا کھویا جس نے خدا کو پا لیا (ماذا وجد من فقدہ وماذا فقد من وجدہ) یعنی جو شخص اللہ کو پا لے وہ کچھ بھی نہیں کھوتا، خواہ اس نے بظاہر کتنا ہی زیادہ نقصان اٹھایا ہو۔ اور جو شخص اللہ کو کھو دے وہ کچھ بھی نہیں پاتا، خواہ بظاہر اس نے بہت کچھ حاصل کر لیا ہو۔ اللہ سب کچھ ہے اور اس کے سوا جو ہے وہ بے کچھ۔

یکم جولائی ۱۹۸۳

کسی شخص کا قول ہے کہ کامیابی کبھی آخری نہیں ہوتی اور ناکامی کبھی قطعی نہیں ہوتی۔ یہ دراصل حوصلہ ہے جو اہمیت رکھتا ہے:

Success is never final and failure never fatal. It's courage that counts.

اس دنیا میں کامیابی پر مگن ہونا بھی اتنا ہی بے معنی ہے جتنا ناکامی پر بے حوصلہ ہونا۔ کیونکہ یہاں کامیابی بھی وقتی ہے اور ناکامی بھی وقتی۔ آدمی اپنی نادانی سے کامیابی کو ناکامی میں تبدیل کر سکتا ہے اور اسی طرح اپنی بے ہمتی سے ایک ناکامی کو آخری ناکامی بنا سکتا ہے۔ حالاں کہ اگر وہ ہمت سے کام لیتا تو اس کے بعد بھی اس کے لئے ایک نئی عظیم تر کامیابی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

۲ جولائی ۱۹۸۳

زمانۂ نبوت کا واقعہ ہے۔ عرب کے ایک بدو نے قرآن کی یہ آیت سنی: فاصدع بما تؤمر... وہ اسی وقت سجدہ میں گر پڑا۔ اس سے پوچھا گیا کہ کیا تم نے ایمان قبول کر لیا۔ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ بلکہ میں نے اس آیت کی ادبی بلاغت کی وجہ سے سجدہ کیا ہے (ان بدویا سمع قول الله: فاصدع بما تؤمر... فسجد فی الحال فقیل له هل آمنت فرد قائلاً بل سجدت لبلاغة هذه الآية)

قدیم صحرائی دور میں عرب میں جو نسل تیار ہوئی تھی، اس کے اندر اعتراف کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ وہ کسی حقیقت کو جان لینے کے بعد اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کی یہی خصوصیت تھی جس نے ان کے اندر مومنین کاملین کا وہ گروہ پیدا کیا جو ہمیشہ کے لئے اسلام کا نمونہ قرار پائے۔

۳ جولائی ۱۹۸۳

ترکی کے سعید النورسی (۱۹۶۰ - ۱۸۷۳) ترکی کے حسن البنا تھے۔ وہ کمال اتاترک کے سیکولرزم کے مخالف تھے۔ انھوں نے اپنے مشہور رسائل النور کے ذریعہ ترکی کے نوجوانوں میں اسلامی جذبہ بیدار کرنے کی کوشش کی۔ وہ کہتے تھے کہ اے مغرب، تو نے انسان کے جسم کو جنت میں پہنچا دیا اور اس کی روح کو جہنم میں ڈال دیا۔ ایها الغرب، وضعت جثة البشرية فی الجنة ووضعت

روح البشریۃ فی جھنم)
یہ بات بذات خود غلط نہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ سائنٹفک انداز نہیں ہے بلکہ جذباتی اور خطابی انداز ہے۔ خطابی انداز کچھ لوگوں میں وقتی جوش تو پیدا کر سکتا ہے، مگر وہ گہری شعوری تبدیلی لانے کے لئے کارآمد نہیں۔

۴ جولائی ۱۹۸۳

البرٹ ہبرڈ کا قول ہے کہ ناکام شخص دراصل وہ ہے جس نے ایک غلطی کی مگر وہ اس قابل نہیں کہ اپنی غلطی سے تجربہ حاصل کر سکے:

A failure is a man who has blundered but is not able to cash in one the experience.

غلطی سے اگر آدمی سبق لے سکے تو وہ غلطی غلطی نہیں۔ غلطی دراصل وہ ہے جو آدمی کو سبق تک نہ پہنچائے، جو اس کے شعور میں اضافہ کا ذریعہ ثابت نہ ہو۔

۵ جولائی ۱۹۸۳

حضرت عمر فاروق اور حضرت عبد اللہ بن مسعود کے درمیان دو سو سے زیادہ مسائل میں اختلاف رائے تھا۔ دونوں اپنی اپنی رائے پر مصر بھی تھے۔ اس کے باوجود دونوں کے تعلق میں کوئی فرق نہیں آیا۔ حضرت عمر فرماتے تھے کہ "ابن مسعود علم و فقہ کا خزانہ ہیں" اور جب حضرت عمر شہید ہوئے تو حضرت عبد اللہ بن مسعود نے کہا: عمر اسلام کا مضبوط قلعہ تھے۔ جو اس میں داخل ہوتا وہ باہر نہ جاتا۔ جب وہ نہ رہے تو اسلام کے قلعہ میں دراڑ پڑ گئی۔

۶ جولائی ۱۹۸۳

امام احمد بن حنبل خون نکلنے کو ناقض وضو سمجھتے تھے۔ دوسری طرف امام مالک اور سعید بن مسیب کا یہ مسلک تھا کہ ایک شخص وضو کرے اور کسی وجہ سے اس کے بعد اس کے جسم سے خون نکل آئے تو وضو نہیں ٹوٹے گا، وہ اسی سابقہ وضو سے نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس اختلاف کی روشنی میں امام احمد بن حنبل سے پوچھا گیا کہ " اگر وضو کے بعد امام کے جسم سے خون نکل آئے اور وہ دوبارہ وضو کئے بغیر نماز پڑھائے تو کیا اس کے پیچھے نماز ادا کی جا سکتی ہے۔" امام احمد بن حنبل نے جواب دیا: میں مالک بن انس اور سعید بن المسیب کی اقتدا میں

کیسے نماز ادا نہ کروں۔

اسی طرح امام ابو یوسف خون نکلنے کی صورت میں وضو کے جاتے رہنے کے قائل تھے۔ ان کی موجودگی میں ہارون رشید نے نماز پڑھائی جب کہ اس نے وضو کے بعد پچھنا لگوایا تھا۔ مگر امام ابو یوسف نے اعتراض نہیں کیا۔ انھوں نے ہارون رشید کے پیچھے نماز ادا کر لی اور پھر اس کو نہیں دہرایا۔

اس سے اجتماعیت کا حکم معلوم ہوتا ہے۔ اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ "امام" سے اگر ایسا فعل صادر ہو جو مقتدی کے نزدیک نماز کو فاسد کر دینے والا ہو، تب بھی مقتدیوں کو اپنی نیت کے مطابق اس کے پیچھے نماز ادا کرنا چاہئے۔ حتی کہ بعد کو اپنی نماز کو دہرانا بھی نہیں چاہئے۔ کیوں کہ نماز کا دہرانا بھی غیر ضروری خلفشار کا باعث ہو سکتا ہے۔

۷ جولائی ۱۹۸۳

مولانا محمود حسن دیوبندی (۱۹۲۰ - ۱۸۵۱) کا ایک واقعہ مولانا اشرف علی تھانوی (۱۹۴۳-۱۸۶۳) نے لکھا ہے۔ یہ واقعہ انھیں کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

"مولانا ایک مرتبہ مراد آباد تشریف لے گئے تو وہاں کے لوگوں نے وعظ کہنے کے لئے اصرار کیا۔ مولانا نے عذر فرمایا کہ مجھے عادت نہیں ہے۔ مگر لوگ نہ مانے تو اصرار پر وعظ کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اور حدیث فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد پڑھی، اور اس کا ترجمہ یہ کیا کہ: ایک عالم شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ بھاری ہے۔ مجمع میں ایک مشہور عالم موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ترجمہ غلط ہے اور جس آدمی کو ترجمہ بھی صحیح نہ کرنا آوے اس کو وعظ کہنا جائز نہیں۔"

ترجمہ صحیح تھا، اور ان صاحب کا انداز بیان توہین آمیز ہی نہیں اشتعال انگیز بھی تھا۔ لیکن شیخ الہند یہ کہتے ہوئے بیٹھ گئے کہ ــــ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ مجھے وعظ کی لیاقت نہیں۔ مگر ان لوگوں نے نہیں مانا۔ خیر اب میرے پاس عذر کی دلیل بھی ہو گئی یعنی آپ کی شہادت۔

وعظ تو پہلے ہی مرحلہ میں ختم فرما دیا۔ اس کے بعد ان عالم صاحب سے بطرز استفادہ دریافت کیا کہ غلطی کیا ہے؟ تاکہ آئندہ بچوں۔ انھوں نے فرمایا کہ اشد کا ترجمہ اثقل (زیادہ بھاری) نہیں بلکہ اَضَرّ (زیادہ نقصان دہ) آتا ہے۔ شیخ الہند نے فرمایا کہ حدیث وحی میں ہے یاتینی مثل صلصلۃ الجرس و ھو اشد علیّ (کبھی مجھ پر وحی گھنٹیوں کی آواز کی طرح آتی ہے اور وہ مجھ پر سب سے زیادہ بھاری ہوتی

ہے) کیا یہاں بھی اُفتر کے معنی ہیں۔ اس پر وہ صاحب دم بخود رہ گئے۔ (ارواح ثلثہ صفحہ ۲۸۶)

۸ جولائی ۱۹۸۳

مغل سرائے شمالی ہند کا ایک بڑا ریلوے اسٹیشن ہے۔ یہاں دو انگریز پلیٹ فارم پر چل رہے تھے۔ پیچھے والے کے ہاتھ میں ایک ٹرنک تھا۔ اس نے تیز چلتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا تو اس کا ٹرنک اگلے انگریز سے ٹکرا گیا اور وہ گر پڑا۔ اس کے بعد جو واقعہ ہوا وہ صرف یہ کہ پیچھے والے مسافر نے کہا ساری (sorry) آگے والے مسافر نے کہا اوکے (O.K.)، اور پھر دونوں بدستور اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

غلطی کا اعتراف کر لینے سے معاملہ فوراً ختم ہو جاتا ہے، اور غلطی کا اعتراف نہ کرنے سے بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ فساد کا سبب بن جاتا ہے۔

۹ جولائی ۱۹۸۳

میں گھر کے اندر داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ چارپائی بچھی ہوئی ہے۔ بیٹی اس پر لیٹی ہے، اور ماں ایک طرف بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے کہا کہ ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا جو مسئلہ ہے اس کی حقیقت بس اتنی ہی ہے جو اس واقعہ میں نظر آتی ہے۔

چارپائی پر بیٹی لیٹی ہوئی ہے اور ماں بیٹھی ہے تو اس سے کوئی بگاڑ پیدا نہیں ہوا۔ لیکن اگر لیٹنے والی بہو ہو اور بیٹھنے والی ساس ہو تو گھر میں طوفان برپا ہو جائے گا۔ ہندستان کے مسلمانوں نے اپنے اور ہندوؤں کے درمیان ساس اور بہو والا رشتہ قائم کیا۔ اسی بنا پر سارے جھگڑے ہیں۔ مسلمان اگر اپنے اور ہندوؤں کے درمیان ماں اور بیٹی والا رشتہ قائم کرتے تو کوئی جھگڑا نہ ہوتا اور سارا معاملہ بالکل درست رہتا۔

۱۰ جولائی ۱۹۸۳

غالباً ۱۹۶۵ کی بات ہے۔ میں لکھنؤ میں حضرت گنج کے قریب ایک سڑک پر چل رہا تھا۔ میں ایک موڑ پر پہنچا تو دیکھا کہ ایک نوجوان تیزی سے سائیکل دوڑاتا ہوا آیا اور عین موڑ پر ایک راہگیر سے ٹکرا گیا۔ سائیکل رک گئی اور راہگیر بھی سڑک پر گر پڑا۔ اس کے بعد دونوں میں جو گفتگو ہوئی وہ یہ تھی:

"گھنٹی کیوں نہیں بجائی" راہگیر نے کہا۔

" گھنٹی نہ ہو تو " نوجوان نے جواب دیا۔

" بریک کیوں نہیں لگایا "

" بریک نہ ہو تو "

" جب تمہارے پاس گھنٹی نہیں، تمہارے پاس بریک نہیں تو پھر تیز کیوں دوڑاتے ہو۔"

" کیا تم سے پوچھ کر دوڑاؤں۔"

آدمی اگر ماننا نہ چاہے تو کوئی دلیل اس کو چپ نہیں کر سکتی، خواہ وہ دلیل بذات خود کتنی ہی معقول اور مدلل کیوں نہ ہو۔

۱۱جولائی ۱۹۸۳

۱۹۵۶ میں رامپور جانے سے پہلے تک میں اپنے بڑے بھائی عبدالعزیز خاں کے ساتھ رہتا تھا۔ میں " بیوی بچوں والا " ہو چکا تھا، مگر اب تک میں نے کوئی معاشی کام نہیں کیا تھا۔ چنانچہ میرے بارہ میں عجیب عجیب تبصرے کئے جاتے تھے۔

ہمارے گھر پر یہ طریقہ تھا کہ گیہوں کا آٹا چھان کر اس کی بھوسی نکال جاتی تھی اور پھر میدے کی روٹی پکتی تھی۔ میں اس کا مخالف تھا۔ میں کہتا تھا کہ گیہوں کو چھانے بغیر اس کی روٹی پکائی جائے۔ جب گھر والے اس پر عمل نہ کرتے تو میں چوکر کی روٹی پکوا کر اس کو کھاتا تھا۔ اقبال احمد سہیل مرحوم کے زراعتی منیجر بھارت (وفات) سے میری والدہ نے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا: "بھوسی چوکر کھا کر کمانے سے چھٹی نہیں ملے گی۔" ان کے نزدیک میرا یہ طریقہ نہ کمانے کی تلافی کے لئے تھا۔

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو مجھے " پاگل " کہتے تھے۔ ڈاکٹر مقبول احمد (ایف آر سی ایس) نے میرے حالات سنے تو کہا کہ ان کی اپنی زندگی تو بھائی کے ساتھ گزر جائے گی، مگر اس کے بعد ان کے بچوں کا کیا ہوگا۔

غالباً ۱۹۵۳ کی بات ہے۔ اس وقت میں اعظم گڈھ (باقی منزل) میں اپنے بڑے بھائی عبدالعزیز خاں کے ساتھ رہتا تھا۔ شاہ فیضان احمد وکیل کی بہن رضیہ خاتون ( ) میری بیوی سے ملنے کے لئے کبھی کبھی آتی تھیں۔ ایک روز انھوں نے بیوی سے میرے بارہ میں کہا کہ وہ کچھ کام نہیں کرتے پھر آپ کا اور بچوں کا کیا ہوگا۔ میری بیوی نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے کہا کہ رضیہ خاتون کو میری طرف

سے یہ جواب دے دو کہ —— یہ کشتی اپنے تمام سواروں سمیت بس اللہ کے حوالے ہے۔

۱۳ جولائی ۱۹۸۳

انگریزی کا ایک مقولہ ہے کہ سیاست ممکن کا فن ہے:

Politics is the art of possible.

یعنی سیاست ناممکن چیزوں کے پیچھے دوڑنے کا نام نہیں۔ حقیقی سیاست یہ ہے کہ جو چیز فی الواقع ممکن اور قابل حصول ہو، اس کو نشانہ بناکر اس کے لئے جدوجہد کی جائے۔ یہ بات بظاہر بہت سادہ سی ہے مگر وہ نہایت اہم ہے۔ اس دنیا میں اکثر اقدامات کی ناکامی کا سبب یہی ہوتا ہے کہ جوش اور اولوالعزمی کے تحت لوگ ایک نعرہ کے پیچھے دوڑ پڑے۔ مگر جب ان کی دوڑ اپنے آخری انجام پر پہنچی تو معلوم ہوا کہ جس چیز کو نشانہ بناکر وہ دوڑے تھے، وہ اسباب کی اس دنیا میں ان کے لئے قابل حصول ہی نہ تھی۔

۱۳ جولائی ۱۹۸۳

۱۹۵۶ میں جماعت اسلامی ضلع اعظم گڈھ وجونپور کے متفقہ فیصلہ کے تحت مجھ کو اعظم گڈھ اور جونپور کا ناظم منتخب کیا گیا تھا۔ میں نے دونوں ضلعوں میں کام کو از سر نو منظم کرنے کا ایک منصوبہ بنایا۔ اس میں دوسری چیزوں کے ساتھ یہ بھی شامل تھا کہ نظامت کے لئے ایک جیپ خریدی جائے اور اس کے ذریعہ دونوں ضلعوں میں کام کو آگے بڑھایا جائے۔ جب میں نے اجتماع میں یہ تجویز پیش کی تو وہی لوگ اس تجویز کے مخالف ہو گئے جنھوں نے متفقہ رائے سے مجھے ناظم بنایا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ صرف تجویز کو منظور کر دیں۔ میں آپ لوگوں سے اس کے لئے کوئی رقم نہیں مانگوں گا۔ آپ لوگوں پر کسی قسم کا مالیاتی بوجھ ڈالے بغیر انشاءاللہ میں اس کو حاصل کر لوں گا۔ اور اس تجویز کو زیر عمل لاؤں گا۔ مگر لوگ بدستور اس تجویز کے مخالف بنے رہے۔

یہ میری زندگی کا پہلا واقعہ تھا جب مجھے احساس ہوا کہ میرے جیسے آدمی کے لئے جمہوری ڈھانچہ میں کام کرنا سخت مشکل ہے۔ اس کے بعد مزید کئی تجربے ہوئے۔ شعبۂ تصنیف جماعت اسلامی ہند، رام پور، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، الجمعیۃ ویکلی دہلی سے تعلق کے دوران یہ رائے مزید پختہ ہو گئی اور مجھ پر آخری طور پر یہ بات واضح ہو گئی کہ کوئی زندہ آدمی جمہوری ڈھانچہ میں رہ کر دیانت دارانہ طور پر کام نہیں کر سکتا۔

اسی تجربہ کا یہ نتیجہ تھا کہ جب بھوپال میں اسلامی مرکز کا پہلا اجتماع (اپریل ۱۹۸۲) ہوا اور وہاں ڈاکٹر محسن عثمانی نے اسلامی مرکز کو جمہوری انداز میں تشکیل دینے کی تجویز پیش کی تو اگرچہ اس وقت میں اسپتال سے اٹھ کر گیا تھا اور الکٹرک برن کی وجہ سے گویا میں قبر کے کنارے کھڑا ہوا تھا، میں نے کہا کہ اسلامی مرکز کو جمہوری انداز میں نہیں چلایا جا سکتا۔ اسلامی مرکز کا نظام تبلیغی جماعت کے انداز پر ہوگا جو تمام تر شخصی اعتماد کی بنیاد پر چلائی جا رہی ہے۔ جو لوگ جمہوریت چاہتے ہوں انھیں اپنے بارہ میں خود فیصلہ کرنا چاہئے نہ یہ کہ وہ ہم سے جمہوری طریقہ اختیار کرنے کا مطالبہ کریں۔

۱۴ جولائی ۱۹۸۳

ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ کسی زنجیر کی مضبوطی اس کی کمزور ترین کڑی کے ذریعہ جانچی جاتی ہے :

The strength of the chain is tested through its weakest link.

کسی زنجیر کی تمام کڑیاں مضبوط ہوں اس کی صرف ایک کڑی کمزور ہو تو زنجیر وہیں سے ٹوٹ جائے گی۔ اور پھر اس کا وہی انجام ہوگا جو تمام کڑیوں کی کمزوری کی صورت میں ہوتا۔ اس مثال پر اجتماعی اقدام کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اجتماعی اقدام میں جماعت کے تمام افراد کو دیکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ ایک شخص بھی اگر کمزوری دکھائے تو اس کے نتیجہ میں پوری جماعت برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔

۱۵ جولائی ۱۹۸۳

جمعہ کی نماز پڑھ کر میں واپس ہو رہا تھا۔ مسجد کے صحن میں پہنچا تھا کہ ایک لڑکے نے روک کر پوچھا : "جمعہ کی نماز چودہ رکعت ہوتی ہے"۔ میں نے سوچا کہ موجودہ زمانہ میں "مسائل" والی شریعت کا اتنا غلبہ ہوا ہے کہ لوگ رکعتوں کی تعداد پوری کرنے کو نماز سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ نماز میں اصل چیز یاد خداوندی ہے نہ کہ رکعتوں کی تعداد۔

۱۶ جولائی ۱۹۸۳

بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں اپنی امت کے لئے مشقت نہ سمجھتا تو ان کے لئے فرض قرار دے دیتا کہ وہ ہر نماز کے وقت مسواک کیا

کریں (لولا ان اَشُقَّ علی امتی لامرتہم بالسواک مع کل صلوٰۃ) ایک اور روایت حضرت عائشہ سے نسائی نے نقل کیا ہے کہ مسواک کرنا منہ کے لئے صفائی ہے اور رب کو راضی کرنا ہے (السواک مَطْهَرَةٌ للفَم، مرضاةٌ للرب)

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے دنیا اور آخرت دونوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے۔ آدمی جب مسواک کرتا ہے تو اس سے اس کے منہ اور دانت کی صفائی ہوتی ہے۔ وہ دانت کی بیماریوں سے بچ جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی مومنانہ نفسیات کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ مسواک سے اپنا دانت صاف کر رہا ہوتا ہے تو طرح طرح سے اس کو اللہ کے انعامات اور اس کی حکمتوں کی یاد آتی رہتی ہے۔ یہ چیز اس کے مسواک کے عمل کو رضاء الٰہی کا ذریعہ بنا دیتی ہے۔

۱۷ جولائی ۱۹۸۳

موجودہ مسلمانوں کے بارہ میں میرا تجربہ یہ ہے کہ وہ ایک زوال یافتہ قوم ہیں۔ ان سے ایک شخص کو "موت" کا تجربہ ہوتا ہے، مگر ان سے "زندگی" کا تجربہ نہیں ہوتا۔

موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ اگر انھیں کسی کے خلاف جھوٹا الزام لگانا ہو تو ان کو اتنے زیادہ الفاظ مل جائیں گے جیسے وہ لفظوں کے بادشاہ ہیں۔ مگر جب ان کی بات کو دلیل سے غلط ثابت کر دیا جائے اور وہ وقت آجائے جب کہ انھیں کھلے طور پر اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہئے تو وہ ایسے ہو جائیں گے جیسے کہ ان کے پاس الفاظ ہی نہیں، جیسے کہ وہ اچانک گونگے ہو گئے ہیں اور اسی کے ساتھ بہرے بھی۔

۱۸ جولائی ۱۹۸۳

عربی کا ایک مثل ہے کہ اَلغُنمُ بالغُرمِ (غنیمت تاوان پر ہے) یعنی اس دنیا میں پہلے نقصان اٹھانا پڑتا ہے، پھر فائدہ ملتا ہے۔ حتی کہ اس میں بالکل برابری کا اصول ہے۔ کوئی شخص جتنا نقصان اٹھائے گا، اسی کے بقدر اس کے لئے فائدہ کا استحقاق پیدا ہوگا۔

قدیم انسان کو دو ہزار سال پہلے زندگی کے تجربات نے زندگی کی یہ حقیقت بتا دی تھی۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ نہ دوسروں کی تاریخ انھیں یہ بات بتانے والی ثابت ہوئی اور نہ خود اپنے حالات سے وہ اس کو جان سکے۔

۱۹ جولائی ۱۹۸۳

حدیث میں آیا ہے کہ اگر قیامت برپا ہو جائے اور تم میں سے کسی شخص کے ہاتھ میں ایک پودا ہو تو چاہئے کہ وہ زمین میں اس پودے کو لگا دے (ان قامتِ القیامۃُ وبیدِ احدکم فسیلۃٌ فلیغرسہا)

اس حدیث کو اگر کوئی شخص بالکل لفظی مفہوم میں لے لے تو حدیث اس کے لئے بے معنی ہو جائے گی۔ کیونکہ وہ اس کو قیامت سے متعلق سمجھے گا۔ اور قیامت کا معاملہ یہ ہے کہ جب وہ آئے گی تو کسی کو یہ ہوش ہی نہیں رہے گا کہ وہ زمین میں گڑھا کھودے اور وہاں ایک پودا لگائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں اِن قامتِ القیامۃ کا لفظ تاکید کے لئے ہے۔ اس میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تم دوسروں کے لئے نفع بخش بنو، حتی کہ تمہارے پاس اگر زندگی کا آخری لمحہ ہو تو اس وقت بھی یہ کوشش کرو کہ تم ایک ایسا "درخت" لگا دو جو تمہارے بعد لوگوں کو پھل اور سایہ دیتا رہے۔

۲۰ جولائی ۱۹۸۳

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں ۹ھ کو عام الوفود (وفد کا سال) کہا جاتا ہے۔ رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تھا۔ اس کے بعد ۹ھ میں عرب قبائل کے وفود کثرت سے اسلام قبول کرنے کے لئے مدینہ آئے۔ اس بنا پر اس سال کو عام الوفود کہا جانے لگا۔ ابن سعد کے بیان کے مطابق ان وفود کی تعداد ۷۲ تھی۔

فتح مکہ کے بعد عرب کے قبیلے کیوں اتنی کثرت سے اسلام میں داخل ہو گئے، اس کی وجہ عمرو بن سلمہ کی ایک روایت میں ان الفاظ میں ملتی ہے:

كانت العربُ تَلَوَّمُ باسلامهم الفتح فيقولون اتركوه وقومه فانه ان ظهر عليهم فهو نبي صادق فلما كانت وقعة الفتح بادر كل قوم باسلامهم وبادر قومي باسلامهم

(بخاری، کتاب المغازی)

عرب فتح کے انتظار کی بنا پر اپنے اسلام میں دیر کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ محمد کو اور ان کی قوم کو چھوڑ دو۔ اگر محمد ان پر غلبہ حاصل کر لیں تو وہ سچے پیغمبر ہیں۔ چنانچہ جب مکہ فتح ہو گیا تو ہر قبیلہ اسلام قبول کرنے کے لئے دوڑ پڑا، اور میرا قبیلہ بھی تیزی سے اسلام میں داخل ہو گیا۔

یہ عرب کے مشرک قبائل کا حال تھا۔ مگر اسی ملک میں یہودی قبائل تھے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی فتح کو دیکھنے کے باوجود آپ کی رسالت پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ ایک طرف عرب قبائل فتح کو دیکھ کر آپ پر ایمان لانے کے لئے دوڑ رہے تھے، دوسری طرف اسی ملک کے یہود اور منافقین یہ یہ سازش کر رہے تھے کہ آپ کی فتح کو بے قیمت کر کے دوبارہ آپ کو شکست اور ناکامی سے دوچار کر دیں۔

یہ جاندار اور بے جان انسان کا فرق ہے۔ جاندار انسان بھی حق کی مخالفت کرتا ہے اور بے جان انسان بھی۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ جاندار انسان کی مخالفت کی حد آجاتی ہے مگر بے جان انسان کی کبھی حد نہیں آتی۔ امر حق کتنا ہی زیادہ واضح ہو جائے، بے جان انسان اپنی مخالفت پر بدستور قائم رہتا ہے۔ اس کی مخالفت اور اس کے عناد کو موت کے فرشتہ کے سوا کوئی اور ختم کرنے پر قادر نہیں۔

۲۱ جولائی ۱۹۸۳

لوئی فشر نے لکھا ہے کہ انتہا پسند ہندو (مدن لال، گوڈسے) اور ان کے ساتھی جنھوں نے مہاتما گاندھی کو قتل کیا، وہ امید رکھتے تھے کہ گاندھی کی موت ہندستان کے دوبارہ تشدد دانہ اتحاد کی طرف پہلا قدم ہو سکتی ہے۔ انھوں نے چاہا تھا کہ ان کو راستہ سے ہٹا کر مسلمانوں کو بے یار و مددگار بنا دیں۔ مگر وہ اس بات کو سمجھ نہ سکے کہ گاندھی کا قتل الٹا نتیجہ برآمد کرے گا، کیوں کہ اس سے ملک پر یہ ظاہر ہو جائے گا کہ انتہا پسند اینٹی مسلم کس قدر زیادہ خطرناک اور قابو سے باہر لوگ ہیں:

They seemed to hope that the death of Gandhi might be the first step toward the violent reunification of India. They wished, by removing him, to make the Moslems defenseless, little realizing that his assassination would have the opposite effect by showing the country how dangerous and undisciplined extreme anti-Moslems could be.

Louis Fischer, *The Life of Mahatma Gandhi*
New York, 1983, p. 504-505

انتہا پسندانہ اقدام ہمیشہ الٹا نتیجہ پیدا کرتا ہے، اور اس الٹے نتیجہ کے شکار سب سے زیادہ وہی لوگ ہوتے ہیں جنھوں نے جھوٹی خوش فہمیوں کے تحت اپنا انتہا پسندانہ اقدام کیا تھا۔

۲۲ جولائی ۱۹۸۳

اقبال کا ایک مشہور شعر ہے جس کو اکثر مسلمان اعاغزوا کا بر دہراتے ہیں۔ اس میں مرد مومن کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جب اس کی موت کا وقت آتا ہے تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے

لگتی ہے:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم　　　چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

یہ بلاشبہ ایک شاعرانہ تخیل ہے، اس کا ایمان و اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ مردِ مومن کا حقیقی نمونہ پیغمبر اور اصحاب پیغمبر تھے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا اور کسی پیغمبر کے بارہ میں یہ ثابت نہیں کہ ان کی موت کا لمحہ آیا تو وہ ہنسنے لگے۔ اسی طرح اصحاب کرام میں سے کسی کے بارہ میں اس قسم کی روایت مستند کتابوں میں موجود نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موت کا لمحہ مومن کے لئے فکرمندی کا لمحہ ہے نہ کہ ہنسی اور مسکراہٹ کا لمحہ۔

موجودہ مسلمانوں کا ذہن بگاڑنے میں سب سے زیادہ جن لوگوں کا دخل ہے وہ شاعر اور خطیب اور انشاپرداز قسم کے "مفکرین" ہیں جو موجودہ زمانہ میں کثرت سے پیدا ہوئے۔ ان لوگوں کے کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ وہ قرآن و سنت کے مطابق مسلمانوں کی ذہنی تعمیر کریں، مگر انھوں نے نہایت "مخلصانہ" طور پر صرف مسلمانوں کی ذہنی تخریب کا کام انجام دیا ہے۔

۲۳ جولائی ۱۹۸۸

حضرت ابو بکر صدیق جب خلیفہ منتخب ہوئے تو انھوں نے مدینہ کی مسجد میں لوگوں کو جمع کرکے خطبہ دیا۔ اس خطبہ میں آپ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

ایھا الناس قد ولیت علیکم ولست بخیرکم فان احسنت فاعینونی وان اسأت فقومونی والضعیف فیکم قوی عندی حتی آخذ لہ حقہ والقوی ضعیف عندی حتی آخذ لہ الحق (الکامل لابن الاثیر)

اے لوگو، میں تمہارے اوپر حاکم بنایا گیا ہوں۔ مگر میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا عمل کروں تو تم میری مدد کرو اور اگر میں برا عمل کروں تو تم مجھے سیدھا کردو۔ اور تمہارا کمزور میرے نزدیک طاقت ور ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق اسے دلا دوں۔ اور تمہارا طاقت ور میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے حق لے لوں۔

حاکم کو کیسا ہونا چاہئے، اس کی تشریح اس سے بہتر الفاظ میں نہیں کی جا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی قسم کے افراد کا نام "اسلامی حکومت" ہے۔ اگر اس قسم کے افراد نہ ہوں تو اسلامی حکومت کے قیام

کا کوئی سوال نہیں۔

۲۴ جولائی ۱۹۸۳

ابن تیمیہ نے اپنی کتاب منہاج السنۃ (جلد اول، صفحہ ۴۴) میں لکھا ہے کہ صوفیا و مشائخ کی اکثریت کہتی ہے کہ ولی محفوظ ہوتا ہے اور پیغمبر معصوم ہوتا ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ اگرچہ زبان سے ایسا نہیں کہتے مگر ان کی حالت عملاً انھیں لوگوں جیسی ہے جن کا خیال ہے کہ شیخ یا ولی نہ غلطی کرتے اور نہ گناہ کرتے (والغالبیۃ فی المشائخ قد یقولون ان الولی محفوظ والنبی معصوم وکثیر منھم ان لم یقل ذالک بلسانہ فحالہ حال من یری ان الشیخ او الولی لا یخطی ولا یذنب)

دوسرا گروہ جس کا ذکر ابن تیمیہ نے کیا ہے، وہ پہلے گروہ سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ کم از کم موجودہ زمانہ میں تو یہ حال ہے کہ ۹۹ فی صد سے بھی زیادہ لوگ اسی گروہ میں شامل ہیں۔ اور اس کی پہچان یہ ہے کہ ان میں سے کسی کے خلاف اگر تنقید کر دی جائے تو تنقید خواہ کتنی ہی زیادہ علمی کیوں نہ ہو، زیر تنقید بزرگ اور ان کے معتقدین کا پورا حلقہ ناقد کا ازلی دشمن بن جائے گا۔

میرا اپنا تجربہ ان لوگوں کے بارہ میں یہی ہے۔ میں نے جب بھی ان بزرگوں میں سے کسی بزرگ پر تنقید کی تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میری تنقید کو خالص دلائل کے اعتبار سے دیکھا جائے۔ ہمیشہ اس کو اس نظر سے دیکھا گیا ہے کہ اس میں ہمارے "بڑوں" پر تنقید ہے۔ موجودہ زمانہ میں کسی شخص کا سب سے بڑا جرم مسلمانوں کی نظر میں یہ ہے کہ وہ ان کے بڑوں پر تنقید کر دے۔ یہ لوگ زبان سے اپنے بڑوں کو محفوظ یا معصوم نہیں کہتے۔ مگر ان کا عمل یہی بتاتا ہے کہ وہ ان کو محفوظ اور معصوم قرار دئے ہوئے ہیں۔

۲۵ جولائی ۱۹۸۳

محمد بن سعید بوصیری (۶۹۷ - ۶۰۸) مصر کے ایک صوفی بزرگ تھے۔ ان کے عربی اشعار کا دیوان چھپا ہے جو پورا کا پورا نعتیہ کلام پر مشتمل ہے۔ ان کی ایک نعتیہ نظم "قصیدہ بردہ" کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے کئے گئے اور ۲۰ سے زیادہ اس کی شرحیں لکھی گئیں۔ قصیدہ بردہ کے بارہ میں بہت سی طلسماتی کہانیاں مشہور ہیں جنھوں نے اس کی مقبولیت میں مدد دی ہے۔ بہت سے لوگ اس کو ورد کے طور پر پڑھتے ہیں اور برکت کے لئے اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

اس کی مقبولیت کے باعث بہت سے لوگوں نے قصیدہ بردہ کے انداز میں قصیدے لکھے اور بہت سے لوگوں نے اس کی تضمین کی۔ محمد مصری نے "تسبیع" کے انداز میں ایک نظم لکھی ہے (تسبیع کا مطلب ہے پانچ مصرعے بڑھا کر ہر بند کو سات مصرعے کا بند بنانا)، اس کا ایک شعر یہ ہے:

محمد جاء بالآيات والحكم مبشراً ونذيراً لجملة الامم

محمد نشانیاں اور حکمتیں لے کر آئے، خوش خبری دینے والے اور تمام قوموں کو ڈرانے والے۔

اس شعر میں جو بات کہی گئی ہے وہ نہایت صحیح ہے۔ اس کے باوجود موجودہ زمانہ کے مسلمان انذار وتبشیر کے دعوتی عمل سے اتنا دور ہیں کہ ان کے اکابر تک اس کی اہمیت سے واقف نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ قسم کی بات کو مسلمان محض بطور فخر کہتے ہیں۔ اور جو بات بطور فخر کہی جائے، اس سے لوگوں کو فخر کی غذا تو مل سکتی ہے، مگر اس سے ان کے اندر عمل کی تحریک نہیں ہو سکتی۔

۲۶ جولائی ۱۹۸۳

برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell) نے کہا ہے کہ خوشی کو پانے کی ناگزیر شرط یہ ہے کہ آپ جو کچھ چاہتے ہیں، ان میں سے کچھ چیزوں کے بغیر آپ رہنے پر راضی ہو جائیں:

> To be without some of the things you want is an indispensable part of happiness.

یہ وہی بات ہے جس کو مذہب میں قناعت کہا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس دنیا میں خوشی اور ذہنی سکون کو پانے کا واحد راز یہ ہے کہ آدمی پائی ہوئی چیز پر راضی ہو جائے اور جو چیز اس کو نہیں ملی، اس کو فراموشی کے خانہ میں ڈال دے۔

۲۷ جولائی ۱۹۸۳

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رُبَّ تال یتلوا القرآن والقرآن یلعنہ (بہت سے قرآن کی تلاوت کرنے والے ایسے ہیں کہ وہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں حالاں کہ قرآن ان پر لعنت کر رہا ہوتا ہے)

یہ کون لوگ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کو کتاب تلاوت تو بناتے ہیں مگر وہ اس کو اپنے لئے کتاب ہدایت نہیں بناتے۔ جو دوسروں کو زیر کرنے کے لئے تو قرآنی آیتوں کے حوالے دیتے ہیں مگر خود

اپنے آپ کو قرآنی احکام کے آگے نہیں جھکاتے۔ جو قرآن کے نام پر اعزاز حاصل کرنے کے لئے تو دوڑتے ہیں مگر قرآن کی خاطر چھوٹا بننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ جو قرآن کو دوسروں کے اوپر لیڈری حاصل کرنے کا ذریعہ تو بناتے ہیں مگر خود اپنے آپ کو قرآن کا پیرو بنانے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔ جو انسانوں کے سامنے تو قرآن والا بننے کا کریڈٹ لیتے ہیں مگر فرشتوں کے سامنے قرآن والا بننے کی توفیق انھیں حاصل نہیں ہوتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے قرآن کو پڑھا، مگر انھوں نے قرآن کو نہیں پایا۔

۲۸ جولائی ۱۹۸۳

ڈاکٹر حمید اللہ (مقیم پیرس) نے لکھا ہے کہ یورپ کے مستشرقین نے ۴۲ ہزار قرآنی نسخے جمع کئے اور ان کے فوٹو لے کر شروع سے آخر تک ان کا تقابل کیا۔ ان نسخوں میں چھپے ہوئے نسخے بھی تھے اور ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخے بھی۔ اور وہ دنیا کے مختلف علاقوں سے حاصل کئے گئے تھے۔ مگر تقابل میں بعض معمولی سہو کتابت کے سوا نفس روایت میں کوئی اختلاف یا فرق نہیں ملا۔

تاشقند کے میوزیم میں قرآن کا ایک قدیم نسخہ ہے جو پتلی جھلی پر کوفی خط میں لکھا ہوا ہے۔ اس نسخہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت عثمان (جامع القرآن) کے زمانہ کا ہے۔ اس نسخہ میں آیت فسیکفیکھم اللہ پر خون کے دھبے ہیں جو حسب روایت حضرت عثمان کی شہادت کے وقت اس پر پڑے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ مذکورہ نسخہ عین وہی نسخہ نہ ہو جو حضرت عثمان کے زیر تلاوت تھا اور کسی اور شخص نے اپنے نسخہ میں تیمناً مذکورہ آیت پر اصل کے مطابق دھبے ڈال دئے ہوں۔ تاہم روسی سائنسدانوں نے ریڈیو کاربن کے کیمیائی طریقہ کو استعمال کرکے اس نسخہ کا زمانہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ سائنسی تجربہ کے مطابق اس قرآنی نسخہ کی قدامت خلیفہ سوم حضرت عثمان کے زمانہ تک پہنچتی ہے۔ تاشقند کے اس نسخہ کا تقابل موجودہ قرآنی نسخوں سے کیا گیا۔ مگر دونوں میں کوئی فرق نہیں ملا۔

قرآن دور پریس سے ہزار سال پہلے اترا۔ مگر آج تک اس میں کوئی ادنیٰ فرق بھی پیدا نہ ہو سکا۔ یہ ایسا نادر استثناء ہے جو قدیم کتابوں میں سے کسی بھی دوسری کتاب کو حاصل نہیں۔

۲۹ جولائی ۱۹۸۳

دانش مند وہ ہے جو ایک چیز اور دوسری چیز میں فرق کو جانے۔ یہی کامیابی کا راز ہے۔ اس دنیا میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو حقیقی مسئلہ اور غیر حقیقی مسئلہ میں فرق کرے۔ وہ حقیقی مسئلہ پر پوری توجہ

دیتے ہوئے غیر حقیقی مسئلہ کو نظر انداز کر دے۔

۳۰ جولائی ۱۹۸۳

محمد بن اسحاق تابعی (۱۵۰-۸۵ھ) قدیم ترین سیرت نگار ہیں۔ ان کی اصل کتاب اگرچہ اب موجود نہیں، مگر ابن ہشام کی موجودہ سیرت میں ان کی پوری کتاب شامل ہے۔

ابن اسحاق علم الانساب کے بہت بڑے ماہر تھے۔ وہ امام مالک کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے اپنی معلومات کے مطابق، امام مالک کے بارہ میں یہ کہہ دیا کہ وہ قبیلہ ذی اصبح کے آزاد کردہ غلاموں میں سے ہیں۔ مگر خود امام مالک اپنے آپ کو حمیر کی شاخ اصبح میں سے خیال کرتے تھے۔ اس اختلاف کی بنا پر دونوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی۔

امام مالک نے جب حدیث کی کتاب موطا تیار کی تو کہا جاتا ہے کہ محمد بن اسحاق نے کہا کہ اس کو میرے پاس لے آؤ، اس کا معالج میں ہوں (ایتونی بہ فانا بیطارہ) یہ بات امام مالک تک پہنچی تو وہ سخت برہم ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ وہ دجالوں میں سے ایک دجال ہے، یہود سے روایتیں نقل کرتا ہے (ھذا دجال من الدجالۃ یروی عن الیھود) ابن حبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے کہ محدثین کو محمد بن اسحاق پر یہ اعتراض تھا کہ خیبر، قریظہ، نضیر کی جنگوں کے حالات وہ ان یہودیوں کی اولاد سے لے کر کتاب میں درج کرتے تھے جن کے آباء واجداد مسلمان ہو گئے تھے۔ اور چونکہ یہ باتیں انھوں نے یہود سے سنی ہوں گی اس لئے ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

امام مالک نے ابن اسحاق کی تردید میں جو الفاظ کہے، وہ تنقید سے بھی آگے گئے ہیں۔ مگر اتنی سخت تنقید کے باوجود کسی نے اس کو برا نہیں مانا۔ دور اول میں جب مسلمان زندہ تھے تو اس قسم کا اختلاف رائے یا تنقیدیں عام تھیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان تنقید کو برداشت نہیں کر پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بالکل مردہ ہو چکے ہیں، ان کے اندر زندگی کی قسم کی کوئی چیز باقی نہیں۔

۳۱ جولائی ۱۹۸۳

کچھ لوگ ملاقات کے لئے آئے تھے۔ میں اپنے کمرہ میں ان سے گفتگو کر رہا تھا۔ درمیان میں کسی ضرورت کے تحت کمرہ سے باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ میری لڑکی فریدہ خانم دروازہ کے پیچھے زمین میں بیٹھی ہوئی گفتگو کو سن رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ اکثر ایسا ہی کرتی ہے۔ جب لوگ مجھ سے ملنے کے لئے آتے ہیں اور میں ان سے

گفتگو کرتا ہوں تو وہ دروازے کے پیچھے بیٹھ کر پوری گفتگو کو انہماک کے ساتھ سنتی ہے۔

میری باتوں کو اتنا زیادہ شوق اور دلچسپی کے ساتھ سننے اور سمجھنے والا میں نے اپنے تمام جاننے والوں میں صرف فریدہ خانم کو پایا ہے۔ اس کو میرے مشن سے انتہائی قلبی تعلق ہے۔ میری باتوں کو بے حد توجہ سے سنتی ہے اور لفظ لفظ کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس نے میرے مشن کو نہایت گہرائی کے ساتھ سمجھا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کو جانچنے کے لئے میں اس سے کوئی سوال کرتا ہوں۔ بیشتر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس سوال کا عین وہی جواب دیتی ہے جو میرے ذہن میں ہوتا ہے۔ مشن سے گہرے تعلق کی بنا پر اس کے اندر یہ فکری ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہے۔

یکم اگست ۱۹۸۴

ایک مدرسہ کے جلسہ میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ یہاں ایک "عرب" کی تقریر تھی۔ وہ سعودی شیخ کے لباس میں اسٹیج پر آئے اور عربی زبان میں تقریر شروع کی۔ ساتھ ساتھ ایک صاحب ان کی عربی تقریر کا اردو ترجمہ کرتے جارہے تھے۔ لباس کے اعتبار سے وہ پورے عرب دکھائی دے رہے تھے۔ تاہم ان کا لہجہ عربوں جیسا نظر نہیں آتا تھا۔

تقریر کے بعد وہ ڈائس پر میرے قریب آکر بیٹھ گئے۔ انھوں نے عربی میں گفتگو شروع کی اور اس دوران میری بعض اردو کتابوں کا ذکر کیا۔ میں نے پوچھا کہ یہ کتابیں تو اردو زبان میں ہیں، پھر آپ کیوں کر ان سے واقف ہوئے۔ اب انھوں نے اپنا مکھوٹا (mask) اتار دیا اور صاف اردو میں بولتے ہوئے کہا کہ میں تو ایک ہندستانی ہوں۔ عرب میں میری تعلیم ہوئی ہے۔ منتظمین جلسہ نے بعض عرب شیوخ کو دعوت نامے بھیجے تھے اور پوسٹروں میں اعلان کر دیا تھا کہ ان کے جلسہ میں عرب کے شیوخ آئیں گے۔ مگر اتفاق سے کوئی شیخ نہ آسکا۔ اب عوام کی بھیڑ کو مطمئن کرنے کے لئے یہ طے کیا گیا کہ میں عربی لباس کے ساتھ اسٹیج پر آؤں اور عربی میں تقریر کروں۔ اور میری تقریر کا اردو میں ترجمہ کر دیا جائے۔

یہ اس مدرسہ کا حال ہے جہاں اتفاق سے عرب شیوخ نہ آسکے۔ مگر جہاں واقعۃً عرب شیوخ آتے ہیں وہاں کا حال بھی مزاج کے اعتبار سے مذکورہ مدرسہ سے کچھ مختلف نہیں۔ اصل چیز ہے عرب چہروں کے ذریعہ عوام کی بھیڑ جمع کرنا، اور وہ دونوں جگہ یکساں طور پر موجود ہے۔

۲ اگست ۱۹۸۳

ڈیڑھ سو سال پہلے جب عوام نے لوہے کی پٹری پر ریلوے ٹرین کو دوڑتے ہوئے دیکھا تو اس کا نام انھوں نے لوہے کا گھوڑا (Iron horse) رکھ دیا۔ اسی طرح پچاس پہلے جب دیہات کے لوگوں نے فضا میں ہوائی جہاز کو اڑتے ہوئے دیکھا تو کہا کہ یہ لوہے کی چڑیا (Iron bird) ہے۔

آدمی اپنی معلوم چیز پر غیر معلوم چیز کو قیاس کرتا ہے۔ فرض کیجئے کہ لوگوں کو ٹرین کا اور ہوائی جہاز کا پہلے سے علم ہوتا مگر وہ گھوڑے اور چڑیے سے بے خبر ہوتے۔ اب اگر اچانک انھیں ایک گھوڑا دوڑتا ہوا دکھائی دیتا تو شاید وہ اس کو "ریل گھوڑا" کہتے، اور اگر وہ اچانک ایک چڑیا فضا میں اڑتی ہوئی دیکھتے تو وہ اس کو "جہازی چڑیا" کہنا پسند کرتے۔

یہی انسان کی اصل کمزوری ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی معلومات کے دائرہ میں رائے قائم کرتا ہے۔ اور چوں کہ انسان کی معلومات محدود ہیں، اکثر وہ غلطیوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ عام حالات میں انسان کو اس کے لئے معذور قرار دیا جاسکتا ہے۔ تاہم جب معاملہ کسی کے خلاف رائے قائم کرنے کا ہو تو اس کو حد درجہ محتاط ہونا چاہئے۔ ورنہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص جس نے صرف ایکسپلائٹیشن (Exploitation) کے ذریعہ کامیابی کا تجربہ کیا ہو، وہ دوسرے کو کامیاب ہوتے ہوئے دیکھ کر اس کو بھی ایکسپلائٹر (exploiter) سمجھ لے۔ حالاں کہ عین ممکن ہے کہ اس نے جائز محنت کے ذریعہ کامیابی حاصل کی ہو۔ وہ ایک جاندار چیز کو لوہا سمجھ لے، صرف اس لئے کہ اس کے پاس لوہے کے معیار کے سوا کوئی اور معیار موجود ہی نہ تھا جس پر وہ دوسرے کو قیاس کر سکے۔

۳ اگست ۱۹۸۳

حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگ سو اونٹوں کی طرح ہیں، مشکل ہے تم ان سو اونٹوں میں سے کوئی ایک اونٹ سواری کے قابل پا سکتے ہو (عن ابن عمر قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: انما الناس کالابل المائۃ لاتکاد تجد فیہا راحلۃ، متفق علیہ، مشکوٰۃ ثالث، ۱۴۷۳)

دنیا میں بے شمار اونٹ ہیں۔ مگر صحیح معنوں میں کام کا اونٹ مشکل سے ملتا ہے۔ یہی معاملہ انسانوں کا بھی ہے۔ دنیا میں کروڑوں انسان ہیں۔ مگر ان کا تجربہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حقیقی معنوں میں

کام کا آدمی کوئی نہیں۔ اگر کسی کو ایک ، دو آدمی کام کے مل جائیں تو یقیناً وہ بہت خوش قسمت ہے۔ قرآن کے مطابق ، کام کا آدمی وہ ہے جس میں دو صفتیں جمع ہوں۔ قوت اور امانت (القصص ۲۶) مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ کسی شخص کے اندر اگر قوت ہے تو امانت نہیں ، اور اگر امانت ہے تو قوت نہیں۔ اور اگر بالفرض کسی آدمی کے اندر دونوں صفتیں جمع ہوں تو اس کے اندر سرکشی کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کو ، کم از کم اجتماعی کام کے لئے ، بے فائدہ بنا دیتا ہے۔

۴ اگست ۱۹۸۳

" مومن کون ہے اور منافق کون " اس سوال کے جواب میں میں نے ایک صاحب سے کہا : ایک ہے زندہ شعور کی سطح پر مسلمان ہونا۔ دوسرا ہے بے حسی کی سطح پر مسلمان ہونا۔ جو شخص زندہ شعور کی سطح پر مسلمان ہو وہ مومن ہے ، اور جو شخص بے حسی کی سطح پر مسلمان ہو وہ منافق ہے۔

۵ اگست ۱۹۸۳

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر جنگ مدافعانہ جنگ تھی۔ آپ کی کوئی جنگ جارحانہ جنگ نہیں۔ حتیٰ کہ بدر میں جب دونوں طرف کی فوجیں آمنے سامنے ایک میدان میں جمع ہو گئیں ، تب بھی آپ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ حملہ کرنے میں پہل نہ کریں۔ وہ اس وقت تک جنگ شروع نہ کریں جب تک فریق ثانی خود جنگ کا آغاز نہ کر دے۔

موجودہ زمانہ میں جنگ کے مختلف پہلوؤں پر زبردست تحقیقات ہوئی ہیں۔ ان تحقیقات سے آپ کی مذکورہ روش کی حربی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مختلف جنگوں کے تجربات کو جمع کر کے ان کا مطالعہ کیا گیا۔ ان تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ دفاع کرنے والی افواج (Defending forces) کے مقابلہ میں پیش قدمی کرنے والی افواج (Attacking forces) کا جانی نقصان ہمیشہ زیادہ ہوتا ہے۔ یہ رسول اللہ کے طریق جنگ کی عصری تصدیق ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی پالیسی کے دو خاص پہلو تھے۔ (۱) دشمن کی سرگرمیوں سے مکمل طور پر باخبر رہتے ہوئے اپنی تیاری جاری رکھنا۔ (۲) عملی طور پر صرف اس وقت لڑنا جب کہ دفاعی طور پر لڑنا بالکل آخری درجہ میں ضروری ہو گیا ہو۔

جنگ آپ کی پالیسی کا صرف اتفاقی جزء ہے۔

۶ اگست ۱۹۸۳

تمام اہل علم مانتے ہیں کہ زمین نارنگی کی طرح گول ہے۔ مگر کسی بھی شخص نے آج تک زمین کی گولائی کو پوری شکل میں نہیں دیکھا۔ جو لوگ راکٹ پر سوار ہو کر خلا میں گئے، انھوں نے بھی زمین کی صرف آدھی گولائی کو دیکھا۔ زمین کی پوری گولائی کو بیک وقت وہ بھی نہ دیکھ سکے۔ اس کی وجہ انسان کی محدودیت ہے۔ انسان اپنی محدودیت کی وجہ سے بیک وقت پورا علم حاصل نہیں کر پاتا۔

یہی معاملہ ہر چیز کے بارہ میں ہے۔ انسان کا بیشتر علم استنباطی ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں مشاہداتی۔ جرمنی کا مشہور سائنس داں ہیزنبرگ (Warner Heisenberg) ۱۹۰۱ میں پیدا ہوا۔ ۱۹۷۶ء میں اس کی وفات ہوئی۔ ۱۹۳۲ میں اس کو فزکس کا نوبل انعام ملا۔ اس نے تحت ایٹمی مظہر (Sub-atomic phenomenon) یا (Subatomic World) کا مطالعہ کیا۔ اس نے پایا کہ اگر ہم یہ جانیں کہ ایک الکٹران کدھر جا رہا ہے تو وہ اس وقت ہم یہ نہیں جان سکتے کہ وہ کہاں ہے۔ اور اگر یہ جان لیں کہ وہ کہاں ہے تو ہم یہ نہیں جان سکتے کہ وہ کدھر جا رہا ہے:

If we know where an electron is going, we do not know where it is,
and if we know where it is, we do not know where it is going.

۷ اگست ۱۹۸۳

امام مالک نے ایک بار لوگوں کے سامنے یہ مسئلہ بیان کہ ایک شخص اگر ظلماً کسی شخص کی ایک انگلی توڑ دے تو اس کے بدلے اس کو دس اونٹ دیت میں دینا ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص کسی کی پانچوں انگلیاں توڑ کر بیکار کر دے تو پچاس اونٹ دیت میں دینا ضروری ہوگا۔ سامعین میں سے ایک آدمی نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی پانچ انگلیوں کی قیمت پچاس اونٹوں کے برابر ہے۔ پھر تو چور کا ہاتھ، جس میں اس کی پانچوں انگلیاں کاٹ دی جاتی ہیں، اس وقت کاٹا جانا چاہئے جب کہ چور نے پچاس اونٹ کی مالیت کی چیز چرائی ہو۔ حالاں کہ مسئلہ کے مطابق، اس کا ہاتھ صرف چار درہم میں کٹ جاتا ہے۔

امام مالک نے جواب دیا کہ چور نے چوری کا جرم کر کے اپنی انگلیوں کی قیمت گھٹا دی۔ اس کا ہاتھ جب تک امانت دار تھا وہ قیمتی تھا، اور جب اس کے ہاتھ نے خیانت کا فعل کیا تو وہ حقیر ہو گیا (ان الید لما کانت امینة کانت ثمینة فلما خانت ھانت)

موجودہ مسلمان اس اصول کو مسائل فقہ میں جانتے ہیں، مگر وہ اس اصول کو مسائل حیات میں نہیں جانتے۔ مثال کے طور پر ہندستان کا ایڈمنسٹریشن مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کرتا ہے تو وہ چیختے ہیں کہ ہمارے ساتھ برابر کا سلوک کیوں نہیں کیا جاتا۔ مگر مذکورہ اصول کی روشنی میں ایسا ہونا بالکل فطری ہے۔

مسلمانوں نے ۱۹۴۷ سے پہلے اس ملک میں بٹوارہ کی سیاست چلائی۔ انھوں نے کہا کہ ہم تم سے الگ ایک قوم ہیں۔ ہمارا حصہ بانٹ کر ہمیں دے دو۔ اس سیاست کے نتیجہ میں مسلمان اس ملک میں اپنی قیمت کم کر چکے ہیں۔ انھیں اس نادانی کی قیمت اس وقت تک دینی پڑے گی جب تک وہ کوئی ممتاز تعمیری عمل کر کے اپنی سابقہ تصویر کو بدل نہ ڈالیں۔

۸ اگست ۱۹۸۳

جان اسٹوارٹ مل (John Stuart Mill) کا قول ہے کہ بہت سی سچائیاں ایسی ہیں جن کی پوری معنویت اس وقت تک سمجھی نہیں جا سکتیں جب تک ذاتی تجربہ سے ان کا ادراک نہ ہو جائے:

There are many truths of which the full meaning cannot be realised until personal experience has brought it home.

اصل یہ ہے کہ بات صد فی صد لفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ لفظوں میں بیان کردہ بات کے ساتھ آدمی کو خود اپنی طرف سے کچھ شامل کرنا پڑتا ہے، اسی وقت وہ اس کو پوری طرح سمجھ پاتا ہے۔ جس آدمی کے پاس اپنی طرف سے شامل کرنے کے لئے نہ ہو، وہ کسی بات کو محض سنے ہوئے الفاظ کے ذریعہ سمجھ نہیں سکتا۔

۹ اگست ۱۹۸۳

قرآن میں دعوت حق کا انکار کرنے والے مجرمین کے بارہ میں ارشاد ہوا ہے کہ قیامت کے دن ان کے بارہ میں کہا جائے گا: انہم کانوا اذا قیل لہم لا الٰہ الا اللہ یستکبرون ویقولون ائنا لتارکوا آلہتنا لشاعر مجنون (الصافات ۳۵ - ۳۶) یعنی جب ان سے کہا جاتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں تو وہ تکبر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کیا ہم ایک دیوانے شاعر کے کہنے سے اپنے آلہہ کو چھوڑ دیں۔

منکرین حق کا یہ تکبر اللہ کے مقابلہ میں نہیں تھا، بلکہ داعی کے مقابلہ میں تھا۔ اپنے جن اکابر

کے دین پروہ اپنے آپ کو سمجھتے تھے، وہ اکابر ان کو معاصر داعی کے مقابلہ میں زیادہ عظیم نظر آتے تھے۔ اس لئے انھوں نے داعی کو حقیر سمجھ کر اس کے پیغام کو ماننے سے انکار کر دیا۔

۱۰ اگست ۱۹۸۳

آدمی کی نگاہ اگر نہ ملنے والی چیز پر اٹکی ہوئی ہو تو وہ ملنے والی چیز کو دیکھنے میں بھی ناکام رہے گا۔ نہ ملنے والی چیز کے پیچھے دوڑنے میں وہ اس چیز کو بھی کھو دے گا جو اس کو یقینی طور پر مل رہی تھی یا مل سکتی تھی۔

۱۱ اگست ۱۹۸۳

ہر آدمی اپنی ذات میں ایک "انسان" کا تجربہ کرتا ہے۔ یہی تجربہ خدا کے وجود پر یقین کرنے کے لئے کافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان خدا کا آئینہ ہے۔ فرق یہ ہے کہ انسان کی ہستی محدود ہے اور خدا کی ہستی لامحدود۔

انسان کیا ہے۔ انسان ایک صاحب ذہن مخلوق ہے۔ ذہن ہی کا دوسرا نام انسان ہے۔ یہ در اصل ذہن ہے جو انسان کی طاقت کا سرچشمہ ہے۔ انسان کا ذہن محدود ہے، اس لئے اس کی طاقت بھی محدود ہے۔ اگر ذہن لامحدود ہو جائے تو طاقت بھی لامحدود ہو جائے گی۔ ہم اپنے تجربہ کی بنا پر مجبور ہیں کہ "محدود ذہن" کو مانیں۔ اور محدود ذہن کو مانتے ہی دوبارہ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ "لامحدود ذہن" کے وجود کو تسلیم کریں۔ جزء کو ماننے کے بعد کل کو نہ ماننے کے لئے کوئی منطقی بنیاد باقی نہیں رہتی ــــــ ایک آرٹسٹ کے آرٹ کو دیکھ کر یہ خیالات ذہن میں آئے۔

۱۲ اگست ۱۹۸۳

حدیث میں آیا ہے: مَن قرأ القرآن فاعربه كان له بكل حرف عشرون حسنة - ومن قرأ القرآن بغير اعراب كان له بكل حرف عشر حسنات - جو شخص قرآن کو اس کے اعراب کے ساتھ پڑھے تو اس کے لئے ہر حرف کے بدلے بیس نیکی ہوگی۔ اور جو شخص قرآن کو اعراب کے بغیر پڑھے تو اس کے لئے ہر حرف کے بدلے دس نیکی ہوگی۔

ایک شخص جو عربی سے اور حدیث کی زبان سے بخوبی آشنا نہ ہو وہ حدیث میں اعراب کا مطلب معروف زبر زیر پیش لے لے گا۔ اور اس کے مطابق حدیث کے معنی بیان کرے گا۔ حالانکہ اعراب سے یہاں زبر

زبر زیر پیش مراد نہیں۔ زبر زیر پیش کا طریقہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود ہی نہ تھا۔

سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں لکھا ہے کہ قرآن کے اعراب سے مراد اس کے الفاظ کے معانی کی معرفت ہے اس سے نحوی اصطلاح والا اعراب مراد نہیں (المراد باعرابہ معرفۃ معانی الفاظہ ولیس المراد بہ الاعراب المصطلح علیہ عند النحاۃ)

اسی طرح ایک اور حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: اعربوا القرآن والتمسوا غرائبہ (قرآن کو سمجھ کر پڑھو اور اس کے مشکل الفاظ کی کھوج کرو)

۱۳ اگست ۱۹۸۳

قرآن میں جنت کی تعبیر کے لئے بار بار دو لفظ آئے ہیں: لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون (اہل جنت کو وہاں نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے)

دنیا کی زندگی میں دو قسم کی ناخوشگواریاں آدمی کی زندگی کو بے لطف بنا دیتی ہیں۔ ایک خارجی اور دوسرے داخلی۔ خارجی سے مراد وہ مسائل و مصائب ہیں جو دوسروں کی طرف سے سامنے آتے ہیں۔ اور داخلی سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنے عجز اور اپنی محدودیت کی وجہ سے بار بار دل شکستگی اور غمگینی کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ جنت میں یہ دونوں چیزیں ختم ہو جائیں گی۔

دنیا میں امتحان کی بنا پر اچھے لوگوں کے ساتھ برے لوگ بھی شامل ہیں۔ یہاں ہر ایک کو پوری آزادی حاصل ہے۔ جنت کی دنیا میں تمام برے لوگ دور پھینک دئے جائیں گے۔ جنت کا ماحول صرف اچھے لوگوں کا ماحول ہوگا۔ دوسری طرف انسان کے عجز اور محدودیت کا خاتمہ ہو چکا ہوگا، اس لئے اس کا امکان بھی ختم ہو جائے گا کہ آدمی اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کی بنا پر غم و اندوہ میں مبتلا ہو۔

۱۴ اگست ۱۹۸۳

اخرج ابن ابی داؤد عن مسلم بن مخراق قال قلت لعائشۃ ان رجالا یقرأ احدہم القرآن فی لیلۃ مرۃ او مرتین او ثلثاً۔ فقالت قرأوا ولم یقرأوا۔ کنت اقوم مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ فیقرأ بالبقرۃ و آل عمران والنساء، فلا یمر بآیۃ فیہا استبشار الا دعا ورغب ولا بآیۃ فیہا تخویف الا دعا واستعاذ

ابن ابی داؤد نے مسلم بن مخراق سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے حضرت عائشہ سے کہا کہ کچھ لوگ قرآن کو اس

طرح پڑھتے ہیں کہ وہ اس کو ایک رات میں ایک بار یا دو بار یا تین بار ختم کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ انھوں نے پڑھا مگر انھوں نے نہیں پڑھا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ کے ساتھ رات کو کھڑی ہوتی تھی تو آپ سورہ بقرہ اور آل عمران اور نساء پڑھتے تھے، آپ جب بھی کسی آیت سے گزرتے جس میں بشارت ہو تو آپ دعا فرماتے اور اس میں رغبت ظاہر فرماتے۔ اسی طرح آپ جب بھی کسی ایسی آیت سے گزرتے جس میں ڈراوا ہو تو آپ دعا فرماتے اور اس سے پناہ مانگتے۔

۱۵ اگست ۱۹۸۳

انسان کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک توجیہہ طلب حیوان ہے :

Man is an explanation seeking animal

یہ انسان کی سب سے بڑی خوبی ہے، اور یہی انسان کی سب سے بڑی کمزوری بھی۔ کسی معاملہ کے بارہ میں انسان اس وقت مطمئن ہو جاتا ہے جب کہ وہ اس کی توجیہہ پالے۔ اب اگر آدمی معاملہ کی صحیح توجیہہ پالے تو اس کا مطمئن ہونا صحیح بنیاد پر ہوگا۔ اور اگر اتفاق سے اس کو غلط توجیہہ مل جائے تو وہ اسی غلط توجیہہ پر مطمئن ہو جائے گا۔ اور غلط توجیہہ پر مطمئن ہونا اس کو جہاں پہنچائے گا وہ بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

۱۶ اگست ۱۹۸۳

ہجرت سے پہلے مدینہ کے لوگوں سے آپ کی ملاقات حج کے موسم میں ہوتی تھی۔ نبوت کے گیارھویں سال آپ قبائل عرب میں تبلیغ کے لئے منیٰ گئے۔ وہاں عقبہ کے قریب آپ کی ملاقات قبیلہ خزرج کے کچھ لوگوں سے ہوئی۔ یہ تقریباً آٹھ افراد تھے۔ انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بعد آپ نے ان سے کہا کہ اگر میں مدینہ آجاؤں تو کیا تم لوگ میری حمایت کروگے۔ ابن سعد کی روایت کے مطابق انھوں نے جواب دیا: نحن مجتهدون لله ولرسوله. نحن فاعلم اعداء متباغضون وانما كانت وقعة بعاث عام الاول، يوم من ايامنا، اقتتلنا فيه. فان تقدم ونحن كذا لا يكون لنا اجتماع. فدعنا حتى نرجع الى عشائرنا. لعل الله يصلح ذات بيننا. وموعدك الموسم العام المقبل.

ہم اللہ اور اس کے رسول کے لئے پوری کوشش کریں گے۔ مگر ہم، آپ جانئے کہ اس وقت آپس کی بغض وعداوت میں مبتلا ہیں۔ اور ابھی پچھلے سال ہمارے یہاں بعاث کی جنگ ہوئی ہے۔ اگر آپ ایسی حالت میں

مدینہ آتے ہیں تو ہم آپ پر جمع نہ ہو سکیں گے۔ پس آپ ہمیں اپنے لوگوں کی طرف جانے دیجئے۔ شاید اللہ ہمارے باہمی معاملہ کو درست کر دے۔ اور آپ سے اگلے سال یہیں ملاقات کا وعدہ ہے۔

۱۰ ، کے بعد دوسری بار نبوت کے بارہویں سال اور تیسری بار نبوت کے تیرھویں سال آپ کی ملاقات مومنین مدینہ سے ہوئی۔ یہاں تک کہ آپ نے مکہ سے مدینہ کے لئے ہجرت فرمائی۔

مذکورہ روایت میں فان تقدم ونحن اذا لایکون لنا علیک اجتماع کا جملہ بڑا عجیب ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ اصحاب رسول کتنے زیادہ باشعور لوگ تھے۔

۱۷ اگست ۱۹۸۳

فوجی معاملات کے ایک مسلم ماہر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حربی پہلو پر ایک کتاب شائع کی ہے۔ جنگ بدر کے سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ "حضور نے ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت لڑائی کے لئے بدر کا علاقہ چنا تھا۔ اس طرح دشمنوں کی پیش قدمی کے لئے ریتیلے ٹیلے اور نرم زمین والا علاقہ چھوڑ دیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ دشمن کو نقل وحرکت میں دشواری کا سامنا کرنا پڑے اور چڑھائی پر پیش قدمی کرتے ہوئے وہ صاف نظر آئیں۔ حضور نے پہاڑوں کو اپنے بازو اور پشت پر رکھا اور پہل کاری دشمن پر چھوڑ دی۔ اس طرح حضور نے مشہور جنگی اصول (Ground of own choice) یعنی دشمن کو اپنی پسندیدہ زمین پر جنگ کرنے کے لئے مجبور کرنا عمدگی سے استعمال کیا۔

یہ بات بذات خود صحیح ہے۔ مگر اپنی پسندیدہ زمین پر حریف کو لڑنے کے لئے مجبور کرنے کا اصول صرف جنگ تک محدود نہیں۔ وہ اس سے زیادہ وسیع ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ میں اس اصول کا استعمال صرف جزئی طور پر کیا۔ اس کا زیادہ بڑا استعمال آپ نے دعوت کے میدان میں کیا۔ حدیبیہ کی صلح اس کی مثال ہے جس کو اسلام میں فتح مبین اور فتح عظیم کہا گیا ہے۔ حدیبیہ کی صلح کے ذریعہ یہ ہوا کہ آپ اپنے حریف کو جنگی مقابلہ کے میدان سے نکال کر دعوتی مقابلہ یا فکری ٹکراؤ کے میدان میں لائے۔ اور فکر اور نظریہ کے معاملہ میں چوں کہ اسلام واضح طور پر برتر پوزیشن میں تھا، اس لئے فریق ثانی کو یہاں زبردست شکست ہوئی۔

۱۸ اگست ۱۹۸۳

موجودہ دنیا میں ہر آدمی کو وہ تجربہ پیش آتا ہے جس کو کھوئے ہوئے مواقع

(Missed opportunities) کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک موقع آدمی کے سامنے آتا ہے۔ مستقبل کے اعتبار سے اس میں اس کے لئے زبردست فائدہ ہوتا ہے۔ مگر وہ بروقت اس کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتا۔ بعد کے حالات بتاتے ہیں کہ اس موقع کو استعمال نہ کرنا سخت نادانی تھی۔ اس کو استعمال کرکے میں بہت بڑا فائدہ حاصل کر سکتا تھا۔

عام آدمی کے لئے ایسا تجربہ صرف ناکامی کا تجربہ ہوتا ہے۔ مگر مومن کے لئے اس ناکامی میں بھی کامیابی کا ایک پہلو نکل آتا ہے وہ اپنے عجز کا تجربہ کرکے خدا کی قدرت کو دریافت کرتا ہے۔ وہ اس حقیقت کا ادراک کرتا ہے جس کو قرآن میں مختصر طور پر اس طرح کہا گیا ہے: قل لو اعلم الغیب لاستکثرت۔ غیر مومن کے لئے ایسا تجربہ صرف دل شکستگی کا سبب بنتا ہے۔ مگر مومن کو وہ خدا سے قریب کرتا ہے۔ اس طرح وہ اس کے لئے نئی قوت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ایسے تجربہ کے بعد وہ پکار اٹھتا ہے کہ خدایا، میں نے اپنی محدود عقل کی بنا پر جس چیز کو کھو دیا، تو اپنی لامحدود قدرت کے ذریعہ مجھے اس چیز کا مالک بنا دے۔

شاید یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کا معاملہ عجیب ہے۔ اس کی ہر بات اس کے لئے خیر ہے۔ اور یہ مومن کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں۔ اگر اس کو نعمت ملتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے اور وہ اس کے لئے خیر کا باعث ہوتا ہے۔ اور اگر اس کو مصیبت پڑتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے تو وہ اس کے لئے خیر کا باعث ہوتا ہے (عجباً لامر المومن إنّ امرہ کلّہ خیر۔ ولیس ذالک لاحد الّا للمؤمن۔ إنْ اصابتہ سرّاء شکر فکان خیراً لہ وان اصابتہ ضرّاء صبر فکان خیراً لہ، رواہ مسلم)

۱۹ اگست ۱۹۸۳

قرآن کی سورہ نمبر ۷۴ (المدثر) میں پیغمبر اسلام کو انذار اور دعوت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں جو ضروری ہدایات دی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ تم ایسا نہ کرو کہ احسان کرکے اس کا بدلہ چاہو (ولا تمنن تستکثر)

اس ہدایت کو حکم دعوت کے ذیل میں بیان کرنے کی ایک خاص حکمت ہے۔ دعوت کے کام کو مؤثر طور پر انجام دینے کے لئے مدعو کا بے غرض ہونا ضروری ہے۔ داعی اور مدعو کے درمیان اگر طلب اور

مانگ کی فضا پیدا ہوجائے تو دعوت کا کام انجام نہیں پاسکتا۔ دعوت یک طرفہ طور پر صرف دینے کا عمل ہے، دعوت کے ساتھ لینے کا معاملہ شامل کرنا اس کو ہلاک کرنے کے ہم معنی ہے۔

اس معاملہ میں داعی کو اتنا زیادہ محتاط ہونا چاہئے کہ وہ مدعو کے ساتھ احسان کرکے بھی اس سے کسی بدلہ اور معاوضہ کا طالب نہ ہو، اور احسان کے بغیر مدعو کے مقابلہ میں حقوق طلبی کی مہم چلانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

۲۰ اگست ۱۹۸۳

بنجامن ڈزرائیلی (Benjamin Disraeli) کا قول ہے کہ عام قاعدہ کے مطابق، زندگی میں سب سے زیادہ کامیاب شخص وہ ہے جو بہترین معلومات رکھتا ہو:

As a general rule, the most successful man in life is the mar who has the best information.

یہ بات نہایت درست ہے۔ زندگی کے عام معاملات میں بھی معلومات کی بے حد اہمیت ہے۔ اسی طرح دشمن کے مقابلہ میں کامیابی کے لئے اس سے واقفیت انتہائی ضروری ہے۔ معلومات میں اضافہ ہی کے لئے اسلام میں مشورہ کا طریقہ رکھا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی شخص کے پاس جتنی زیادہ معلومات ہوں گی، اس کو اتنی ہی زیادہ کامیابی حاصل ہوگی۔

۲۱ اگست ۱۹۸۳

اجتماعی زندگی میں کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جو عمل کیا جاتا ہے، اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ مثلاً:

سیاسی عمل (Political activism)

تشددانہ عمل (Violent activism)

غیر تشددانہ عمل (non-violent activism)

مگر اسلام کا عمل ان سب سے الگ ہے۔ اسلامی عمل کو ایک لفظ میں ——— دعوتی عمل (da'wah activism) کہا جاسکتا ہے۔ اسلام میں اصلاً دعوت کے راستہ سے عمل شروع کیا جاتا ہے پھر وہ تدریج کے ساتھ بڑھتے ہوئے بقیہ شعبوں تک پہنچتا ہے۔

۲۲ اگست ۱۹۸۳

انگریزی شاعر چاسر (Chaucer) نے کہا تھا کہ جو چیز خود کچھ نہ ہو، اس سے کچھ بھی برآمد نہیں ہو سکتا:

Nothing comes of nothing

مٹی لوہے کا کام نہیں کر سکتی۔ ایک مردہ لاش سے وہ چیزیں ظاہر نہیں ہو سکتیں جو زندہ انسان کی خصوصیت ہیں۔ اسی طرح جو قوم تنزل کا شکار ہو چکی ہو، تاریخی عمل کے نتیجہ میں جس کی صلاحیتیں فنا ہو چکی ہوں، ایسی قوم سے ان اعمال اور ان سرگرمیوں کی امید نہیں کی جا سکتی جو صرف ایک تازہ دم گروہ سے متوقع ہوتی ہیں۔

۲۳ اگست ۱۹۸۳

ایک حدیث ہے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ بُعثت بالحنیفیۃ السمحۃ یعنی میں فطری اور سہل دین کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔ کوئی شخص صرف اتنا ہی پڑھے تو اس کو حدیث کے سمجھنے میں دقت پیش آ سکتی ہے۔ کیوں کہ اس میں دین کو سہل بتایا گیا ہے، جب کہ بہت سے پہلوؤں سے دین پر چلنا کوئی سہل کام نہیں۔

اس سوال کا جواب اس وقت مل جاتا ہے جب کہ پوری حدیث کو دیکھا جائے۔ پوری حدیث اس طرح ہے:

قال صلی اللہ علیہ وسلم: بعثت بالحنیفیۃ السمحۃ ولم ابعث بالرھبانیۃ الصعبۃ (المبسوط، جلد ۳، صفحہ ۲۸۶)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں فطری اور سہل دین کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔ میں رہبانیت جیسے سخت اعمال کے ساتھ نہیں بھیجا گیا۔

پوری روایت کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہاں اسلام کے سہل ہونے کی جو بات کہی گئی ہے وہ مسیحی رہبانیت کے مقابلہ میں کہی گئی ہے نہ کہ مطلق طور پر۔ مسیحی رہبانیت میں غیر ضروری جسمانی مشقت کو معیار کمال سمجھ لیا گیا تھا۔ اسلام نے اس قسم کے بے فائدہ تشدد کو ختم کر دیا۔

۲۴ اگست ۱۹۸۳

مشہور امریکی فلم ایکٹرس میریلین مونرو (Marilyn Monroe) نے کہا تھا کہ مجھے دولت

سے دلچسپی نہیں۔ مجھے صرف اس سے دلچسپی ہے کہ میں حیرت ناک بن جاؤں:

I am not interested in money.
I just want to be wonderful.

یہی اکثر لیڈروں کا حال ہے۔ ان کے لئے پیسہ کی اہمیت نہیں۔ ان کے نزدیک اہمیت کی بات یہ ہے کہ انھیں عزت اور مقبولیت حاصل ہو۔ وہ لوگوں کی نظر میں غیر معمولی دکھائی دینے لگیں۔ پیسہ کے معاملہ میں قائد کا استغناء کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ قائد کے استغناء کو جانچنے کا میدان یہ ہے کہ وہ عزت اور ناموری حاصل کرنے والے مواقع پر استغناء کا ثبوت دے۔

۲۵ اگست ۱۹۸۳

فرانسس سیلس (St. Francis De Sales) نے کہا ہے کہ شہد کی مکھیاں انتہائی میٹھا شہد ٹمی کے پھولوں سے بناتی ہے جو کہ ایک چھوٹا اور نہایت کڑوا پودا ہے:

Bees make the sweatest honey from the flowers
of the thyme — a small and bitter herb.

قرآن میں ہے کہ شہد کی مکھی حکم خداوندی کے تحت کام کرتی ہے (النحل: ۶۸) اس کا مطلب یہ ہے کہ شہد کی مکھی جو کچھ کرتی ہے وہ عین خدائی منشا کے مطابق ہے۔ وہ گویا خدا کا قائم کردہ ایک نمونہ ہے۔ یہ چیز بتاتی ہے کہ خدا کی مرضی اپنے بندوں سے یہ ہے کہ وہ کڑوی چیزوں سے میٹھا مادہ نکالیں۔ وہ کڑواپن کو مٹھاس سے بدل دیں۔ اب جو لوگ دوسروں کے کڑواپن پر احتجاج کریں، وہ گویا خود خدا کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر، وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم خدا کے تخلیقی نظام پر راضی نہیں۔ ہمیں اس کے بجائے دوسری دنیا چاہئے جہاں مٹھاس سے مٹھاس کو نکالنا ہو۔ کڑواپن سے مٹھاس نکالنے والی دنیا ہمیں منظور نہیں۔

۲۶ اگست ۱۹۸۳

ایک صاحب نے کہا کہ ہندستان میں صوفیاء کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ انھوں نے اس ملک میں تبلیغی کام کیا۔ انھیں کی تبلیغ سے آج مسلمانوں کی اتنی زیادہ تعداد ہندستان میں نظر آتی ہے۔ میں نے کہا کہ صوفیا کا اصل کارنامہ یہ نہیں ہے کہ انھوں نے تبلیغی کام کیا۔ ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں

نے اپنے آپ کو غیر تبلیغی کام سے بچایا۔

صوفیا کے حالات پڑھئے تو کسی بھی صوفی یا بزرگ کے یہاں یہ نہیں ملتا کہ وہ جا جا کر لوگوں کے یہاں تبلیغ کرتے ہوں یا غیر مسلموں سے یہ کہتے ہوں کہ تم اسلام قبول کر لو، ورنہ تم خدا کے یہاں پکڑے جاؤ گے۔ البتہ وہ اس قسم کے مخالف تبلیغ کام میں مشغول نہیں تھے جس میں دوسرے لوگ مشغول تھے۔ مثلاً مسلم بادشاہوں کا ہندوؤں سے لڑنا۔ مناظر علماء کا ہندوؤں سے مناظرہ بازی کرنا۔ عام مسلمانوں کا ہندوؤں سے مادی مفادات کے لئے جھگڑا کرنا۔ صوفیا اس قسم کی تمام نزاعی باتوں سے دور رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں کو ان سے وہ ضد نہ تھی جو دوسرے مسلمانوں سے انھیں تھی۔ چنانچہ وہ ان کے پاس آتے جاتے اور ان سے نصیحت لینے کی کوشش کرتے۔

اہم بات یہ ہے کہ اسلام ایک محفوظ اور تسلیم شدہ مذہب ہے۔ اس لئے وہ اپنے آپ پھیلتا ہے، وہ اپنے آپ لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا لیتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص بطور خود اسلام کی طرف مائل ہوتا اور اسلام میں داخل ہونا چاہتا تو وہ اپنے قریب کے کسی بزرگ کے یہاں آکر ان کے ہاتھ پر کلمہ پڑھ لیتا۔

۲۷ اگست ۱۹۸۳

اسلامی فقہ کا ایک اصول یہ ہے کہ الاعمال بمقاصدھا۔ یعنی اعمال اپنے مقاصد کے تحت ہیں۔ شریعت میں کوئی عمل مقرر کیا جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ عمل برائے عمل ہے، بلکہ وہ عمل برائے مقصد ہے۔ اعمال مقاصد کے تحت ہیں نہ کہ مقاصد اعمال کے تحت۔ شرعی اعمال کی حکمت سمجھنے کے لئے ان کے مقاصد پر غور کرنا چاہئے۔

۲۸ اگست ۱۹۸۳

انگریزی کی ایک مثل ہے کہ وہ بھی خدمت کرتے ہیں جو صرف کھڑے ہوں اور انتظار کریں:

They also serve who only stand and wait.

یہ مثل بہت بامعنی ہے۔ کیوں کہ جو شخص کھڑا ہو جائے وہ کم از کم اتنا کرتا ہے کہ راستہ کی بھیڑ میں کمی کرتا ہے۔ وہ باہمی ٹکراؤ کے امکان کو کم از کم اپنی حد تک گھٹا رہا ہے۔ اسی لئے حدیث میں آیا کہ فتنہ کے زمانہ میں گھر میں بیٹھ جانے والا باہر چلنے والے سے بہتر ہوگا۔

اجتماعی معاملات میں دخل دینا ایک بے حد نازک کام ہے۔ اجتماعی معاملہ میں کودنے سے پہلے آدمی کو ہزار بار سوچنا چاہئے۔ اور جو شخص اتنا زیادہ سوچنے اور سمجھنے کا اہل نہ ہو اس کا خاموش بیٹھے رہنا اس سے اچھا ہے کہ وہ کم تر سوچ کے ساتھ میدان میں کود پڑے اور پھر فساد میں اضافہ کا سبب بنے۔

۲۹ اگست ۱۹۸۳

لما عزم المامون على قتل ابراهيم بن المهدى، وكان مصمماً على قتله شاور فيه احمد بن ابى خالد الوزير فقال: يا امير المومنين، ان قتلته فلك نظراء، وان عفوت عنه فمالك نظير۔ فعفا عنه۔

خلیفہ مامون نے جب ابراہیم بن مہدی کے قتل کا ارادہ کیا، اور وہ اس کے قتل کا پختہ ارادہ کر چکا تھا، اس نے اس معاملہ میں اپنے وزیر احمد بن ابی خالد سے مشورہ کیا۔ وزیر نے کہا کہ اے امیر المومنین، اگر آپ اس کو قتل کر دیں تو آپ کے لئے مثالیں موجود ہیں، اور اگر آپ اس کو معاف کر دیں تو آپ کے لئے کوئی مثال نہیں۔ چنانچہ مامون نے اس کو معاف کر دیا۔

وزیر کا مطلب یہ تھا کہ اگر آپ نے انھیں قتل کیا تو آپ وہی کریں گے جو سب لوگ ایسے موقع پر کرتے ہیں، اور اگر آپ معاف کر دیں تو آپ وہ کام کریں گے جو کسی نے نہیں کیا۔ وزیر کے اس جملہ نے خلیفہ مامون کے احساس کو جگا دیا۔ پہلے وہ اس کو قتل کر دینے میں اپنی بڑائی سمجھتا تھا، اب اس کو نظر آیا کہ معاف کر دینا زیادہ بڑا کام ہے۔ اس احساس نے اس کو مجبور کیا کہ وہ اسے معاف کر دے۔

۳۰ اگست ۱۹۸۳

البرٹ آئنسٹائن (Albert Einstein) کا قول ہے کہ سائنس مذہب کے بغیر لنگڑی ہے۔ مذہب سائنس کے بغیر اندھا ہے:

Science without religions is lame.
Religions without science is blind.

میرا خیال ہے کہ یہ بات زیادہ صحیح طور پر اس طرح کہی جا سکتی ہے کہ انسان سائنس کے بغیر لنگڑا ہے، اور انسان مذہب کے بغیر اندھا ہے۔ مذہب انسان کو وہ نقطۂ نظر دیتا ہے جس کی روشنی میں وہ چیزوں کو دیکھ سکے۔ اسی طرح سائنس انسان کو وہ اسباب دیتی ہے جس سے وہ موجودہ دنیا میں اپنی زندگی کی

تشکیل کرسکے۔

۳۱ اگست ۱۹۸۳

ہندستان کی آزادی کا قانون جب برطانی پارلیمنٹ میں پاس ہوا، اس وقت کلیمنٹ ایٹلی برطانیہ کے وزیر اعظم تھے۔ ان سے پہلے برطانیہ کے وزیر اعظم ونسٹن چرچل تھے۔ انھوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں یہ کہہ کر ہندستان کو آزادی دینے سے انکار کر دیا تھا کہ میں شاہ برطانیہ کا پہلا وزیر اس لئے نہیں بنا ہوں کہ برطانی سلطنت کے خاتمہ کی تقریب کی صدارت کروں:

I did not become the King's first minister to preside over the liquidation of the British empire.

سابق برطانی وزیر اعظم جیمز کالاگھن کی ایک کتاب (وقت اور موقع) کے نام سے چھپی ہے:

James Callaghan, Time And Chance

مصنف لکھتے ہیں کہ برطانیہ کا ۱۹۴۵ کا الکشن اگر ونسٹن چرچل جیت جاتے تو کیا ہوتا۔ وہ اپنے مزاج کے مطابق ہرگز انڈیا کو آزادی دینے کے لئے تیار نہ ہوتے اور طاقت کے ذریعہ اس پر قبضہ باقی رکھنے کی کوشش کرتے۔ مصنف مزید لکھتے ہیں کہ ہم انڈیا کی آزادی کو روک نہیں سکتے تھے۔ اس کے بعد ہندستان کے عوام خونی تصادم کے ذریعہ آزادی حاصل کرتے، اور پھر دونوں ملکوں کے درمیان تلخ احساسات (Bitter feelings) مستقل طور پر باقی رہ جاتے۔ اسی کے متعلق کہا گیا ہے کہ:

ہرآنچہ دانا کند کند ناداں لیک بعد از خرابی بسیار

یکم ستمبر ۱۹۸۳

حدیث کی کتابوں میں بہت سی روایتیں بدعت کے خلاف آئی ہیں۔ ان کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں نئی بات نکالنے کو شر اور ضلالت قرار دیا ہے اور اس سے اپنی برأت کا اظہار فرمایا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: من عمل عملاً لیس علیہ أمرنا فھو ردّ (جو شخص ایسا عمل کرے جو ہمارے عمل کے مطابق نہ ہو تو وہ قابل رد (rejected) ہے۔

بدعت کے موضوع پر علماء نے بے شمار کتابیں اور مضامین شائع کئے ہیں۔ اور بدعت والی چیزوں پر سخت نکیر کی ہے۔ مگر عام طور پر لوگ "بدعت" کے نام سے صرف کچھ خاص چیزوں کو جانتے ہیں

اور انھیں کے خلاف لکھتے اور بولتے رہتے ہیں۔ مثلاً قبروں پر گنبد بنانا، جماعت کی صورت میں بیک آواز ذکر کرنا، یہ عقیدہ رکھنا کہ اولیا اپنی وفات کے بعد امور دنیا میں تصرف کرتے ہیں، یا یہ کہ ولی، نبی سے افضل ہوتا ہے۔ صرف اللہ کا لفظ پکار کر اللہ کا ذکر کرنا، با جماعت نماز کے بعد خود اپنے دائیں بائیں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا، وغیرہ۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ بدعت کی بہت سی اس سے بھی زیادہ بڑی بڑی قسمیں ہیں جن میں موجودہ مسلمان مبتلا ہیں۔ حتی کہ خود خبا بدعتی بدعت بھی ان میں ملوث ہیں۔ مثلاً گمراہ فرقوں یا غیر مسلموں سے سنجیدہ دعوت رسانی کے بجائے مناظرہ بازی کرنا۔ مدعو قوم سے اعراض کے بجائے جھگڑا کرنا مسلم حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی مہم چلانا وغیرہ۔

اس قسم کے کام موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں بہت بڑے پیمانہ پر رائج ہیں۔ حالاں کہ ان کاموں پر حدیث کے مذکورہ الفاظ صادق آتے ہیں۔ یہ سب کام وہ ہیں جو رسول اور اصحاب رسول کے عمل کے مطابق نہیں۔ اس لئے وہ بدعت ہیں اور، حدیث کے مطابق، ہر بدعت قابل رد ہے۔

۲ ستمبر ۱۹۸۳

تالمود میں ہے کہ سب سے بڑا ہیرو وہ ہے جو اپنے دشمن کو اپنا دوست بنا لے:

The greatest hero is he who makes his enemy his friend.

یہ وہی بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو، پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی قریبی دوست (حم السجدہ ۳۴)

۳ ستمبر ۱۹۸۳

قاضی محمد عدیل عباسی اپنی کتاب تحریک خلافت (مطبوعہ ۱۹۷۸) میں لکھتے ہیں کہ ۱۹۱۲ میں ترکوں نے صلیب احمر کے جواب میں ہلال احمر کمیٹی بنائی تھی۔ اس کی تقلید میں ہندستان کے ہر شہر میں ہلال احمر کمیٹیاں قائم ہو گئیں۔ مولانا محمد علی نے کامریڈ میں جب وفد انصاری کے لئے چندہ کی اپیل کی تو مسلمانوں نے کس طرح لبیک کہا، اسے میر محفوظ علی کی زبان میں سنئے جو مولانا محمد علی کے ساتھی اور کامریڈ

کے منیجر تھے، وہ فرماتے ہیں: "اپیل نے کامریڈ کے دفتر میں روپیوں کی بارش شروع کر دی۔ کامریڈ کے فائل گواہ ہیں کہ ایک ایک دن میں دس دس، پندرہ پندرہ ہزار روپے موصول ہوئے ہیں۔ اور میں گواہ ہوں کہ منی آرڈر اور پارسلوں پر دستخط کرتے کرتے میرا ہاتھ شل ہو گیا ہے۔" صفحہ ۴۴

مسلمانوں نے روپیہ کی بارش کر دی، مگر خدا کی رحمت کی بارش نہیں ہوئی۔ کیسی عجیب بات ہے یہ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خدا کا مطلوب کام نہ تھا۔ اگر کوئی قوم خدا کی مرضی کے لئے روپیوں کی بارش کرے تو ناممکن ہے کہ اس قوم پر خدا کی بارش نہ پھٹ پڑے۔

۴ ستمبر ۱۹۸۳

مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا محمود حسن صاحب کے شاگرد خاص تھے۔ وہ کل قرآن کو جہاد کی تشریح میں تبدیل کئے ہوئے تھے (صفحہ ۴۵)، قاضی محمد عدیل عباسی نے لکھا ہے کہ "مورخ نجیب آبادی نے مجھ سے کہا کہ مولانا سندھی نے ان سے پوچھا کہ ایک لفظ میں بتاؤ کہ قرآن کی تعلیم کا منشا کیا ہے۔ پھر خود ہی کہا کہ حکومت" تحریک خلافت (مطبوعہ ۱۹۷۸) صفحہ ۴۶

یہی اس زمانہ میں علماء دیوبند کا عام ذہن تھا۔ وہ سارے دین کو حکومت اور سیاسی جہاد کے ہم معنی سمجھے ہوئے تھے۔ مگر اس نظریہ کا ماخذ یقینی طور پر قرآن نہ تھا۔ بلکہ وہ مخصوص سیاسی حالات تھے جن کے درمیان یہ علماء اپنے آپ کو پا رہے تھے —— یہ واقعہ بتاتا ہے کہ عربی زبان جاننا، مدرسۂ دینی کا سند یافتہ ہونا، حتی کہ مخلص ہونا بھی قرآن فہمی کے لئے کافی نہیں۔ قرآن فہمی کے لئے شرط لازم یہ ہے کہ آدمی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔ اس کو خدا کی توفیق سے اَرِنا الاشیاء کما ھی والی نگاہ حاصل ہو گئی ہو۔

۵ ستمبر ۱۹۸۳

"اونٹوں نے راگ چھیڑا، گدھوں نے رقص کیا" یہ ایک مثل ہے جو پرانے زمانے کے ایک قصہ پر مبنی ہے۔ یہ مثل موجودہ زمانہ کے مسلمانوں پر پورے طور پر صادق آتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین اونٹوں کی طرح بے معنی راگ چھیڑتے رہے اور مسلم عوام اس کے اوپر گدھوں کی طرح بے معنی رقص کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جان و مال کی بے حساب قربانیوں کے باوجود مسلمانوں کے حصہ میں کچھ نہ آیا۔ یہ الفاظ بلاشبہہ بے حد سخت ہیں۔ مگر میں کیا کروں کہ میرا مطالعہ مجھے جس نتیجہ پر پہنچاتا ہے

وہ یہی ہے۔

۶ ستمبر ۱۹۸۳

ایک عربی مقولہ ہے: الاستقامة فوق الكرامة (استقامت کرامت سے بھی اوپر ہے)، یعنی آدمی اگر استقلال کے ساتھ کام کرے تو وہ اس سے بھی زیادہ بڑی کامیابی حاصل کرے گا جو کوئی صاحبِ کرامت آدمی کرامت کے ذریعہ حاصل کر سکتا ہے۔

۷ ستمبر ۱۹۸۳

اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے ایک بار حج ادا کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ اپنی سواری تیز دوڑانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے عرفہ کے خطبہ میں فرمایا:

ليس السابق من سبق بعيره وفرسه	آگے بڑھنے والا وہ نہیں جس کا اونٹ اور گھوڑا آگے بڑھ جائے۔ آگے بڑھنے والا وہ ہے جس کو بخش دیا جائے۔
ولكن السابق من غُفِرَ له	

(جامع الاصول، الجزء الثالث، صفحہ ۲۴۹)

یہی بات ہر عبادتی فعل پر صادق آتی ہے۔ مثلاً مسجدوں میں لوگ نماز پڑھنے کے لئے آتے ہیں تو پچھلی صف کے نمازیوں کی گردنیں پھاندتے ہوئے اگلی صف میں پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالاں کہ اگلی صف کا ثواب اس شخص کے لئے ہے جو نماز کو اپنی زندگی میں سب سے آگے جگہ دے۔ نہ کہ اس کے لئے جو کسی نہ کسی طرح گھس کر اگلی صف میں اپنا مصلّٰی بچھا دے۔

۸ ستمبر ۱۹۸۳

مشہور جرمن فلسفی اسپنوزا (۱۶۷۷ - ۱۶۳۲) یہودی خاندان میں پیدا ہوا تاہم وہ بائبل بلکہ خود مذہب کا زبردست ناقد تھا۔ اس کو عام طور پر ملحد سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کی زندگی بتاتی ہے کہ دولت کی حرص اس کے اندر بالکل نہیں تھی۔ اس نے دولت حاصل کرنے کے کئی اعلیٰ مواقع بے نیازانہ طور پر ٹھکرا دئے۔

وہ جرمن کے علاوہ لاتینی، یونانی اور انگریزی زبان جانتا تھا۔ ایک یونیورسٹی میں اس کو فلسفہ کے استاد کی جگہ کی پیشکش کی گئی۔ اس نے یہ کہہ کر اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ فلسفہ کوئی بیچنے کی

چیز نہیں :

Philosophy is not for sale.

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی بے نیازی کا تعلق لازمی طور پر "تقویٰ" سے نہیں ہے۔ وہ ایسے افراد میں بھی پائی جا سکتی ہے جن کا تعلق نہ تقویٰ سے ہو اور نہ خدا پرستی سے۔

۹ ستمبر ۱۹۸۳

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ گنتی کر کے مجھے بتاؤ کہ کلمہ اسلام کا اقرار کرنے والے لوگ یہاں کتنے ہیں۔ چنانچہ گنتی کی گئی تو کل ایک ہزار پانچ سو افراد تھے (قال صلی اللہ علیہ وسلم بعد الهجرة : احصوا لی عدد من یلفظ بالاسلام۔ فاحصواله۔ فکانوا الفاً وخمس مائة ، رواه البخاری ومسلم)

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان جو "رسول" کے نام پر اپنی تحریکیں چلاتے ہیں، ان کے یہاں اس قسم کی کوئی کوشش نہیں پائی جاتی۔ حتی کہ اگر کوئی شخص اس قسم کی معلومات جمع کرے تو اس کو دنیادارانہ عمل سمجھا جائے گا۔ مثلاً ہندستان کے علماء نے کبھی یہ نہیں کیا کہ وہ ملک کے مدرسوں اور مسجدوں کی تعداد کا پتہ لگائیں۔ ہندستان کا ہر مسلمان "فساد" کے مسئلہ پر بولتا ہے، مگر پچھلی نصف صدی میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ فسادات کی باقاعدہ فہرست بنائی جائے۔ مسلمانوں کی دینی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی حالت پر ہر آدمی رائے زنی کر رہا ہے۔ مگر کسی نے بھی باقاعدہ جائزہ لے کر اس سلسلہ کے اعداد و شمار جمع نہیں کئے، وغیرہ۔

۱۰ ستمبر ۱۹۸۳

حدیث میں لایعنی (بے فائدہ) کلام سے روکا گیا ہے۔ بے فائدہ کلام کیا ہے، مختلف لوگوں نے اپنے اپنے الفاظ میں اس کی تشریح کی ہے۔ امام غزالی کا قول ہے کہ بے فائدہ کلام وہ ہے کہ اگر تم چپ رہو تو تمہیں اس کی وجہ سے کوئی گناہ نہ ہو (وحد الکلام فیما لا یعنیك ان تتكلم بكلام لو سكت عنه لم تاثم)

۱۱ ستمبر ۱۹۸۳

ایک اہل حدیث عالم کا مضمون پڑھا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "احادیث صحیحہ سے ثابت

ہے کہ نماز خواہ سری ہو یا جہری۔ امام ہو یا مقتدی، ہر ایک کے لئے رکوع سے قبل قیام میں سورہ فاتحہ پڑھنا فرض ہے۔ اس کے بغیر نماز نہیں ہوگی۔" انھوں نے احناف کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "انھیں چاہئے کہ اپنی نمازیں صحیح کرلیں۔ ایسا نہ ہو کہ حشر کے دن ان کے نامۂ اعمال نماز سے خالی ہوں۔ جو زندگی بھر حق ظاہر ہو جانے کے بعد جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کی فرضیت سے انکار کرکے اس کو ترک کرتے رہے۔"

انھوں نے اپنی دلیل میں وہ احادیث پیش کی ہے جو امام بخاری نے عبادہ بن صامت رضؓ سے نقل کیا ہے: لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب۔ مگر قرین قیاس یہ ہے کہ اس طرح کی روایتوں کا تعلق عموم سے ہے نہ کہ استثناء سے۔ قرآن میں ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو سنو اور چپ رہو۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ من کان لہ امام فقراءۃ الامام قراءۃ لہ (جس شخص نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو امام کی قرأت اس کے لئے کافی ہے)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکیلی نماز یا سری نماز میں فاتحہ پڑھنا ضروری ہے۔ مگر جب امام آواز سے قرأت کر رہا ہو تو اس کی قرأت مقتدی کے لئے کافی ہو جائے گی۔ البتہ عشاء کی نماز میں ابتدائی دو رکعتوں میں امام کی قرأت مقتدی کے لئے کافی ہے۔ اور بعد کی دو رکعتوں میں مقتدی کو فاتحہ پڑھنا چاہئے۔

امام مسلم نے ابوہریرہ رضؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے نماز ادا کی اور اس میں سورہ فاتحہ کی قرأت نہ کی تو اس کی نماز ناقص ہے، پوری نہیں۔ آپ نے تین بار فرمایا۔ ابوہریرہ سے پوچھا گیا کہ جب ہم امام کے پیچھے ہوں۔ ابوہریرہ نے کہا: اقرأ بہا فی نفسك۔ مذکورہ اہل حدیث عالم نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ آہستہ آواز سے پڑھ لیا کرو۔

یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ ان الفاظ کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا: اسے جی میں پڑھ لو۔ غالباً اقرأ بہا فی نفسك سے مراد معنوی قرأت ہے۔ امام کی قرأت کے وقت اگر مقتدی اس کی پوری طرح سماعت کرے تو عملاً یہ ہوگا کہ جس وقت امام لفظی قرأت کر رہا ہوگا، مقتدی اس کی معنوی ادائگی کر رہا ہوگا۔ اور غالباً اس فقرہ سے یہی مراد ہے۔

۱۲ ستمبر ۱۹۸۳

اسلامی فقہ میں پانی کی طہارت کے بارہ میں جو مسائل ہیں، ان میں سے ایک مسئلہ یہ ہے

کہ آدمی کا جھوٹا پاک ہے (سور الآدمی طاھر)

یہ نہیں کہا گیا کہ سور المؤمن طاھر (مومن کا جھوٹا پاک ہے) بلکہ یہ کہا گیا کہ آدمی کا جھوٹا پاک ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کی تعلیمات میں کس قدر وسعت اور آفاقیت ہے۔ اس فقہی مسئلہ کے مطابق، اگر کسی غیر مسلم شخص نے پانی جھوٹا کر دیا ہے تو اس کا جھوٹا پانی ناپاک نہیں ہوا۔ اس کو پیا جا سکتا ہے اور اس سے وضو کیا جا سکتا ہے۔ اس معاملہ میں صرف ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ مذکورہ غیر مسلم نے پانی پینے سے فوراً پہلے کوئی حرام چیز نہ کھائی ہو۔ تاہم اس شرط کا تعلق صرف غیر مسلم سے نہیں، اس کا تعلق خود مسلمان سے بھی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ مسئلہ میں پانی کو دیکھا جائے گا نہ کہ پانی پینے والے کو۔ اسلام کی تمام تعلیمات اسی طرح حقیقت پسندی پر مبنی ہے۔

۱۳ ستمبر ۱۹۸۳

بیسویں صدی مسلم تحریکوں کی صدی ہے، اس کے ساتھ مسلم ناکامی کی صدی بھی۔ بے شمار ہنگامہ آرائی کے باوجود، اس صدی میں مسلمانوں کا کوئی ایک مسئلہ بھی حل نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے صحیح ڈھنگ پر کوئی کام ہی نہیں کیا۔ اس مدت میں مسلم رہنماؤں نے جو کچھ کیا، اس کو چند قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

شاعرانہ خیال آرائی

خطیبانہ لفاظی

صحافتی اشتعال انگیزی

سیاسی داد اگیری

مگر یہ سب مسائل کو بڑھانے والی چیزیں ہیں نہ کہ مسائل کو حل کرنے والی چیزیں۔ مسائل ہمیشہ حکیمانہ تدبیر سے حل ہوتے ہیں نہ کہ مذکورہ قسم کی ہنگامہ آرائی سے۔

۱۴ ستمبر ۱۹۸۳

علامہ السیوطی (۹۱۱ - ۸۴۹) اور علامہ السخاوی (۹۰۲ - ۸۱۳ ھ) دونوں علماء امت میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ علامہ سیوطی کی تصنیفات ہر موضوع پر ہیں۔ ان کی تعداد بعض لوگوں نے تقریباً

چھ سو تک بتائی ہے۔ انھوں نے طلب علم کے لئے مصر کے علاوہ شام، حجاز، یمن، ہندستان مغرب اور دوسرے ملکوں کا سفر کیا۔ ان کے اساتذہ کی تعداد ۱۵۱ تک شمار کی گئی ہے۔

علامہ سخاوی نے علامہ سیوطی کی بابت لکھا ہے کہ ان کی مؤلفات کی تعداد اتنی زیادہ اس لئے ہے کہ وہ دوسروں کی کتابوں کو اپنے نام کے ساتھ منسوب کر لیتے تھے۔ ان کی مؤلفات میں بہت سی کتابیں ان کے شیوخ (اساتذہ) کی ہیں جن پر انھوں نے بحیثیت مؤلف اپنا نام لکھ دیا۔ اسی طرح انھوں نے کتب خانوں سے کتابیں لیں۔ ان میں معمولی تبدیلی کی، مثلاً آگے کی بحث کو پیچھے اور پیچھے کی بحث کو آگے کر دیا اور اس کو اپنے نام کے ساتھ منسوب کر لیا (السخاوی، الضوء اللامع)

ضروری نہیں کہ علامہ سخاوی کی یہ بات صحیح ہو۔ مگر اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن شخصیتوں کو لوگ آج انتہائی احترام کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، ان کے بارہ میں کہنے والے کیا کیا باتیں کہتے رہے ہیں۔ اس قسم کے الزامات سے شاید تاریخ اسلام کی کوئی بھی شخصیت بری نہیں۔

۱۵ ستمبر ۱۹۸۳

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تین عمل آدمی کے اوپر بہت سخت ہے۔ ہر حال میں اللہ کا ذکر کرنا، بھائیوں کی اپنے مال سے مدد کرنا، اور اپنے معاملہ میں لوگوں کے ساتھ انصاف کرنا (قال علی کرم اللہ وجہہ اشد الاعمال ثلاثۃ: ذکر اللہ علیٰ کل حال، ومواساۃ الاخوان بالمال، وانصاف الناس من نفسك)

۱۶ ستمبر ۱۹۸۳

فقہاء نے مصلحت شرعی کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ مصالح معتبرہ، اور مصالح ملغاۃ۔ مصالح معتبرہ سے مراد وہ مصلحت ہے جس کا شریعت نے اعتبار کیا ہو۔ اور مصالح ملغاۃ سے مراد وہ مصلحت ہے جس کو شریعت نے لغو قرار دیا ہو۔

جان کی حفاظت کے لئے شریعت نے قصاص کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح مال کی حفاظت کے لئے سرقہ کی حد مقرر کی ہے۔ یہ مصالح معتبرہ کی مثالیں ہیں۔ حضرت عمر نے تقسیم وظائف کے لئے رجسٹر بنانے کا حکم دیا جو پہلے نہ تھا، یہ استنباطی طور پر مصالح معتبرہ میں شمار کیا جائے گا۔

میراث میں قرآن نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ مرد کو عورت سے دگنا حصہ دیا جائے (النساء ۱۱)

اب اگر کوئی شخص بطور خود کوئی وجہ بتا کر یہ کہے کہ مرد اور عورت دونوں کو برابر کا حصہ ملنا چاہئے تو یہ ایک لغو مصلحت ہوگی جس کا اعتبار کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ مصالح ملغاۃ کی مثال ہے۔ اسی طرح ہر معاملہ میں کوئی مصلحت قابل اعتبار ہوتی ہے اور کوئی مصلحت ناقابل اعتبار۔

۱۷ ستمبر ۱۹۸۳

علماء اور بزرگوں کے بارہ میں بہت سے ایسے قصے کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں جو مجھے فرضی اور بناوٹی معلوم ہوتے ہیں، کیوں کہ وہ فطرت کے خلاف ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ سلطان غوری نے ایک بار علامہ سیوطی کے پاس ایک ہزار دینار کی تھیلی بھیجی۔ انھوں نے اس کو لوٹا دیا اور بادشاہ کے فرستادہ سے کہا کہ ہمارے پاس پھر کبھی کوئی ہدیہ مت لانا۔ کیوں کہ اللہ نے ہم کو اس قسم کی چیزوں سے بے نیاز کر دیا ہے (فردّ الدنانير وقال لرسول السلطان: لاتعد تاتينا قطّ بهدية فان الله أغنانا عن مثل ذالك)

یہ واقعہ علامہ سیوطی کے زہد و تقویٰ کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ مگر زہد و تقویٰ آدمی کے اندر تواضع پیدا کرتا ہے، جب کہ اس واقعہ میں مجھے کبر کا شائبہ دکھائی دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہدایا آتے تھے، مگر کبھی آپ نے کسی صاحب ہدیہ سے مذکورہ قسم کا معاملہ نہیں فرمایا۔ زہد و تقویٰ وہی ہے جس کا نمونہ سنت رسول میں موجود ہو، جو نمونہ سنت رسول میں موجود نہ ہو، وہ کچھ اور تو ہو سکتا ہے مگر وہ زہد و تقویٰ نہیں ہو سکتا۔

۱۸ ستمبر ۱۹۸۳

خوارج کے فرقہ ضالّہ ہونے پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ وہ اپنی تمام تر گمراہی کے باوجود نہایت صاحب کردار لوگ تھے۔ امام ابن تیمیہ نے ان کے بارہ میں لکھا ہے کہ خوارج دین سے نکل جانے کے باوجود لوگوں میں سب سے زیادہ سچے ہیں، یہاں تک کہ کہا گیا ہے کہ ان کی حدیثیں سب سے زیادہ صحیح حدیثیں ہیں (الخوارج مع مروقهم من الدين فهم أصدق الناس حتى قيل انّ حديثهم أصحّ الحديث، منهاج الاعتدال)

قدیم زمانہ میں تمام گمراہ افراد اور گمراہ فرقوں نے اپنی اپنی تائید میں حدیثیں گھڑیں۔ مگر خوارج سے غالباً کوئی بھی موضوع حدیث ثابت نہیں۔ علماء میں سے کسی نے ان پر وضع حدیث کا الزام

نہیں لگایا ہے۔ البتہ بعض افراد مثلاً ابن لُہیعہ نے ان کو حدیث وضع کرنے والوں میں شمار کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی دلیل یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک خارجی عالم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ یہ حدیثیں دین ہیں۔ پس تم خوب دیکھ لیا کرو کہ تم کس سے اپنا دین لے رہے ہو۔ کیوں کہ ہم جب کسی چیز کے خواہشمند ہوتے ہیں تو اس کو حدیث کی صورت دے دیتے ہیں (ان ھذہ الاحادیث دین فانظروا عمّن تأخذون دینکم فانّا کنّا اذا ھوینا امراً صیّرناہ حدیثاً)

تاہم محض اس واقعہ سے ابن لُہیعہ کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔ کیوں کہ خارجی عالم کے اس قول میں "ہم" سے مراد عام مسلمان ہیں نہ کہ خارجی فرقہ۔

۱۹ ستمبر ۱۹۸۳

ایک "حدیث" ہے کہ الایمان قول وعمل یزید وینقص ومن قال غیر ذالك فهو مبتدع (ایمان قول اور عمل ہے۔ وہ بڑھتا ہے اور گھٹتا ہے اور جو شخص اس کے علاوہ کہے تو وہ بدعتی ہے) دوسری "حدیث" ہے کہ من زعم الایمان یزید وینقص فزیادته نفاق ونقصانه کفر فان تابوا والّا فاضربوا أعناقهم بالسیف (جس شخص نے یہ خیال کیا کہ ایمان بڑھتا ہے اور گھٹتا ہے تو اس کا زیادہ ہونا نفاق ہے اور اس کا کم ہونا کفر ہے۔ ایسا شخص توبہ کرے تو ٹھیک ہے ورنہ تلوار سے اس کی گردن ماردو)

ایک عام آدمی ان دونوں اقوال کو پڑھے تو وہ حیرانی میں پڑ جائے گا۔ کیوں کہ دونوں میں تضاد ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ موضوع فقرے ہیں، وہ حدیث رسول نہیں ہیں۔ عباسی دور میں مسلمانوں کے اندر جو بحثیں پیدا ہوئیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ایمان یکساں حالت میں رہتا ہے یا زیادہ اور کم ہوتا ہے۔ اس بحث میں دو فریق بن گئے اور دونوں نے اپنے اپنے حق میں فرضی حدیثیں گھڑیں۔ مذکورہ دونوں "حدیثوں" میں اول الذکر احمد بن محمد بن حرب کی گھڑی ہوئی ہے اور ثانی الذکر محمد بن قاسم الطایکانی کی گھڑی ہوئی۔

۲۰ ستمبر ۱۹۸۳

شعور کی مختلف سطحیں ہیں۔ اگر ایک شخص شعور کے اعتبار سے مادی سطح پر ہو تو وہ غیر مادی (روحانی) حقیقتوں کا ادراک نہیں کر سکتا۔ مثلاً ایک مستشرق نے پیغمبر اسلام کے بارہ میں ایک کتاب لکھی

ہے۔ غار حرا، کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ محمدؐ جو دعوئے نبوت سے پہلے غار حرا میں جاتے تھے، اس کا مقصد تحنث (عبادت) نہیں ہوتا تھا، جیسا کہ مسلمان عام طور پر سمجھتے ہیں۔ اس کا مقصد گرمیاں گزارنا ہوتا تھا۔ مکہ کے دولت مند مکہ کی گرمی سے بچنے کے لئے موسم گرما میں طائف جایا کرتے تھے۔ محمد اپنے افلاس کی وجہ سے ایسا نہیں کرسکتے تھے، اس لئے وہ حرا کے غار میں چلے جاتے تھے تاکہ وہاں گرمیاں گزار سکیں (ان اغنیاء مكة كانوا يذهبون الى الطائف هربا من حرّها اما هو فلم يكن فى وسعه مجاراتهم لفقره. ولذالك كان يذهب الى غار حراء ليصطاف) میں نے اصل کتاب نہیں دیکھی ہے۔ البتہ عربی ترجمہ میں اس کے الفاظ یہی ہیں۔

آدمی کے شعور کا ارتقا جس سطح کا ہوگا، اسی سطح کے حقائق اس کی گرفت میں آئیں گے۔

۲۱ ستمبر ۱۹۸۳

حج کے ارکان حنابلہ کے نزدیک چار ہیں: الاحرام، والوقوف بعرفة، وطواف الافاضة، والسعى بين الصفا والمروة۔ شافعیہ کے نزدیک حج کے ارکان پانچ ہیں۔ چار مندرجہ بالا اور پانچواں: الحلق او التقصير۔ احناف کے نزدیک حج کے ارکان صرف دو ہیں: الوقوف بعرفة، ومعظم طواف الافاضة۔

یہ تو صرف بڑے اختلاف کی مثال ہے۔ ورنہ حج کی تفصیلات (اور اسی طرح دوسری عبادتوں کی تفصیلات) میں بے شمار اختلافات ہیں جن کی گنتی کرنا بھی مشکل ہے۔ میرے نزدیک یہ سب غیر ضروری ہے۔ مثلاً مذکورہ فرق کو لیجئے۔ فقہا کے درمیان اگرچہ ارکان حج کی تعداد مقرر کرنے میں اختلاف ہے۔ تاہم اس میں سب متفق ہیں کہ مذکورہ ارکان میں سے کسی ایک رکن کا ترک بھی مذکورہ باطل کر دیتا ہے (كلهم متفقون على ان ترك ركن من اركان الحج يبطل الحج) جب حج کی صحیح ادائگی کے لئے مذکورہ تمام ارکان پر عمل کرنا ضروری ہو تو پھر غیر ضروری فنی بحثیں نکال کر ان کی تعداد میں فرق کرنے کی کیا ضرورت۔

۲۲ ستمبر ۱۹۸۳

جمہور فقہا کی رائے ہے کہ جو شخص مرجائے اور اس پر حج فرض رہا ہو تو اس کے وارث پر واجب ہے کہ میت کی طرف سے حج کرے یا اس کی طرف سے کسی کو حج کرولے، خواہ مرے ہوئے

شخص نے حج کی وصیت کی ہو یا وصیت نہ کی ہو۔ امام مالک کا قول ہے کہ میت کی طرف سے حج اس وقت ضروری ہے جب کہ اس نے وصیت کی ہو، ورنہ نہیں۔ کیوں کہ حج ان کے نزدیک بدنی عبادت ہے۔ اس میں نیابت نہیں۔ (جمهور الفقهاء يرى ان من مات وعليه حجة الاسلام وجب على وليه ان يحج عنه او يجهز من يحج عنه من ماله، سواء اوصى الميت بالحج ام لم يوص. وقال الامام مالك. يجب الحج عن الميت ان كان قد اوصى بذالك. اما اذا لم يوص بالحج فلا يجب الحج عنه. لان الحج عنده عبادة بدنية لاتقبل النيابة)

اس مسئلہ کی بنیاد بخاری کی ایک روایت پر ہے جس میں ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ میری ماں نے حج کی نذر کی تھی۔ مگر وہ حج کئے بغیر مر گئی۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کروں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ اس حدیث میں اس آدمی کا ذکر ہے جس نے حج کی نیت کر رکھی تھی، مگر ادائگی سے پہلے اس کی وفات ہوگئی۔ دوسری ایسی کوئی روایت نہیں جس میں میت کی طرف سے عمومی طور پر حج کی ادائگی کی ہدایت کی گئی ہو۔

میرے نزدیک اس معاملہ میں امام مالک کا مسلک صحیح ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صرف مالی قرض ایک ایسی چیز ہے جس میں استثنائی طور پر یہ حکم ہے کہ میت کی طرف سے ہر حال میں اس کو ادا کیا جائے۔ عبادتی امور میں صرف نیت کا اعتبار کیا جائے گا۔ (بخاری کی مذکورہ روایت میں دَین (قرض) کا لفظ ہے، مگر وہ مجازی معنی میں ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں۔ اس سے انسانی قرض پر قیاس نہیں کیا جاسکتا)

۲۳ ستمبر ۱۹۸۳

عام طور پر تفسیر قرآن کی دو قسمیں سمجھی جاتی ہیں۔ تفسیر بالماثور، اور تفسیر بالرای۔ یعنی حدیث اور اثر سے قرآن کی تفسیر کرنا، اور اپنی رائے سے تفسیر کرنا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک غیر واضح تقسیم ہے۔ میرے نزدیک صحیح تقسیم دوسری ہے، اور وہ مخلص اور غیر مخلص کی ہے۔

آدمی اگر غیر مخلص ہو تو ایسا ہوسکتا ہے کہ بظاہر وہ تفسیر بالماثور پر عمل کرے مگر حقیقۃً وہ اپنی خواہش کی پیروی کر رہا ہو۔ اس کے برعکس ایک شخص اگر مخلص ہے، وہ اللہ سے ڈرنے والا ہے۔ وہ قرآن پر اور اس کے سارے متعلقہ پہلوؤں پر غور کرتا ہے جن میں احادیث و آثار بھی لازماً شامل

ہیں۔ اس کے بعد وہ دیانت دارانہ طور پر ایک رائے پر پہنچتا ہے۔ کسی شخص کو اس کی تفسیر بظاہر تفسیر بالرای نظر آسکتی ہے۔ مگر حقیقۃً وہ عین وہی چیز ہوگی جس کے لئے تفسیر بالماثور کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، میں عملاً تفسیر بالماثور ہی پر عمل کرتا ہوں۔ کسی آیت کی جو تفسیر سلف سے منقول ہے، میں اسی کو اختیار کرتا ہوں، تذکیر القرآن میں میں نے یہی کیا ہے۔ اس میں علمار سلف کی تفسیر کو اپنی زبان اور اسلوب میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲۴ ستمبر ۱۹۸۳

عن ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ قال کنّا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فکنا اذا اشرفنا علیٰ وادٍ ھلّلنا وکبّرنا وارتفعت اصواتنا۔ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: یاایھا النّاس، اربعوا علیٰ انفسکم فانکم لاتدعون اصمّ او غائباً انہ معکم انہ سمیع قریب۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے۔ جب ہم کسی وادی پر پہنچے تو ہم لاالٰہ الاّ اللہ اور اللہ اکبر کہتے۔ اور ہماری آوازیں بلند ہوگئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو، اپنی جانوں کو آرام دو۔ کیوں کہ تم کسی بہرے یا کسی غائب کو نہیں پکار رہے ہو۔ وہ تو تمہارے ساتھ ہے، وہ سننے والا ہے، قریب ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان جس طرح لاؤڈ اسپیکر پر پرشور انداز میں اپنی مذہبی تقریبات کرتے ہیں، اس کو سن کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خدا کو واقعۃً وہی سمجھ لیا ہے جو پیغمبر اسلام نے فرمایا تھا۔

۲۵ ستمبر ۱۹۸۳

قالوا: اِذا اردتَ مصاحبۃَ رجل فاغضبہ فان ملک نفسہ فصاحبہ والّا فلا تصاحبہ (کہا گیا ہے کہ اگر تم کسی کو اپنا ساتھی بنانا چاہو تو اس کو غصہ دلاؤ۔ اگر وہ اپنے آپ پر قابو رکھے تو اس کو ساتھی بناؤ، ورنہ اس کو اپنا ساتھی نہ بناؤ)

کوئی شخص معمول کے حالات میں اچھا نظر آئے تو یہ اس کے اچھا ہونے کا کافی ثبوت نہیں۔ اچھا آدمی حقیقۃً وہ ہے جو غصہ اور اشتعال کے وقت بھی اچھا آدمی ثابت ہو۔

۲۶ ستمبر ۱۹۸۳

قرآن میں ہے کہ جنات اور انسان کو میں نے صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں (الذاریات ۵۶) مجاہد کا قول ہے کہ میں نے ان کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری معرفت حاصل کریں۔ ثعلبی نے کہا کہ یہ قول عمدہ ہے۔ کیوں کہ اگر وہ ان کو پیدا نہ کرتا تو اس کا وجود اور اس کی توحید پہچانی نہ جاتی (قال مجاهد: وما خلقتهم الا ليعرفوني. قال الثعلبي: هذا قول حسن لانه لو لم يخلقهم لما عرف وجوده وتوحيده)

آیت کی یہ نہایت صحیح تشریح ہے۔ جہاں تک میں نے سمجھا ہے، بندوں سے اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ معرفتِ رب ہے۔ یعنی اللہ کے وجود کا زندہ ادراک۔ اس کو دیکھے بغیر دیکھ لینا۔ اپنے آس پاس اس کی موجودگی (presence) کو محسوس کرنے لگنا۔

۲۷ ستمبر ۱۹۸۳

علامہ اقبال نے لکھا ہے کہ "مسلمانوں کے تنزل کا انتہائی نقطہ ۱۷۹۹ تھا جب ترکوں کا بیڑہ غرق اور سلطان ٹیپو کو شہید کر دیا گیا"

یہ بظاہر ایک سادہ سی بات ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ صحیح نہیں۔ اس کی غلطی یہ ہے کہ اس میں ترقی اور تنزل کو محض ایک سیاسی واقعہ سمجھ لیا گیا ہے۔ اس تبصرہ کے مطابق اقتدار کا مطلب ترقی ہے۔ اور اقتدار سے محرومی کا مطلب تنزل۔

اسی غلط فکر کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان "۱۷۹۹" سے لے کر اب تک اپنی ساری طاقت کسی نہ کسی اعتبار سے سیاسی تحریکوں میں لگائے ہوئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سیاست ہی کے میدان میں ان کی ترقی اور تنزل کا فیصلہ ہوگا، اس لئے ساری توجہ سیاسی حیثیت حاصل کرنے پر لگاؤ۔ اگر مسلمان یہ سمجھتے کہ ان کی ترقی اور تنزل حقیقۃً دعوت سے وابستہ ہے تو وہ دعوت کے میدان میں اپنی قوت صرف کرتے۔

۲۸ ستمبر ۱۹۸۳

ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ آپ دوسروں پر تنقید کرنا چھوڑ دیں۔ اور صرف مثبت موضوعات پر لکھیں، مثلاً مذہب اور جدید چیلنج وغیرہ۔ اس کے بعد کسی کو آپ سے شکایت نہیں ہوگی۔ اور آپ کے قارئین اور ہمدردوں کا حلقہ بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔

میں نے کہا کہ آپ یہ مشورہ اس لئے دے رہے ہیں کہ آپ نے ابھی تک ہمارے مقصد کو نہیں سمجھا۔ ہمارا مقصد Intellectual entertainment نہیں۔ اور نہ تجارت کرنا ہمارا مقصد ہے۔ یہ مشکل مشن ہم نے اس لئے نہیں کھڑا کیا ہے کہ کچھ لوگوں کے لئے ذہنی تفریح کا سامان فراہم کریں۔ ہمارا اصل مقصد باطل کا پردہ پھاڑنا ہے۔ دین حق کے اوپر جو گرد پڑ گئی ہے اس کو اس سے ہٹانا ہے۔ تاکہ آدمی خدا کے دین کو اس کے اصلی روپ میں دیکھ سکے۔

اگر آپ ہمارے مشن کی اس نوعیت کو سامنے رکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ موجودہ انداز ہی صحیح ترین انداز ہے۔ اس انداز میں تبدیلی خود مقصد میں تبدیلی کے ہم معنی ہوگی۔

۲۹ ستمبر ۱۹۸۳

بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس شخص کی تلاوت قرآن جائز نہیں جو تجوید کے ساتھ قرآن کی تلاوت نہ کرے۔ اس لئے کہ تجوید کے ساتھ تلاوت کرنا فرض ہے، جب کہ قرآن کی تلاوت مطلقاً نفل ہے۔ اس بنا پر فرض کو ترک کرنا نفل کی وجہ سے جائز نہیں۔ لہٰذا ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ علم تجوید سیکھے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں خود فرماتا ہے: ورتل القرآن ترتیلا

مذکورہ مسئلہ کا قرآن کی اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ ترتیل اور تجوید دونوں ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ ترتیل کے معنی ہیں ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا۔ اور تجوید کے معنی ہیں اصول قرأت کے مطابق مخارج اور غناء کے ساتھ پڑھنا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ تجوید نہ فرض ہے اور نہ نفل۔ وہ ایک فن ہے۔ اس کو زیادہ سے زیادہ فن قرأت کہا جا سکتا ہے نہ کہ واجب یا فرض۔

ترتیل حقیقۃً تدبر کی ظاہری صورت ہے۔ آدمی جب کسی عبارت کو اس کے معنی پر پورا دھیان دیتے ہوئے اور غور کرتے ہوئے پڑھے تو اس سے جو انداز قرأت بنے گا اسی کا نام ترتیل ہے۔ قرآن کی تلاوت کے سلسلہ میں اصل اہمیت کی چیز تدبر و تفکر ہے نہ کہ الفاظ کی حسن ادائگی۔

۳۰ ستمبر ۱۹۸۳

صحابہ اور تابعین کے زمانہ تک دین سادہ اور فطری حقیقت کا نام تھا۔ اس کے بعد فنی بحث کا آغاز ہوا۔ اس نے دین میں بے شمار اختلافات پیدا کر دئے۔ حتی کہ شریعت کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں رہا جس میں علماء کے درمیان اختلاف نہ پایا جاتا ہو۔

"سنت" ایک ایسی چیز ہے جس پر دین کی بنیاد قائم ہے۔ بظاہر اس میں اختلاف نہیں ہونا چاہئے تھا۔ مگر فنی موشگافیوں نے اس میں بھی اختلاف پیدا کر دیا۔ مثلاً ایک سوال یہ قائم کیا گیا کہ سنت کیا ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ سنت سے مراد صرف سنت رسول ہے۔ دوسرے لوگوں نے کہا کہ سنت میں سنت صحابہ بھی شامل ہے —— اس سے مراد دین میں چلا ہوا طریقہ ہے، خواہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر چلے ہوں یا آپ کے اصحاب اس پر چلے ہوں۔ امام شافعی نے کہا کہ نہیں، سنت صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے، چاہے وہ آپ کا قول ہو یا آپ کا فعل ہو۔ یہ اس لئے کہ امام شافعی تقلید صحابی کے قائل نہیں ہیں:

(السنة الطريقة المسلوكة في الدين) المسلوكة في الدين سواء سلكها النبي صلى الله عليه او اصحابه. وقال الشافعي السنة هي طريقة النبي صلى الله عليه وسلم عن قوله اوفعله فقط. لانه لايرى تقليد الصحابي.

اوپر کی عبارت میں بریکٹ والا فقرہ علامہ حسام الدین (م ۶۴۴ھ) کی کتاب حسامی کا ہے۔ اور اس کے بعد کی تشریحی عبارت مولانا نظام الدین کیرانوی کی کتاب نظامی شرح حسامی سے ماخوذ ہے۔

یکم اکتوبر ۱۹۸۳

دہلی کے ایک انگریزی اخبار میں ہر ہفتہ ایک کالم ہوتا ہے جس کا عنوان ہوتا ہے —— آخری ہفتہ پاکستان میں (Last week in Pakistan) اس کالم میں اس کے کالم نگار نے لکھا ہے کہ پاکستان کی حکومت نے اسلام کے نام پر کئی احکام جاری کئے مگر عملاً وہ چل نہ سکے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ پاکستان کے حکمراں یہ سوچ رہے ہیں کہ دفتروں میں سگرٹ نوشی کو بند کر دیا جائے۔ اس کے بعد یہ الفاظ ہیں:

This scheme will also probably end in smoke.

یہ اسکیم بھی غالباً دھوئیں میں اڑ جائے گی (ہندستان ٹائمس ۱۱ فروری ۱۹۸۳)

موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں نے اسلام کی کوئی واقعی خدمت تو نہیں کی البتہ اس کو دنیا والوں کے لئے مذاق کا موضوع بنا دیا۔

۲ اکتوبر ۱۹۸۳

یہ واقعہ جولائی ۱۹۸۳ کا ہے۔ پھاٹک حبش خاں (دہلی) کی ایک مسجد کے ذمہ داروں کو خیال آیا کہ مسجد کی توسیع کریں۔ انھوں نے مسجد سے متصل زمین کو ملا کر تین منزلہ تعمیر کا نقشہ بنایا۔ سابقہ تعمیر کے اوپر دیواریں کھڑی کرکے اس کے اوپر بیم بنائی گئی اور ابتدائی مسجد کے اوپر پہلی اور دوسری منزل تعمیر کر دی گئی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے کیا گیا کہ ایک مہینہ کے اندر پوری عمارت کھڑی ہوئی تھی۔

مگر اس کے بعد ایک حادثہ ہوا۔ جس بیم پر اوپر کی منزل کھڑی ہوئی تھی وہ ٹوٹ گئی اور اس کے بعد ساری عمارت دھڑام سے گر پڑی۔ اس کے گرنے سے قدیم مسجد بھی ڈھ پڑی۔ یہ مزید تعمیر تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ میں تعمیر کرائی گئی تھی۔ اب اندازہ ہے کہ اس کو بنانے کے لئے دوبارہ تین لاکھ کی رقم درکار ہوگی۔ شکستہ عمارت کا صرف ملبہ اٹھانے میں ہزاروں روپئے خرچ ہو جائیں گے۔

اس حادثہ کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ "عجلت" تھی۔ بیم کا یہ قاعدہ ہے کہ اس کو بنانے کے بعد سوکھنے کے لئے معقول مدت تک چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲۲ انچ کی بیم ہے تو ۲۲ دن اس کو سوکھنے کے لئے چاہئے۔ مگر یہاں یہ ہوا کہ بیم بناتے ہی فوراً اس کے اوپر اگلی منزلیں تعمیر کر دی گئیں۔ اس کو سوکھنے اور پختہ ہونے کا وقت نہیں دیا گیا ——— اس مثال کے آئینہ میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی ملی تعمیر کے معاملہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔

۳ اکتوبر ۱۹۸۳

مولانا حمید الدین فراہی (۱۹۳۰ - ۱۸۶۳) کچھ دنوں تک علی گڑھ کالج میں فارسی کے استاد رہے ہیں۔ یہ سر سید احمد خاں (۱۸۹۸ - ۱۸۱۷) کا زمانہ تھا۔ سر سید نے متجددانہ انداز میں قرآن کی تفسیر اردو زبان میں لکھی تھی۔ انھوں نے بالواسطہ طور پر اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ مولانا فراہی ان کی اردو تفسیر کا عربی زبان میں ترجمہ کر دیں۔ مولانا فراہی نے جواب دیا کہ "میں اس معصیت کے کام میں شریک ہوں، مجھ سے اس بات کی کسی توقع نہیں رکھنی چاہئے"۔

مولانا فراہی نے سر سید کی متجددانہ تفسیر کا ترجمہ کرنے کو معصیت سمجھا تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ خود مولانا حمید الدین فراہی نے سورۃ الفیل کی جو تفسیر لکھی ہے وہ عین اسی قسم کی متجددانہ تفسیر ہے جس کے لئے سر سید بدنام ہیں اور جس کی وجہ سے مولانا فراہی نے ان کی تفسیر کا ترجمہ کرنے کو معصیت سمجھا تھا۔

مولانا فراہی بلاشبہ مخلص تھے۔ مگر "روایات" کو نظر انداز کر کے تفسیر کرنے کا مزاج ان پر اتنا زیادہ چھایا کہ وہ سورہ فیل کی اس انوکھی تفسیر تک پہنچ گئے جو تمام علماء اور مفسرین کے خلاف ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخلص ہو کر بھی آدمی بڑی بڑی غلطیاں کر سکتا ہے۔

۴ اکتوبر ۱۹۸۳

جرمن فلسفی کانٹ (۱۸۰۴-۱۷۲۴) یورپ کا مشہور ترین مفکر ہے۔ وہ ایک غریب گھر میں پیدا ہوا۔ اس کے سرپرست اس کا تعلیمی خرچ اٹھانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ ۱۷۴۶ سے ۱۷۵۵ تک اس کو فیملی ٹیوٹر کے طور پر کام کرنا پڑا۔ اس طرح ذاتی محنت سے اس نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد بھی اس کو صرف ایک معمولی ٹیچر کی جگہ ملی۔

۱۷۶۰ کے بعد کے زمانہ میں اس کی تحریریں لوگوں کی توجہ کا مرکز بنیں۔ اس وقت جرمن یونیورسٹیوں میں لیبنز (G.W. Leibniz) کے افکار چھائے ہوتے تھے۔ کانٹ نے لیبنز پر سخت تنقیدیں کیں۔ یہ تنقیدیں چونکہ دلائل کے اعتبار سے بہت طاقت ور تھیں، کانٹ بہت جلد لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اور پھر اس کے لئے اعلیٰ ترقیات کے دروازے کھل گئے۔

۵ اکتوبر ۱۹۸۳

چین کے ایک ارب باشندے چینی زبان بولتے ہیں۔ جب کہ انگریزی زبان بولنے والوں کی تعداد ساری دنیا میں ۷ کروڑ ہے۔ اس لحاظ سے بظاہر چینی زبان بولنے والے زیادہ ہیں اور انگریزی بولنے کم۔ مگر دو زبانوں کی اہمیت سمجھنے کے لئے یہ تقابل صحیح نہیں۔ کیوں کہ چینی زبان صرف چین میں بولی جاتی ہے۔ جب کہ انگریزی زبان کے بولنے اور جاننے والے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ انگریزی زبان حقیقی معنوں میں ایک بین اقوامی زبان ہے اور چینی صرف ایک ملکی زبان۔

۶ اکتوبر ۱۹۸۳

موجودہ زمانہ میں شہید کا لفظ قتیل کے معنی میں رواج پا گیا ہے۔ حالاں کہ یہ اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں۔ قرآن میں ہے کہ: اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے، وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں (الحدید ۱۹) اس آیت میں ایسے لوگوں کو "شہید" کہا گیا ہے جنھوں نے اللہ اور رسول کا مومن ہونے کا ثبوت دیا۔ یہاں لڑ کر جان دینے کا کوئی ذکر نہیں۔

مزید یہ کہ کسی قتل ہونے والے کو شہید کہنا بذات خود بھی اسلام میں منع ہے۔ متعدد حدیثوں میں اس کی صراحت آئی ہے۔ امام بخاری نے اپنی کتاب جامع صحیح میں ایک باب قائم کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: لا یقول فلان شہید (یہ نہ کہے کہ فلاں شہید ہے) اس ترجمہ باب کی تشریح حافظ ابن حجر نے اس طرح کی ہے: (لا یقول فلان شہید) ای علیٰ سبیل القطع الا ان کان بالوحی۔ یعنی قطعیت کے ساتھ کسی کو نہ کہے کہ وہ شہید ہے، الّا یہ کہ وہ وحی کی بنیاد پر ہو۔

امام بخاری نے اس باب کے تحت کئی روایتیں پیش کی ہیں۔ حافظ ابن حجر نے اس میں مزید اضافہ کیا ہے۔ ان احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ شہید کا لفظ آدمی کے اخروی انجام کو بتاتا ہے جس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، پھر کسی انسان کے لئے کیسے درست ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کو یہ کہنا شروع کر دے کہ فلاں آدمی شہید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی میں کسی کے نام کے ساتھ لفظ شہید نہیں لگایا گیا۔ یہ صرف موجودہ زمانہ کی بدعت ہے کہ لوگ حسن البنا شہید اور سید قطب جیسے الفاظ بولتے ہیں۔

۷ اکتوبر ۱۹۸۳

والٹیر (Voltaire) کا قول ہے کہ آدمی کو اس کے سوالات سے سمجھو نہ کہ اس کے جوابات سے:

Judge a man by his questions rather than his answers.

یہ بہت بامعنی قول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جواب دینے کے مقابلہ میں سوال کرنا زیادہ مشکل کام ہے۔ آدمی کا سوال اس کی پوری شخصیت کو بتا دیتا ہے۔ کم از کم میرا تجربہ یہی ہے کہ بہت کم لوگ ہیں جو واقعی کوئی گہرا سوال کریں۔ بیشتر لوگ محض سطحی قسم کے سوال کرنا جانتے ہیں۔

۸ اکتوبر ۱۹۸۳

ایک شخص نے کامیابی کا راز سادہ طور پر ان چند لفظوں میں بیان کیا اگر تم کامیاب ہونا چاہتے ہو تو تم زیادہ کام کرو:

If you want to succeed, work harder.

میرا خیال ہے کہ کامیابی کا اس سے مختصر نسخہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ موجودہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں ہر کامیابی دوسروں کے مقابلہ میں کامیابی کا نام ہے۔ اس لئے ایک شخص اسی وقت کوئی قابل ذکر

کامیابی حاصل کرسکتا ہے جب کہ وہ زیادہ محنت کرکے مقابلۃً اس کا استحقاق پیدا کرے۔

۹ اکتوبر ۱۹۸۳

مکھن گویا چھاچ اور گھی کا مجموعہ ہے۔ لیکن مکھن سے براہ راست گھی نکالنا چاہیں تو وہ چھاچ سے الگ ہو کر آپ کو نہیں مل سکتا۔ البتہ جب مکھن کو آگ پر پکائیں تو پکتے پکتے ایک وقت آتا ہے جب کہ چھاچ الگ ہو جاتا ہے اور مکھن الگ۔

یہ ایک قدرتی تمثیل ہے جو انسان کے معاملہ کو بتا رہی ہے۔ انسان کی شخصیت میں دو چیزیں ملی جلی ہیں —— روح اور مادہ۔ عام حالت میں وہ مکھن کی طرح ایک دوسرے میں شامل رہتی ہیں۔ خدا کی طرف سے انسان پر مصیبتیں اور آزمائشیں اسی لئے ڈالی جاتی ہیں کہ اس کی شخصیت کا روحانی عنصر جو بمنزلہ گھی کے ہے، اس کی شخصیت کے مادی عنصر سے الگ ہو جائے جو بمنزلہ چھاچ کے ہے۔ اسی کا نام قرآن کی زبان میں تزکیہ ہے۔

انسان کا موجودہ مادی وجود جنت میں بسائے جانے کے قابل نہیں۔ جو شخص اپنے مادی وجود کو لے کر آخرت میں پہنچے وہ خدا کی جنت میں داخلہ کے لئے نااہل ٹھہرے گا۔ البتہ جو شخص اپنے موجودہ مادی وجود سے اسی دنیا میں اپنے آپ کو الگ کرلے اور اپنے روحانی وجود کے ساتھ آخرت میں پہنچے، اس کو نیا زیادہ بہتر جسم دے کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۸۳

ایک مقولہ ہے کہ مایوس آدمی کو ہر موقع کے اندر مشکل نظر آتی ہے، اور پر امید آدمی کو ہر مشکل کے اندر موقع دکھائی دیتا ہے:

The pessimist sees the difficulty in every opportunity,
and the optimist sees the opportunity in every difficulty.

ہر صورت حال میں کچھ روشن پہلو ہوتے ہیں اور کچھ تاریک پہلو۔ کوئی بھی صورت حال اس سے خالی نہیں۔ کامیابی صرف اس انسان کے لئے مقدر ہے جو تاریک پہلو کو نظر انداز کر دے، اور روشن پہلو کی طرف اپنا قدم بڑھا دے۔

اس دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کا دوسرا کوئی طریقہ نہیں۔

۱۱ اکتوبر ۱۹۸۳

عوام میں ایک حدیث مشہور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے بیت اللہ کا حج کیا اور اس نے (مدینہ آکر) میری زیارت نہیں کی تو اس نے میرے اوپر زیادتی کی (من حج البیت ولم یزرنی فقد جفانی)

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث گھڑی ہوئی ہے۔ حافظ ذہبی، امام صنعانی، زرکشی اور ابن الجوزی وغیرہ نے اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے۔ اس حدیث کی سند میں ایک راوی محمد بن محمد ہیں جو اپنے دادا النعمان بن شبل الباہلی سے روایت کرتے ہیں۔ ابن حبان نے ان کی بابت لکھا ہے کہ یأتی بالطامات۔ یعنی وہ حیرت انگیز اور سنسنی خیز باتیں بیان کرتے ہیں۔

قدیم زمانہ میں حدیثیں وضع کرنے کا ایک محرک یہ بھی رہا ہے کہ عوام ہمیشہ عجیب و غریب قسم کی مبالغہ آمیز باتوں کو بہت دھیان سے سنتے ہیں اور بہت جلد ایسے لوگوں کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں اس قسم کے لوگ سنسنی خیز حدیثیں گھڑ کر سنایا کرتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں بھی اس قسم کے لوگ موجود ہیں۔ اور یہ وہی ہیں جن کو زرد صحافی (Yellow journalists) کہا جاتا ہے۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۸۳

تنقید کرنا غلط نہیں، تنقید کو برا ماننا غلط ہے۔ واحد پابندی جو تنقید کے اوپر لگائی جا سکتی ہے وہ یہ کہ تنقید کو تنقید ہونا چاہئے نہ کہ تعییب۔ یعنی عیب جوئی اور الزام تراشی کرنے کے بجائے واضح دلائل کی بنیاد پر اظہار خیال کیا جائے جس کو موجودہ زمانہ میں تجزیہ کہا جاتا ہے۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۸۳

پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ مجھے اس دنیا سے دلچسپی ہے، اس زندگی سے، نہ کہ کسی اور دنیا یا مستقبل کی زندگی سے:

I am interested in this world, in this life,
not some other world or future life.

جواہر لال نہرو اور ان کے جیسے دوسرے لوگوں کو یہ کہنے کی تو آزادی ہے کہ انھیں صرف حال کی زندگی سے دل چسپی ہے۔ مگر ان کی مشکل یہ ہے کہ انھیں یہ آزادی نہیں کہ وہ اپنی مستقبل کی زندگی کا خاتمہ

کر سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں اس وقت تک کسی عقلمند آدمی کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ موت سے پہلے والی زندگی سے تو دلچسپی رکھے اور موت کے بعد والی زندگی کو بھلا دے۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۸۳

ایک ہندو نوجوان سے ملاقات ہوئی جو آر ایس ایس سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آر ایس ایس کے لوگ مسلمانوں سے کیا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا احساس یہ ہے کہ مسلمان دیش کے وفادار نہیں۔ ان کی وفاداریاں دیش کے باہر ہیں۔ اگر وہ ہماری طرح دیش کے وفادار بن جائیں تو پھر ہمیں ان سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔

میں نے کہا کہ ہندستان میں آزادی کے بعد سے کئی بار ایسی سازشیں پکڑی گئی ہیں جن میں لوگ ہندستان کا فوجی راز پاکستان کے ہاتھ بیچنے میں ملوث تھے۔ مگر یہ سب کے سب ہندو یا سکھ تھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی مسلمان نہ تھا۔ کیا اس سے مسلمانوں کے بارہ میں آپ کا الزام غلط ثابت نہیں ہوتا۔

میں نے کہا کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ ہم بھارت کو ایک ایسا ملک بنانا چاہتے ہیں جو ساری دنیا کو رہنمائی دے سکے۔ پھر کیا آپ یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ساری دنیا وطن کے خانوں میں بٹ جائے۔ آج کی دنیا بین اقوامیت کو پسند کرتی ہے۔ ایسی حالت میں آپ کی محدود وطنیت میں اس کے لئے کیا کشش ہو سکتی ہے۔ پھر میں نے ان کو فرانسس فینلون (Francis Fenelon) کا قول سنایا کہ میں اپنے ملک کو اپنے خاندان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ مگر انسانیت مجھے اپنے ملک سے بھی زیادہ عزیز ہے:

I love my country better than my family;
but I love humanity better than my country.

میں نے کہا کہ ایک ایسی دنیا جہاں لوگ عالمی سفر کے لئے انٹرنیشنل سواری کے طالب ہوں، وہاں آپ لوگوں کو ایک ایسی سواری پر بیٹھنے کے لئے راضی نہیں کر سکتے جو صرف مقامی سفروں کے لئے کار آمد ہو۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۸۳

مسائل ہر ملک میں ہیں اور ہندستان میں بھی ہیں۔ ہمیں حق ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ مگر مسائل کو حل کرنے کے لئے ہمیں لازمی طور پر خاموش اور پر امن انداز اختیار کرنا چاہئے نہ کہ احتجاجی انداز

(agitational approach) ۔ احتجاجی انداز مسلمانوں کی داعیانہ حیثیت کے مطابق نہیں۔ نیز یہ کہ موجودہ حالت میں احتجاجی انداز مسئلہ کی شدت کو مزید بڑھاتا ہے وہ کسی درجہ میں بھی اس کو کم نہیں کرتا۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۸۳

تبلیغی جماعت کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ کام کرنے کے دو انداز ہیں۔ ایک خارجی انداز (outward approach) اور دوسرا داخلی انداز (inward approach) اس وقت مسلمانوں میں بے شمار تحریکیں چل رہی ہیں، مگر سب، کم یا زیادہ، خارجی اندازِ کار پر چل رہی ہیں۔ میرے نزدیک صرف دو قابل ذکر تحریکیں ہیں جو داخلی اندازِ کار پر چل رہی ہیں، ایک تبلیغی جماعت اور دوسرے الرسالہ کا مشن۔

میں نے کہا کہ مجھے تبلیغی جماعت سے کئی معاملوں میں اختلاف ہے۔ مثلاً وہ لوگ پوری تحریک "فضائل" کی بنیاد پر چلا رہے ہیں جو میرے نزدیک صحیح نہیں۔ تاہم میں تبلیغی جماعت کی اس لئے قدر کرتا ہوں کہ وہ امت میں داخلی طرزِ فکر پیدا کر رہے ہیں جو صحیح طرزِ فکر ہے۔ دوسرے لوگ پوری ملت کو خارجی طرزِ فکر پر ڈال رہے ہیں جو ان کو کہیں پہنچانے والا نہیں۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۸۳

۱۹۷۱ میں ہندستانی فوجوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ اور مکتی باہنی کے ساتھ مل کر مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش میں تبدیل کیا۔ اس آپریشن کے وقت ہندستانی فوجوں کے جنرل فیلڈ مارشل مانکشا تھے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد مانکشا کو ہندستان میں زبردست استقبال ملا۔ جگہ جگہ ان کے اعزاز میں جلسے کئے گئے۔ دہلی کے ایک اسکول میں اسی قسم کے ایک جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے مانکشا نے کہا:

Had I been on the other side, history would have been different today.

اگر میں دوسری طرف ہوتا تو آج تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔ یعنی مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے کے بجائے انڈیا پاکستان بن جاتا۔ اسی کو "برخود غلط" کہتے ہیں، اور برخود غلط ہونا بلاشبہ سب سے بڑا

ذہنی مرض ہے۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۸۳

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الا أخبرکم بالمؤمن. من أمنه الناس علی اموالهم و انفسهم، و المسلم من سلم الناس من لسانه ویدہ. و المجاهد من جاهد نفسه فی طاعة اللہ عزوجل، و المهاجر من هجر الخطایا والذنوب (رواہ احمد فی مسندہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا میں تم کو مومن کے بارہ میں نہ بتاؤں۔ مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنے مال اور اپنی جان کے بارہ میں امن میں رہیں۔ مسلم وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے لوگ محفوظ رہیں۔ مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے آپ سے جہاد کرے۔ مہاجر وہ ہے جو خطاؤں اور گناہوں کو چھوڑ دے۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۸۳

عربی زبان الہامی کلام کے لئے موزوں ترین زبان ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر ایجاز کی حیرت انگیز صلاحیت ہے۔ زیادہ معانی کو کم لفظوں میں سمیٹنا اس کی بہت خاص صفت ہے۔ مثلاً ایک مقولہ اردو زبان میں اس طرح ہے: جیسا بونا ویسا کاٹنا۔ یہی مقولہ انگریزی زبان میں اس طرح ہے:

As you sow, you will reap

اسی کو عربی زبان میں اس طرح کہا جائے گا: کما تزرع تحصد۔ اردو مقولہ چار لفظوں میں ہے۔ انگریزی مقولہ چھ لفظوں میں۔ اس کے مقابلہ میں عربی زبان میں یہ مفہوم صرف تین لفظ میں پوری طرح ادا ہو جاتا ہے۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۸۳

قال علی بن ابی طالب ینصح ابنه الحسن رضی اللہ عنهما: یا بنی اجعل نفسك میزاناً فی ما بینك وبین غیرك. فاحبب لغیرك ما تحب لنفسك واکرہ له ما تکرہ لها

حضرت علی ابن ابی طالب نے اپنے صاحبزادہ حضرت حسن سے کہا کہ اے میرے بیٹے، اپنے اور دوسروں سے تعلق کے معاملہ میں خود اپنے آپ کو میزان بنالو۔ پس دوسروں کے لئے وہی چیز پسند

کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو اور دوسرے کے لئے وہی چیز ناپسند کرو جو تم اپنے لئے ناپسند کرتے ہو، معاشرتی اخلاقیات کے لئے اس سے زیادہ سادہ اور اس سے زیادہ صحیح اصول کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۸۳

میں کبھی سوچتا ہوں کہ انسان کس قدر سرکش مخلوق ہے۔ اور شاید اس کی سب سے بڑی سرکشی یہ ہے کہ وہ خدا کے کلام میں اپنا کلام ملاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ پچھلی امتوں نے اسی سرکشی کی بنا پر اپنی آسمانی کتابوں کو محرف اور غیر معتبر بنا دیا۔

مسلمان اس معاملہ میں کم مجرم نہیں ہیں۔ قرآن کی حفاظت کے لئے خدا کے فرشتے مقرر تھے، اس لئے وہ قرآن میں اپنا کلام نہ ملا سکے۔ مگر حدیث میں انھوں نے انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ اپنا کلام ملایا۔ حتی کہ موضوع حدیثوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔

مثال کے طور پر شیعہ حضرات نے حضرت علی کی مطلق فضیلت ثابت کرنے کے لئے بے شمار عجیب وغریب قسم کی حدیثیں گھڑیں۔ اس کے جواب میں سنی حضرات نے ابوبکرؓ وعمرؓ کی فضیلت میں حدیثیں گھڑنا شروع کر دیا۔ مثلاً رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ جب ابوبکر صدیق کا جنازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس لایا گیا تو آواز دینے والے نے آواز دی کہ اے رسول اللہ آپ پر سلام ہو، یہ ابوبکر دروازہ پر حاضر ہیں (السلام علیکم یا رسول اللہ، هذا ابوبکر بالباب) اسی وقت دروازہ کھل گیا اور قبر کے اندر سے یہ آواز آئی:

ادخلوا الحبیب الی الحبیب دوست کو دوست کے پاس لے آؤ

اس قسم کی روایتیں گھڑنا بلاشبہ سطحیت بھی ہے اور سرکشی بھی۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۸۳

مرزا غلام احمد قادیانی کے ایک شعر کا ایک مصرعہ یہ ہے:

دیں کے لئے حرام ہے اے دوستو قتال

غلام احمد قادیانی کے اس شعر پر مسلمانوں نے بہت شور وغل کیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس شعر میں ایک صحیح بات کو غلط لفظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس شعر میں "دین" کے لفظ کو اگر "دعوت دین" کے معاملہ میں لیا جائے تو بات بالکل بدل جائے گی۔ یعنی لفظ بدل کر اس کو یوں کہا جائے کہ ...... دعوت کا کام مدعو

کے ساتھ جنگ چھیڑ کر نہیں کیا جا سکتا۔

قتال دفاع کے مقصد کے لئے دین میں عین جائز بلکہ ضروری ہے۔ اس کے حرام ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ مگر دعوت کا عمل ایک نصیحت کا عمل ہے۔ اور نصیحت کے لئے ضروری ہے کہ سننے والے اور سنانے والے کے درمیان خوش گوار فضا ہو۔ اس فضا کو باقی رکھنے کے لئے داعی کو یکطرفہ طور پر ٹکراؤ سے احتراز کرنا پڑتا ہے۔

۲۳ اکتوبر ۱۹۸۳

ایک مقولہ ہے کہ "کمال کا خاصہ ظہور ہوتا ہے"۔ پھول جب تکمیل کے مرحلہ کو پہنچتا ہے تو خوشبو دینے لگتا ہے۔ بخارات اٹھنے کا عمل تکمیل کو پہنچتا ہے تو بارش ہونے لگتی ہے۔ چاند جب مکمل ہوجاتا ہے تو پوری طرح روشنی دینے لگتا ہے۔ وغیرہ

یہی معاملہ دین کا ہے۔ قرآن میں اعلان کیا گیا ہے کہ خدا کا دین اب کامل ہو چکا ہے۔ یعنی وہ آخری حد تک مسلّم اور مستحکم ہو چکا ہے۔ جب دین اس طرح مکمل ہو جائے تو اس کے اندر وہ طاقت آجاتی ہے کہ اپنے آپ پھیلنے لگے۔ چنانچہ اسلام اب یہ طاقت رکھتا ہے کہ اپنے آپ پھیلے۔ آج اسلام جو اپنے آپ نہیں پھیل رہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی قومی سیاست سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت اور کشیدگی کی فضا پیدا کر رکھی ہے۔ مسلمان اگر اس قسم کی سیاست ترک کر دیں اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نارمل فضا پیدا ہو جائے تو اس کے بعد خدا کا دین اپنے آپ پھیلنا شروع ہو جائے گا۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۸۳

فرانسس بیکن (Francis Bacon) کا قول ہے کہ جب تم اقدام کرو تو اس سے پہلے یہ سوچ لو کہ تم کیا کچھ کر سکتے ہو:

Before you attempt consider what you can perform.

اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو قابل عمل دائرہ میں اقدام کرنا چاہئے۔ ناقابل عمل دائرہ میں اقدام کرنا ناکامی کے خندق میں چھلانگ لگانا ہے۔ جو لوگ ناقابل عمل دائرہ میں اقدام کریں، اور پھر جب ناکام ہوں

تو حالات کی شکایت لے کر بیٹھ جائیں، وہ درحقیقت دوسروں کی شکایت نہیں کرتے، بلکہ خود اپنی نادانی کا اعلان کر رہے ہیں۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۸۳

قرآن خدا کا کلام ہے۔ مگر قرآن براہ راست ہم کو خدا سے نہیں ملا ہے بلکہ پیغمبر کے واسطہ سے ملا ہے۔ اسی طرح بہت سی حدیثیں ہیں جن کو حدیث قدسی کہا جاتا ہے۔ ان حدیثوں میں بھی متکلم خدا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف اس کے راوی ہیں۔ مگر یہ احادیث قدسی کبھی مصحف (قرآن) میں داخل نہیں کی گئیں۔ قرآن کی تلاوت کرنا عبادت ہے۔ قرآن کو نماز میں پڑھا جاتا ہے۔ مگر حدیث قدسی کی نہ اس طرح تلاوت کی جاتی اور نہ اس کو نماز میں پڑھنا جائز ہے (ان القرآن متعبد بتلاوته فهو الذی تتعین القراءة به فی الصلاة وقراءته عبادة یثاب علیها۔ والحدیث القدسی لیس متعبداً بتلاوته ولا تجزی القراءة به فی الصلاة)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں قرآن کی حفاظت کا کتنا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۸۳

خلیفہ ہارون رشید ایک روز باہر نکلے۔ انھوں نے سعید بن سلم کو دیکھا۔ خلیفہ نے پوچھا کہ کون۔ انھوں نے کہا سعید، اللہ آپ کو سعادت بخشے۔ خلیفہ نے دوبارہ پوچھا کہ کس کا لڑکا۔ انھوں نے کہا کہ سلم کا لڑکا، اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ خلیفہ نے پھر پوچھا کہ کس کا باپ۔ انھوں نے کہا عمرو کا باپ، اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ خلیفہ ہارون رشید نے کہا، اللہ تمہیں برکت دے۔ اور پھر اس نے ان کا اکرام کیا (خرج هارون الرشید یوماً فرأی سعید بن سلم فقال مَن۔ قال سعید، اسعدك الله۔ قال ابن مَن۔ قال ابن سلم، سلمك الله۔ قال ابو مَن۔ قال ابو عمرو، عمرك الله۔ فقال الرشید بارك الله علیك واکرمه)

بڑوں سے بات کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ مجھے اس قسم کی بات کرنا بالکل نہیں آتا۔ حتیٰ کہ بناوٹی طور پر بھی نہیں۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۸۳

دکتور مصطفیٰ السباعی کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے: عظماؤنا فی التاریخ

(تاریخ میں ہمارے بڑے لوگ)، اسی طرح اردو میں ایک کتاب چھپی تھی جس کا نام تھا: ناموران اسلام۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی کتابیں موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے لکھی ہیں۔ مثلاً العبقریات الاسلامیۃ۔ وغیرہ۔

مگر مجھے اس قسم کے نام اور اس طرح کے ذہن کے تحت کتاب لکھنا بالکل پسند نہیں۔ "بڑوں" سے مراد اگر صحابہ کرام اور صلحاء امت ہیں تو وہ ہمارے لئے نمونہ ہیں۔ اگر انھیں "عظماء" کہا جائے تو اس سے ہیرو پرستی کا ذہن پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر انھیں "قدوۃ" کہا جائے تو اس سے اتباع کا ذہن پیدا ہوگا۔ اول الذکر سے فخر کی نفسیات پیدا ہوتی ہے اور ثانی الذکر سے تواضع کی نفسیات۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۸۳

قدیم طرز کی توپ کو چلانے کا کام جو شخص کرتا تھا، اس کو "میر آتش" کہا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں یہ کام زیادہ تر مسلمان کرتے تھے۔ مثلاً چھترپتی شیواجی کے توپ خانہ کا میر آتش ابراہیم گردی تھا۔ رانی جھانسی لکشمی بائی کے میر آتش کا نام محمد غوث تھا، وغیرہ۔

روایتی دور میں مسلمان ہر میدان میں آگے تھے، سائنسی دور میں وہ ہر میدان میں پیچھے ہوگئے۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۸۳

چارلس ڈکنس (Charles Dickens) کا قول ہے کہ ــــــ خاموشی ایک ناقابل برداشت قسم کا پرزور جواب ہے:

Silence is the unbreakable repartee.

اگر کوئی آدمی آپ کے خلاف لغو باتیں کرے اور آپ جواب دینے کے بجائے خاموش ہوجائیں تو آپ خود اس آدمی کے ضمیر کو اس کا جواب دینے والا بنا دیتے ہیں۔ اس کا ضمیر جاگ کر اس کو بتاتا ہے کہ تم ایک کمینہ صفت انسان ہو۔ یہ اندرونی جواب بلاشبہ تمام جوابوں سے زیادہ طاقت ور ہے۔ انسان ہر دوسرے حملہ کے مقابلہ میں ٹھہر سکتا ہے، مگر اپنے ضمیر کے حملہ کے مقابلہ میں ٹھہرنے کی طاقت کسی کے اندر نہیں۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۸۳

سورہ ہود میں حضرت شعیب علیہ السلام کا تذکرہ ہے۔ بتایا گیا ہے کہ انھوں نے جب اپنی

قوم کو توحید کی دعوت دی تو لوگ آپ کے سخت مخالف ہو گئے۔ اس سلسلہ میں ان کا ایک قول ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: وانا لنراك فينا ضعيفا (هود ۹۱) یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ تم ہمارے درمیان صرف ایک کمزور شخص ہو۔

اس سلسلہ میں تفسیروں میں بعض سلف کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ حضرت شعیب نابینا تھے (کان شعیب ضریر البصر، تفسیر ابن کثیر) یہ تفسیر صحیح نہیں۔ اصل یہ ہے کہ پیغمبروں کی دعوت قوم کے مزاج کے خلاف ہوتی تھی۔ اس لئے پیغمبر اپنی قوم سے کٹ جاتا تھا۔ وہ قوم کے درمیان اجنبی بن جاتا تھا۔ قوم کے درمیان ان کی کمزوری کا اصل سبب یہی تھا۔ یہ صورت حال ہر پیغمبر کے ساتھ پیش آئی۔ حتی کہ خود پیغمبر اسلام کے ساتھ بھی مکہ میں ایسا ہی ہوا۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۸۳

قدیم یونان کا ایک مشہور فلسفی ہے جس کا دیو جانس (Diogenes) ہے۔ اس کا زمانہ ۴۱۲ - ۳۲۳ ق م ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سردی کے موسم میں وہ دھوپ میں زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ شاہ الیگزینڈر خود اس کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ آپ کو جو کچھ مانگنا ہے مانگیں، اس کو پورا کیا جائے گا۔ دیو جانس نے شاہ کی طرف رحم بھری ہوئی نظروں سے دیکھا اور کہا: میں تم سے کیا مانگوں، تمہارے پاس مجھے دینے کے لائق کوئی بھی چیز نہیں۔ جو کچھ تم دے سکتے ہو وہ مجھے چاہئے نہیں۔ بس تم میرے اتنی مہربانی کرو کہ سامنے سے ہٹ جاؤ، میری دھوپ نہ روکو۔

یافت آدمی کو بلند کرتی ہے۔ دیو جانس کا احساس تھا کہ اس کی فکری یافت بادشاہ کے خزانوں سے زیادہ بڑی ہے۔ اسی احساس نے اس کے اندر وہ استغنا پیدا کیا جس کا ایک نمونہ اوپر کے واقعہ میں نظر آتا ہے۔

یکم نومبر ۱۹۸۳

صحیح بخاری میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من احسن فی الاسلام لم یؤاخذ بما عمل فی الجاهلية۔ ومن اساء فی الاسلام اخذ بالاول والآخر (جس نے اسلام میں داخل ہونے کے بعد اچھا عمل کیا تو اس سے زمانۂ جاہلیت کے عمل کی پکڑ نہ ہو گی۔ اور جو شخص اسلام میں آنے کے بعد برا فعل کرے

تو وہ اول و آخر سب کے لئے پکڑا جائے گا۔

۲ نومبر ۱۹۸۳

ایک شاعر نے ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں کہا ہے :

شبنم ناتواں سہی لیکن　　　اس گلستاں میں ہے نمو مجھ سے

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمان اگرچہ قلیل اور کمزور ہیں، مگر وہ ملک کا ایک مفید عنصر ہیں۔ وہ ملک کی "نمو" کا باعث ہیں۔ شاعرانہ کلام میں صرف ایک تشبیہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہو گئی۔ لیکن اگر اسی بات کو علمی طور پر ثابت کرنا ہو تو تشبیہی استدلال بالکل بے معنی ہوگا۔ اب اس بات کو علمی طور پر ثابت کرنے کے لئے حقیقی حوالے اور واقعی معلومات درکار ہوں گی۔ یعنی وہ چیز جس کو ڈاٹا (data) کہا جاتا ہے۔

۳ نومبر ۱۹۸۳

ایک مولوی صاحب نے کہا کہ الرسالہ میں اکابر پر تنقید ہوتی ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ آپ کو اکابر پر تنقید کئے بغیر اپنا نقطۂ نظر پیش کرنا چاہئے۔

میں نے کہا کہ میں کوئی نیا کام نہیں کر رہا ہوں۔ میں وہی کر رہا ہوں جس پر تمام علماء کا آج بھی عمل ہے —— بریلوی فرقہ مولانا اشرف علی تھانوی پر تنقید کرتا ہے۔ دیوبندی لوگ امام ابن تیمیہ پر تنقید کرتے ہیں۔ اہل حدیث حضرات امام ابو حنیفہ پر تنقید کرتے ہیں۔ غرض ہر ایک دوسروں پر تنقید کرکے اپنے نقطہ نظر کو صحیح ثابت کر رہا ہے۔ پھر اگر اس عمومی مسلک پر میں بھی عمل کرتا ہوں تو اس میں آپ حضرات کو کیوں اعتراض ہے۔

۴ نومبر ۱۹۸۳

اصحاب رسول نے جن ملکوں کو فتح کیا، کسی بھی ملک میں انھوں نے ایسا نہیں کیا کہ وہاں انھوں نے مکمل ایمان اور مکمل شریعت کو اختیار کرنے کا مطالبہ کیا ہو۔ اور وہ اس وقت تک جنگ جاری رکھیں جب تک لوگ مکمل ایمان اور مکمل شریعت پر قائم نہ ہو جائیں۔ انھوں نے شرک کا سیاسی زور توڑنے کے بعد فوراً ہتھیار رکھ دئے۔ ان کا مقصد "حرب" کو ختم کرنا تھا نہ کہ نفس عقیدہ کو ختم کرنا (حتی تضع الحرب اوزارھا)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی جنگ ختم فتنہ کے لئے تھی نہ کہ ختم عقیدہ کے لئے۔ عقیدہ کا اختلاف تو دنیا کے دار الامتحان ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔ پھر اس کو وہ کیسے ختم کر سکتے تھے۔ "ویکون الدین کلہ للہ" کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ حالت فطری قائم ہو جائے۔ اور لوگوں کو انتخاب (choice) کی وہ آزادی مل جائے۔ جو خدا نے اپنے تخلیقی منصوبہ کے تحت انھیں دی ہے۔

جس طرح سورج کا معاملہ خدا کا معاملہ ہے۔ اسی طرح دین بھی خدا کا معاملہ ہے۔ انسان اپنی مداخلت سے خدا کے تخلیقی نقشہ کو بگاڑتا ہے۔ چنانچہ صحابہ کو حکم دیا گیا کہ اس معاملہ میں انسان کی مداخلت کو ختم کر کے اس حالتِ فطری کو قائم کر دیں جس پر خدا نے اپنی دنیا کو پیدا کیا ہے۔ یعنی آزادیٔ انتخاب کی حالت۔ صحابۂ کرام کی جنگ بحالی آزادی کے لئے تھی نہ کہ ختم آزادی کے لئے۔

۵ نومبر ۱۹۸۳

کہا جاتا ہے کہ مغل حکمراں شاہ جہاں کی زبان پر ایک بار ایک مصرعہ آگیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تعجب کی انگلی منھ میں ہے، آدھی اندر آدھی باہر:

انگشت حیرت در دہاں نیمے دروں نیمے بروں

اب دربار کے شاعر کو حکم ہوا کہ وہ اس کا دوسرا مصرعہ مکمل کرے۔ شاعر نے ایک مصرعہ وضع کر کے اس میں شامل کیا۔ اب پورا شعر بن گیا:

از ہیبت شاہجہاں لرزد زمین و آسمان انگشت حیرت در دہاں نیمے دروں نیمے بروں

ایک بادشاہ سے زمین و آسمان کو لرزانے کی خاطر شاعر کے لئے صرف اتنی بات درکار ہے کہ وہ اپنے موافق ردیف و قافیہ پالے لیکن اگر حقیقی طور پر ایک ایسا انسان درکار ہو جس سے زمین و آسمان کانپیں تو اس کے لئے ضرورت ہوگی کہ خدائی طاقتوں والا ایک ایسا انسان پیدا کیا جائے ——— کتنا فرق ہے حقیقت میں اور شاعری میں۔

۶ نومبر ۱۹۸۳

"مضمون نگاری" پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر اس سلسلہ میں مجھے ایک چھوٹا سا فقرہ بہت پسند آیا۔ ڈانے ڈاوث فائر (Creative Writing) I کی ایک کتاب ہے جو ۱۹۸۳ میں چھپی ہے۔ اس کا نام ہے: تخلیقی تحریر (Creat اس کتاب میں اس نے لکھا ہے کہ:

The best way to learn how to write is to write.

یعنی لکھنا سیکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ لکھا جائے۔ تاہم صرف لکھنا یا لکھنے کی مشق کرنا ہی لکھنے والا بننے کے لئے کافی نہیں۔ اس کے لئے فطری صلاحیت ہونا لازمی طور پر ضروری ہے۔ مصنف نے اس معاملہ میں فطری صلاحیت کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور ایولن واف (Evelyn Waugh) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ کامیابی کا انحصار فطری استعداد پر منحصر ہے جس کو سخت محنت کے ذریعہ ترقی دی گئی ہو:

Success depends on natural talent developed by hard work.

۷ نومبر ۱۹۸۳

مہاتما گاندھی نے ہندستان کی آزادی (۱۹۴۷) سے پہلے کہا تھا کہ ــــــ میرا مشن ہر آنکھ سے آنسو پونچھنا ہے:

Wiping off tears from every eye.

مگر جب گاندھی جی کی محبوب آزادی آئی تو اس نے صرف آنکھوں کے آنسوؤں میں اضافہ کیا۔ اجتماعی انقلاب کبھی لیڈر کی خواہش کے تحت نہیں آتا، وہ ہمیشہ تاریخی حالات کے تحت آتا ہے۔ حقیقی لیڈر وہ ہے جو اپنی خواہش کو جاننے کے ساتھ مستقبل کے ان تاریخی عوامل کو بھی جان سکے جو بالآخر اس کے انقلاب کی صورت گری کریں گے۔

۸ نومبر ۱۹۸۳

ہنری ڈیوڈ تھورو (Henry David Thoreau) کا قول ہے کہ اگر الفاظ اس لئے ایجاد کئے گئے تھے کہ خیالات کو چھپایا جائے تو اخبارات اس بری ایجاد پر بہت بڑا اضافہ ہیں:

If words were invented to conceal thought,
newspapers are a great improvement on a bad invention.

اخبار یا نیوز پیپر بظاہر خبرنامہ ہے۔ مگر موجودہ اخبارات خبرنامہ سے زیادہ مفادنامہ ہوتے ہیں۔ ہر اخبار اپنے مفاد کے مطابق کسی چیز کو چھاپتا ہے اور کسی چیز کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس بنا پر تمام اخبارات واقعی صورت حال پر پردہ ڈالنے کا آلہ بن گئے ہیں۔

۹ نومبر ۱۹۸۳

موجودہ زمانہ میں غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت پہنچانے کے لئے عام طور پر یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ ابھی تو خود مسلمانوں کی اصلاح نہیں ہوئی۔ پھر غیر مسلموں میں اسلامی دعوت کا کام کیسے کیا جا سکتا ہے۔ یہ دلیل بالکل غلط ہے۔ اسلامی دعوت ایک ایسا فریضہ ہے جو امت سے کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا۔ امام غزالی نے لکھا ہے: الامر بالمعروف والنہی عن المنکر لا یسقط حتی عن الفاسق (احیاء علوم الدین)

ایک عرب نے قصہ بیان کیا کہ ایک انگریز نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد وہ مسلمانوں کے معاشرہ میں آیا تو مسلمانوں کی اخلاقی حالت کو دیکھ کر بے حد مایوس ہو گیا، یہاں تک کہ اس نے اسلام کو ترک کر دیا (حتی ملتھم ملاذتاً ما وترک الاسلام)

یہ دلیل صحیح نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور صحابہ کے زمانہ میں بھی بہت سے لوگ مرتد ہو گئے تو کیا اس بنا پر اسلامی دعوت کا کام ترک کر دیا گیا۔

۱۰ نومبر ۱۹۸۳

سہارن پور کے ایک تاجر نے ایک سبق آموز واقعہ بتایا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں ایک صاحب کے بینک اکاؤنٹ میں ڈیڑھ ہزار روپیہ کا سود جمع ہو گیا۔ اب وہ ہر مجلس میں کہتے پھرتے تھے کہ میرے پاس کچھ سود کی رقم ہے۔ اس کو کہاں خرچ کروں۔ خود اپنے خرچ کے لئے تو اس کو لے نہیں سکتا۔ آپ لوگ بتائیے کہ اس کو کیا کیا جائے۔ اس کے بعد ان کا کاروبار بڑھا۔ اب ان کے اکاؤنٹ میں سود کی رقم تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہو گئی۔ اب وہ اس معاملہ میں بالکل خاموش ہو گئے۔ اب وہ کسی سے اس کا ذکر بھی نہیں کرتے تھے۔

موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اعلان تقویٰ کے لئے تو بہت بے قرار رہتے ہیں، مگر عمل تقویٰ سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں۔

۱۱ نومبر ۱۹۸۳

۱۹۸۱ میں آرچ بشپ آف کنٹربری (لندن) کے دفتر بی بی سی لندن کے نام اپنے مراسلہ میں اس بات پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تھا کہ وہ پاکستان میں تیار ہونے والے بم کو "اسلامی بم"

کا نام دیتا ہے۔ مراسلہ میں کہا گیا تھا کہ یہ مذہبی احساس کے لئے توہین کی بات ہے کہ ایک عمومی بربادی والے ہتھیار کو اسلامی کہا جائے:

> In 1981, the office of the Archbishop of Canterbury conveyed its displeasure to the BBC over the nomenclature, the Islamic Bomb, pointing out that it was insulting to religious sensitivity to call a weapon of mass human destruction Islamic.

یہ ایک بہت غیر معمولی واقعہ ہے۔ میرے علم کے مطابق، موجودہ زمانہ میں کسی ملک میں اس درجہ کی متوازی مثال موجود نہیں۔

۱۲ نومبر ۱۹۸۳

اخرج ابن ابی شیبة من حدیث ابن عمر مرفوعاً : افضل الدعاء دعوة غائب لغائب اس حدیث کو ابن ماجہ، ترمذی، احمد بن حنبل نے بھی روایت کیا ہے۔ اس کے مطابق، سب سے افضل دعا غائب کے لئے غائب کا دعا کرنا ہے۔

ایک غائب شخص جب دوسرے غائب کے لئے دعا کرتا ہے تو اس کے پیچھے سچی انسانی خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اور سچی انسانی خیر خواہی بلاشبہ ایمان کا اعلیٰ ترین مظہر ہے۔

۱۳ نومبر ۱۹۸۳

ہربرٹ پروشنو (Herbert B. Prochnow) کا قول ہے کہ دماغ کا واحد کامیاب بدل یہ ہے کہ آدمی خاموش رہے:

> The only successful substitute for brains is silence.

یہ تقریباً وہی بات ہے جس کو شیخ سعدی نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

تا مرد سخن نگفتہ باشد   عیب و ہنرش نہفتہ باشد

۱۴ نومبر ۱۹۸۳

ایک اردو شاعر نے اپنے شاعرانہ کمال کو بتاتے ہوئے کہا کہ میں ایک بات میں نئے نئے پہلو نکال کر اس کو ایک سو انداز سے بیان کر سکتا ہوں:

اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

یہ شاعری کی نہایت صحیح تعریف ہے۔ شاعری میں اصل اہمیت "مضمون باندھنے" کی ہوتی ہے۔ شاعر کو حقیقت واقعہ سے غرض نہیں ہوتی، اس کی ساری توجہ خیال آرائی اور الفاظ بندی پر لگی ہوئی ہوتی ہے۔ سائنس کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ شاعری اگر مضمون بندی کا نام ہے تو سائنس حقیقت رسی کا۔ سائنس داں کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اصل حقیقت تک پہنچے، وہ چیزوں کو جیسا ہے ویسا ہی بیان کر سکے۔

موجودہ زمانہ کے اسلامی ادب اور اسلامی لٹریچر پر بدقسمتی سے سب سے زیادہ غلبہ شاعری کا رہا۔ حتی کہ اس دور میں مسلمانوں کے جو رہنما اٹھے، وہ بھی شعر و شاعری کے ماحول سے متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان خالص حقائق کی رعایت کرتے ہوئے اپنی ملی تعمیر کی منصوبہ بندی نہ کر سکے۔

۱۵ نومبر ۱۹۸۳

والٹر لپ من (Walter Lippmann) نے کہا ہے کہ جہاں سارے لوگ ایک ڈھنگ سے سوچتے ہوں، وہاں کوئی بھی شخص زیادہ سوچنے والا نہ ہوگا:

Where all think alike, no one thinks very much.

تمام لوگوں کا ایک انداز سے سوچنا دو میں سے کسی ایک سبب کی بنا پر ہوتا ہے۔ یا تو اس لئے کہ وہاں ہر شخص کم عقل ہو، یا اس لئے کہ سوچنے پر پابندی لگادی گئی ہو، اور دونوں ہی صورت کسی انسانی معاشرہ کے لئے تباہ کن ہے۔

۱۶ نومبر ۱۹۸۳

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ انصاف میں کشادگی ہے۔ اور جو شخص انصاف پر تنگی محسوس کرے تو بے انصافی اس کے لئے اس سے بھی زیادہ تنگ ہوگی (ان فی العدل سعة، ومن ضاق علیه العدل فالجور علیه اضیق ، العبقریات، صفحہ ۷۳)

یہ ایک بے حد حکیمانہ بات ہے۔ جب بھی کوئی نزاع کی صورت پیش آئے تو اپنے واقعی حق پر راضی

ہوجانا کامیابی کا راستہ کھولتا ہے۔ اور اگر حق سے زیادہ لینے کی کوشش کی جائے تو بالآخر محرومی کے سوا کچھ اور ہاتھ آنے والا نہیں۔ عدل کا راستہ عافیت کا راستہ ہے اور ظلم کا راستہ مصیبت کا راستہ۔ مگر عام طور پر آدمی انصاف اور عدل والے راستہ کو اختیار نہیں کرتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے بارہ میں بے لاگ رائے قائم نہیں کر پاتا۔

۱۷ نومبر ۱۹۸۳

لاروشے فوکالڈ (La Rouchefoucauld) نے کہا کہ ہم اپنی چھوٹی غلطیوں کو مان لیتے ہیں، اس لئے تاکہ یہ ظاہر کرسکیں کہ ہم نے کوئی بڑی غلطی نہیں کی ہے:

We confess little faults in order to suggest that we have no big ones.

اس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ جن باتوں کے اعتراف کے باوجود آدمی کی اصل شخصیت محفوظ رہتی ہے، ان کا وہ اعتراف کرلیتا ہے۔ اور جن باتوں کے اعتراف سے اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کی اصل شخصیت مجروح ہوجائے گی، ان کا اعتراف کرنے کے لئے وہ تیار نہیں ہوتا۔

۱۸ نومبر ۱۹۸۳

مجاہد تابعی کا قول ہے کہ جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ اللہ کی کتاب میں کلام کرے جب کہ وہ عربوں کی زبان کا علم نہ رکھتا ہو (قال مجاهد: لا يحل لاحد يؤمن بالله واليوم الآخر ان يتكلم في كتاب الله اذا لم يكن عالماً بلغات العرب)

قرآن عربی زبان میں ہے۔ اس لئے قرآن کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو عربی زبان اچھی طرح جانتا ہو۔ عربی زبان پر بخوبی قدرت نہ ہو تو آدمی قرآن کو سمجھنے میں طرح طرح کی غلطیاں کرے گا۔

۱۹ نومبر ۱۹۸۳

قال الحسن بن علی: الناس ثلاثة۔ فرجل رجل۔ ورجل نصف رجل۔ ورجل لا رجل (حضرت حسن نے کہا کہ انسان تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ انسان جو پورے معنوں میں انسان ہے۔ دوسرا وہ جو آدھا انسان ہے۔ اور تیسرا وہ انسان جو انسان نہیں۔

انسان حقیقۃً وہ ہے جس کے اندر مطلوبہ انسانی اوصاف ہوں۔ مگر دنیا میں ایسے انسان بہت کم ملتے ہیں جو پورے معنوں میں انسان ہوں۔ زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو جزئی انسان ہیں نہ کہ کلی انسان۔

۲۰ نومبر ۱۹۸۳

محمد حسنین ہیکل (سابق اڈیٹر الاہرام) نے اپنے ایک مضمون میں اس پر گفتگو کی ہے کہ پٹروڈالر کے ظہور نے عربوں کا کیا حال کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ایک عرب جو پہلے خیموں میں زندگی گزارتے تھے، ان کے پاس اچانک دولت آگئی۔ انھوں نے سوئزرلینڈ میں ایک بہت بڑا مکان خریدا جو جدید ترین سامان سے آراستہ تھا۔

انھیں دنوں محمد حسنین ہیکل کا سوئزرلینڈ جانا ہوا تو مذکورہ عرب نے اپنے نئے مکان میں ان کی دعوت کی۔ جب وہ وہاں پہنچے تو مذکورہ عرب کا عجیب حال تھا۔ وہ گھر کی ایک ایک چیز کو تعجب خیز مسرت کے ساتھ انھیں دکھا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے عرب کو یقین نہیں آرہا ہے کہ یہ گھر اور یہ سب چیزیں اسی کی ہیں۔

جی چاہتا ہے کہ آخرت میں میرا بھی یہی حال ہو۔ اللہ تعالیٰ مجھے جنت کے ایک مکان میں داخل کرے جو میرے لئے قیاس و گمان سے بالا ہو۔ میں حیرانی کے ساتھ اسے دیکھوں اور سوچوں کہ کیا یہ اسی حقیر اور کمتر انسان کے لئے ہے جو دنیا میں "وحید الدین خاں" کے نام سے زندگی گزار رہا تھا۔

۲۱ نومبر ۱۹۸۳

ولیم میک فی (William McFee) کا قول ہے کہ —— دنیا اس پرجوش شخص کے لئے ہے جو اپنے آپ کو ٹھنڈا رکھے:

The world belongs to the enthusiast who keeps cool.

ہر آدمی کے اندر آگے بڑھنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ ہر آدمی زیادہ سے زیادہ ترقی کرنا چاہتا ہے مگر موجودہ دنیا میں آدمی اکیلا نہیں ہے۔ اور نہ حالات پر اسے مکمل قابو ہے۔ اس لئے اس دنیا میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو اپنے جوش کو ہوش کے تابع رکھے۔ جو اپنے شوق کی تکمیل میں سرگرم ہونے کے ساتھ دوسروں کے شوق کی رعایت کرسکے۔

۲۲ نومبر ۱۹۸۳

ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) نے بجا طور پر کہا ہے کہ آدمی جو رائے بناتا ہے وہ بالآخر احساسات کے زیر اثر بنتی ہے نہ کہ عقل کے تحت :

Opinion is ultimately determined by the feelings, and not by intellect.

انسان کی یہی کمزوری اس کے لئے صحیح رائے تک پہنچنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہی خاص سبب ہے جس کی بنا پر اکثر اوقات لوگ انتہائی معقول بات کو بھی سمجھ نہیں پاتے، خواہ اس کو کتنے ہی طاقت ور دلائل سے کیوں نہ ثابت کر دیا گیا ہو۔

۲۳ نومبر ۱۹۸۳

روی بلال بن الحارث ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: وان الرجل لیتکلم بالکلمۃ من سخط اللہ علیہ ما کان یظن ان تبلغ ما بلغت فیکتب اللہ لہ بھا سخطہ الی یوم یلقاہ (رواہ ابن ماجہ والترمذی)

بلال بن حارث کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ آدمی اللہ کی ناراضگی کی ایک بات کہتا ہے، وہ اس کو زیادہ اہم نہیں سمجھتا۔ مگر اللہ اس پر اس کے خلاف اپنی ناراضگی اس وقت تک کے لئے لکھ دیتا ہے جب کہ وہ اس سے ملے گا۔

روایات میں آتا ہے کہ علقمہ تابعی نے کہا کہ بلال بن حارث کی حدیث نے مجھے بہت سی بات بولنے سے روک دیا (قال علقمہ: کم من حدیث منعنیہ حدیث بلال بن الحارث) یہ دور اول میں مسلمانوں کا حال تھا۔ آج کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ ان کے سامنے کتنی ہی آیتیں اور حدیثیں سنائیے۔ ان کی زبان رکنے والی نہیں۔

۲۴ نومبر ۱۹۸۳

ایک صاحب نے کہا کہ نماز میں قرآن کو عربی میں پڑھنا ضروری نہیں۔ قرآن کا ترجمہ بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ اس کا ثبوت کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سلمان فارسی رضی نے بعض قرآنی حصوں کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تھا اور ایران کے کچھ لوگ اپنی نمازوں میں اس ترجمہ کو پڑھا کرتے تھے۔

میں نے کہا کہ آپ ایک واقعہ کو غلط صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ حنفی عالم شمس الائمہ سرخسی کے بیان کے مطابق، اصل واقعہ یہ ہے کہ چند نومسلم ایرانیوں نے سلمان فارسیؓ سے کہا کہ نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے۔ مگر ابھی ہم کو سورہ فاتحہ یاد نہیں۔ آپ سورہ فاتحہ کا ترجمہ ہماری مادری زبان (فارسی) میں کرکے ہمیں دے دیں۔ سلمان فارسی نے سورہ فاتحہ کا فارسی ترجمہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی بابت پوچھا تو آپ نے ان کو منع نہ فرمایا۔ چنانچہ سلمان فارسی نے وہ ترجمہ مذکورہ نومسلم ایرانیوں کے پاس بھیج دیا۔ یہ لوگ کچھ عرصہ تک اس کو اپنی نمازوں میں پڑھتے اور اسی کے ساتھ سورہ فاتحہ عربی کو یاد کرتے رہے۔ جب عربی متن انھیں یاد ہوگیا تو انھوں نے ترجمہ کو چھوڑ کر عربی پڑھنا شروع کر دیا۔ گویا سلمان فارسی کا ترجمہ ایک وقتی ضرورت تھا نہ کہ کوئی عمومی اصول۔

سلمان فارسی نے سورہ فاتحہ کا جو فارسی ترجمہ کیا، اس کا پہلا فقرہ یہ تھا: بنام خداوند بخشایندۂ مہربان۔

۲۵ نومبر ۱۹۸۳

ترجمہ ایک بہت مشکل کام ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ مترجم کو بیک وقت دو زبانوں کی رعایت کرنی پڑتی ہے۔ ایک وہ زبان جس سے ترجمہ کیا جا رہا ہے، اور دوسری وہ زبان جس میں ترجمہ کرنا مقصود ہے۔ مثلاً انگریزی کا ایک مقولہ ہے:

Politics is the art of possible

اس جملہ کا لفظی ترجمہ اردو میں یہ ہوگا کہ سیاست ممکن کا فن ہے۔ یہ ترجمہ انگریزی کے لحاظ سے صحیح ہے۔ مگر اردو اسلوب کے اعتبار سے اس میں وہ معنوی زور پیدا نہیں ہوتا جو انگریزی فقرہ میں موجود ہے۔ اردو میں معنوی اعتبار سے زیادہ بہتر ترجمہ یہ ہوگا:

سیاست ممکنات کا کھیل ہے۔

اس دوسرے ترجمہ میں بیک وقت دو تصرف کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ (possible) کا ترجمہ واحد کے بجائے جمع کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ (art) کا لفظی ترجمہ نہ کرتے ہوئے اس کا معنوی ترجمہ کیا گیا۔ یہاں "صحیح" ترجمہ باعتبار اسلوب کمزور ہے، اور "غلط ترجمہ" باعتبار اسلوب زیادہ جاندار۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا کتنا مشکل کام ہے۔

۲۶ نومبر ۱۹۸۳

مفتی محمد شفیع دیوبندی (مہاجر کراچی) نے لکھا ہے: جنگ عظیم اول کے موقع پر جب انگریز ترکی حکومت کے خلاف جنگ کر رہے تھے تو ہندستان کے تمام مشاہیر علماء، حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ نے ترکی حکومت کی جنگ کو جہاد قرار دے کر اس کے لئے چندے کئے تھے، اور یہ کہا تھا کہ جو لوگ انگریزوں کی فوج میں شامل ہو کر ترکی کے خلاف لڑتے ہوئے مارے جائیں گے وہ کتے کی موت مریں گے۔ (ماہنامہ بینات، کراچی، فروری ۱۹۶۶، صفحہ ۲۵)

میرے نزدیک اس قسم کے فتوے بالکل لغو تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ اس کی پشت پر "مشاہیر اور اکابر" کے نام تھے، وہ ہوا میں اڑ گئے اور ان کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

۲۷ نومبر ۱۹۸۳

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ ہندستان میں مسلمانوں کے خلاف امتیاز (discrimination) ہوتا ہے۔ یہاں ان کے لئے ترقی کے مواقع نہیں۔

میں نے کہا کہ موجودہ صورت حال اصل مسئلہ نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ اس صورت حال کو کس زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر آپ اس کو امتیاز کہیں تو اس کے نتیجہ میں مایوسی کا ذہن پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر ان کو چیلنج قرار دیں تو اس کا سامنا کرنے کا ذہن ابھرے گا۔ جس چیز کو آپ "امتیاز" کہہ رہے ہیں، وہ زندگی کی ایک حقیقت ہے جو ہر جگہ رہے گی، خواہ وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک۔ پھر جو چیز ہر حال میں باقی رہنے والی ہو اس کے خلاف شکایت اور فریاد کرنے سے کیا فائدہ۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے امتیاز اور تعصب اور ظلم کی کہانی اتنی زیادہ بار دہرائی کہ انھوں نے مسلمانوں کو بے حوصلہ کر دیا۔ اگر وہ ان حالات کو چیلنج کہہ کر پیش کرتے تو مسلمانوں میں مقابلہ کا حوصلہ پیدا ہوتا۔ یہ بلاشبہہ تمام ظلموں سے زیادہ بڑا ظلم ہے کہ کسی گروہ کو غلط رہنمائی کے ذریعہ بے حوصلہ بنا دیا جائے۔

۲۸ نومبر ۱۹۸۳

صحیح مسلم کی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن جب وضو کرتا ہے اور اپنا چہرہ دھوتا ہے تو اس کے چہرہ سے ہر وہ گناہ بہہ جاتا ہے جس کو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

پھر جب وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو دھوتا ہے تو اس کے ہاتھ سے ہر وہ گناہ بہہ جاتا ہے جس کو اس کے ہاتھوں نے پکڑا تھا۔ پھر جب وہ اپنے پیروں کو دھوتا ہے تو اس کا ہر وہ گناہ بہہ جاتا ہے جس پر اس کے پاؤں چلے تھے۔ یہاں تک کہ وہ گناہوں سے پاک ہو کر نکلتا ہے (حتی یخرج نقیاً من الذنوب)

اس کی تشریح میں ایک عالم لکھتے ہیں "وضو کی یہ کتنی بڑی فضیلت ہے کہ اس سے تمام صغیرہ گناہ خود بخود معاف ہوتے رہتے ہیں"۔

حدیث کی یہ تشریح صحیح نہیں۔ وضو سے گناہوں کا دھلنا دراصل احساس وضو کی بنا پر ہوتا ہے نہ کہ محض عمل وضو کی بنا پر۔ بندۂ مومن جب وضو کرتا ہے تو اس کا ایمانی شعور اس بدنی عمل کو روحانی عمل میں تبدیل کر دیتا ہے۔ وہ جب ایک عضو کو پانی سے دھوتا ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ عضو رحمتِ خداوندی سے دھل رہا ہے۔ وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ خدایا، جس طرح پانی نے میرے اعضا کو دھویا ہے، اسی طرح تو اپنی رحمت سے میرے گناہوں کو دھو دے۔ یہی "نیت" آدمی کو گناہوں سے پاک کرتی ہے نہ کہ کوئی "خود بخود" عمل۔

۲۹ نومبر ۱۹۸۳

علماء اہل سنت علی بن ابی طالب کو خلیفۂ راشد قرار دیتے ہیں، اور معاویہ بن ابی سفیان کو مسلم ملوک میں پہلا ملک (سلطان) کہتے ہیں۔ اس کے باوجود دونوں کے درمیان ایک عجیب فرق پایا جاتا ہے۔

حضرت علی نے خلیفہ بننے سے پہلے بڑے بڑے فاتحانہ کارنامے انجام دیے۔ مگر خلیفہ بننے کے بعد جو کچھ ہوا وہ امام ابن تیمیہ کے الفاظ میں یہ تھا: "خلافت علی میں کفار سے کوئی جہاد نہیں ہوا۔ اور نہ کوئی نئے شہر اور علاقے فتح کیے گئے۔ ان کی خلافت میں دین اسلام کو کوئی غلبہ حاصل نہیں ہوا۔" دوسری طرف امیر معاویہ کے زمانۂ اقتدار کے بارہ میں ابن تیمیہ لکھتے ہیں: "معاویہ کی حکومت کے زمانہ میں بر و بحر میں جہاد ہوا۔ شہر پر شہر فتح ہوئے۔ اسلام کی قوت و شوکت میں اضافہ ہوا اور ہر طرح سے اسلامی مملکت میں ترقی ہوئی اور دین مبین کی ترویج و اشاعت ہوئی"۔

اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ حضرت علی کے زمانۂ اقتدار میں مسلمانوں کے اندر باہمی اختلاف پیدا ہو گیا۔ مسلمان دو گروہوں میں بٹ کر آپس میں لڑتے رہے۔ جب کہ حضرت معاویہ

کے زمانہ اقتدار میں ابتدائی اختلاف کے بعد اتحاد کی حالت قائم ہوگئی اور پھر حضرت معاویہ کے آخر وقت تک باقی رہی۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اختلاف کتنی بڑی برائی ہے اور اتحاد کتنی بڑی خوبی۔

۳۰ نومبر ۱۹۸۳

ایک عربی شاعر نے کہا ہے کہ اور جب محبوب سے کوئی ایک برائی ظاہر ہوتی ہے تو اس کی خوبیاں ہزار سفارشی بن کر سامنے آجاتی ہیں:

و اذا الحبیب اتی بذنب و احد   جاءت محاسنہ بالف شفیع

ہر انسان میں خوبیاں اور خرابیاں دونوں موجود ہوتی ہیں۔ آدمی کو کسی سے محبت ہو تو اس کی خرابیوں پر اس کی خوبیاں غالب رہتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر کسی سے نفرت ہو جائے تو اس کی خوبیوں پر اس کی خرابیاں غالب آجاتی ہیں۔ بہت کم لوگ ہیں جو اپنی محبت اور اپنی نفرت سے اوپر اٹھ کر کسی شخص کے بارہ میں رائے قائم کر سکتے ہوں۔

یکم دسمبر ۱۹۸۳

ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ دنیا اس کو بھی دیتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے اور اس کو بھی جس سے وہ محبت نہیں کرتا۔ مگر ایمان وہ اسی کو دیتا ہے جس سے وہ محبت کرے (ان اللہ یعطی الدنیا من یحب ومن لا یحب ولا یعطی الایمان الا من یحب، رواہ الترمذی)

یہاں "ایمان" سے مراد رسمی ایمان نہیں ہے بلکہ کیفیت والا ایمان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کے سامان کی تقسیم تو عام ہے، اس میں سے ہر ایک کو حصہ ملتا ہے، حتی کہ خدا کے دشمنوں کو بھی۔ مگر ایمان کے گہرے تجربات اور قربت خداوندی کے نازک لمحات صرف اس انسان پر گزرتے ہیں جو اس کا خصوصی استحقاق ثابت کرے۔

۲ دسمبر ۱۹۸۳

ایک اردو شاعر کا شعر ہے:

اس نقش پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل   میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

یہ شعر بظاہر عشق و عاشقی کی واردات کا بیان ہے۔ مگر ایک اردو تنقید نگار نے اس میں عارفانہ نکتہ نکال لیا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس شعر میں دراصل تمثیل کی زبان میں یہ بات کہی گئی ہے کہ انسان کو چاہئے کہ خدا کے مقابلہ میں اپنی انا کو ختم کر دے۔

اردو اور فارسی شاعری میں اس طرح کے بے شمار عارفانہ نکتے دریافت کئے گئے ہیں۔ مگر اس قسم کے شاعرانہ نکتے صرف بعض طبیعتوں کو محظوظ کر سکتے ہیں، یہ ناممکن ہے کہ ایسے نکتوں کے ذریعہ لوگوں میں معرفت ربانی کا شعور پیدا کیا جا سکے۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما اسی قسم کی نکتہ سنجی کی زبان میں اسلامی بیداری کا درس دیتے رہے ہیں۔ مثلاً ابوالکلام آزاد نے ۱۹۴۷ کے بعد اپنی ایک تقریر میں کہا: "ستارے ڈوب گئے تو ڈوب جائیں، سورج روشن ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو اور اپنے راستہ میں بچھا دو۔" اسی طرح اقبال کا شعر ہے:

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم   دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

شارحین کے نزدیک مولانا آزاد کے مذکورہ فقرہ میں قرآنی اتباع کی دعوت ہے۔ اور ڈاکٹر اقبال کا شعر اشداء علی الکفار رحماء بینھم کی تفسیر۔ مگر یہ سب نکتے کی باتیں ہیں۔ یہ انداز کلام کسی ایک شخص کے اندر بھی اسلامی انقلاب پیدا نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی نکتہ آفرینیاں ہمیشہ ذہنی تفریح کا سامان ہوتی ہیں نہ کہ نصیحت اور اصلاح کا درس۔

۳ دسمبر ۱۹۸۲

پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق نے ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۲ کو اسلام آباد میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کیا۔ اگلے دن اس کی رپورٹ ہندستان کے اخبارات میں شائع ہوئی۔ پی ٹی آئی کی مرتب کردہ رپورٹ جو ٹائمس آف انڈیا (۲۷ اکتوبر ۱۹۸۸) میں شائع ہوئی، اس کا ایک جملہ یہ تھا کہ "پاکستان کشمیر کے مسئلہ کا ایک پر امن حل چاہتا ہے، مگر کشمیر کے عوام کی رائے معلوم کئے بغیر اس کا کوئی حل ممکن نہیں۔"

جنرل نے کہا، جنھوں نے پانچ سال پہلے فوجی انقلاب (۱۹۷۷) کے ذریعہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد پاکستان میں کسی قسم کا الکشن کرانے سے انکار کر دیا ہے۔ ٹائمس آف انڈیا کے رپورٹر کے اصل مطبوعہ الفاظ یہ ہیں:

"Pakistan wanted a peaceful solution to the Kashmir problem, but there could be no solution without consulting the people of Kashmir," said the general, who has refused to hold any elections in Pakistan since he came to power in a coup more than five years ago.

The Times of India, October 27, 1982

پی ٹی آئی کے نامہ نگار کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ اپنے لئے اس کو جائز سمجھتے ہیں کہ آپ پاکستان میں محض طاقت کے بل پر حکومت پر قبضہ کرلیں اور عوام کی آزادانہ رائے لینا ضروری نہ سمجھیں تو آپ کشمیر میں کیوں اس نظریہ کے وکیل بن سکتے ہیں کہ پہلے وہاں کے عوام کی رائے معلوم کرو، اس کے بعد عوامی رائے کے مطابق وہاں حکومت کا نظام قائم کرو۔ اسی کو کہتے ہیں: خود را فضیحت دیگراں را نصیحت۔

۴ دسمبر ۱۹۸۲

دنیا میں بے شمار لوگوں پر آفتیں آتی ہیں۔ کتنے آدمی ہیں جن کی تمنائیں حسرت و یاس کے قبرستان میں دفن ہو جاتی ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جن کی زندگیاں حوادث کی آگ میں جھلس کر رہ جاتی ہیں۔ مگر یہ سب کچھ صرف ان کا ذاتی واقعہ ہوتا ہے۔ وہ ان کے سینہ میں کسک بن کر باقی رہتا ہے۔ اور جب وہ دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو ان کے وجود کے ساتھ ان کے تلخ احساسات بھی اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

مگر آرٹسٹ کی ہلاکت کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ جب ایک آرٹسٹ ہلاک ہوتا ہے تو اس کی چیخ دوسروں کو بھی سننی پڑتی ہے۔ اس کے سینہ میں دہکتی ہوئی محرومی کی آنچ دوسروں تک بھی پہنچ کر رہتی ہے۔ عام آدمی کی ہلاکت گونگے کی ہلاکت ہے، اور آرٹسٹ کی ہلاکت زبان والے کی ہلاکت۔ یہی حقیقت ہے جس کو شاعر الم فانی بدایونی نے اپنے شعر میں اس طرح نظم کیا ہے:

زمانہ برسر آزار تھا مگر فانی ‏ ‏ ‏ تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

اسی بات کو شیلے نے ان لفظوں میں کہا ہے: شاعر دکھوں سے سیکھتے ہیں اور گیتوں سے سکھاتے ہیں۔

یہی معاملہ داعیٔ حق کا بھی ہے۔ خدا ایک "زبان والے" کو چنتا ہے، اور پھر اس کو قولِ شدید (المزمل) کے انتہائی سخت مراحل سے گزار کر حد درجہ حساس بناتا ہے تاکہ وہ خدا کے جلال اور میدان

حشر کی قیامت خیزی کے بارہ میں سب سے زیادہ تڑپنے والا بن جائے، اور پھر اس سے لوگوں کو باخبر کرے۔ دعوت محض بولنے اور لکھنے کا نام نہیں، یہ ایک حساس انسان کے اندرونی طوفان کے باہر آنے کا نام ہے، اور یہ چیز وطار شدید کے بغیر ممکن نہیں۔

۵ دسمبر ۱۹۸۳

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں۔ آپ ہر روز ستر بار استغفار کرتے تھے۔

پیغبر ایسا مصنوعی طور پر نہیں کرتا۔ یہ چیز حقیقی طور پر اس کے دل سے نکلتی ہے۔ خدا مختلف قسم کے شدید حالات سے گزار کر اس کو حد درجہ حساس بناتا ہے۔ اس کی حساسیت اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ گناہ تو درکنار، وہ اپنی بے گناہی پر تڑپنے لگتا ہے۔ وہ خدا کی عظمت سے اتنا زیادہ دبا ہوا ہوتا ہے کہ بظاہر کوئی خلاف ورزی نہ ہو تب بھی وہ سہما ہوا رہتا ہے کہ خدا اسے پکڑ نہ لے۔ اس کی بڑھی ہوئی حساسیت اس کے احساس عجز کو اتنا زیادہ بڑھا دیتی ہے کہ خدا کی طرف سے رحمت و مغفرت کے وعدہ کے باوجود اس کی زبان سے نکل جاتا ہے:

واللہ لا ادری واللہ لا ادری واللہ لا ادری وانا رسول اللہ، ما یفعل بی ولا بکم۔	خدا کی قسم میں نہیں جانتا، خدا کی قسم میں نہیں جانتا، خدا کی قسم میں نہیں جانتا، حالانکہ میں خدا کا رسول ہوں۔ کیا کیا جائے گا میرے ساتھ اور کیا کیا جائے گا تمہارے ساتھ۔

پیغبر کے ساتھ ایسا اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ اس کے تجربات حقیقی ہوں، مصنوعی نہ ہوں۔ اس کا کلام مشینی کلام کی مانند نہ ہو بلکہ حقیقی معنوں میں ایک متقی انسان کا کلام بن جائے۔

۶ دسمبر ۱۹۸۳

دہلی کا ایک مسلم کارخانہ ہے۔ اس کے بیشتر کارکن مسلمان ہیں۔ کارخانہ کے مالک سے کارکنوں کے کچھ معاشی مطالبات چل رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں کارکن روزانہ مظاہرہ کرتے ہیں۔ دن کے ایک بجے جب وقفہ ہوتا ہے تو تمام کارکن کارخانہ کے گیٹ پر جمع ہو جاتے ہیں اور سب مل کر نعرہ لگاتے ہیں پہلا نعرہ ہوتا ہے "نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر" اس کے بعد نعرے یہ ہیں: سرمایہ داری مردہ باد، مزدور اتحاد

زندہ باد، ہماری مانگیں پوری کرو۔

دین کو اپنے دنیوی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کا جو نمونہ اوپر کی مثال میں نظر آتا ہے، اس میں آج پوری امت مبتلا ہے۔ تمام مسلم قائدین کا آج یہ حال ہے کہ وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں اسلام کی دھوم مچاتے ہیں۔ مگر اس دھوم کے پیچھے جو اصل غرض ہوتی ہے، وہ ہے —— قوم سے چندہ وصول کرنا، اپنی قیادتی امیج بڑھانا، اپنی مقبولیت میں اضافہ کرنا، اپنے کو کوئی رہنما یا عالمی قائد کی حیثیت سے نمایاں کرنا۔ آج ہمارے تمام قائدین اپنی دنیوی سیاست کے لئے دین کا نعرہ استعمال کر رہے ہیں، کوئی بھونڈے طریقہ سے ایسا کر رہا ہے اور کوئی خوب صورت طریقہ سے۔

قومی تحریکوں کو اسلامی اصطلاح میں بیان کرنا، معاشی سرگرمیوں کو جہاد کا عنوان دینا، قیادتی ہنگاموں کو پیغمبرانہ مشن قرار دینا، یہ آج کی دنیا میں عام ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں دین کے بدلے دنیا خریدنا کہا گیا ہے۔

۷ دسمبر ۱۹۸۳

امیر شکیب ارسلان نے ایک بار کہا تھا کہ ہمارے زمانہ میں جو اسلامی دنیا ہے، اس کی حالت فن عروض کی بحر کی طرح ہے، کہ نام تو بحر کا ہے مگر پانی کا ایک قطرہ بھی اس میں نہیں۔

آج مسلمانوں میں دین کے نام پر بے شمار تحریکیں چل رہی ہیں۔ ساری دنیا میں ایک ہنگامۂ اسلام برپا ہے۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو ان کی حقیقت کچھ نہیں۔ یہ تحریکیں ربانیت کی زمین پر نہیں اٹھیں، بلکہ صرف قومیت کی زمین پر اٹھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انتہائی بڑی بڑی تحریکیں بالکل بے انجامی پر ختم ہو جاتی ہیں۔

۸ دسمبر ۱۹۸۳

ایک ہندو نوجوان کا واقعہ ہے۔ وہ قانون کا طالب تھا۔ کسی نے پوچھا کہ تم قانون پڑھ کر کیا کرو گے اس نے جواب دیا: چل گئی تو موتی لال، نہیں چلی تو جواہر لال۔

موتی لال نہرو نے بھی قانون کی تعلیم حاصل کی اور ان کے بیٹے جواہر لال نہرو نے بھی۔ موتی لال نے الٰہ آباد میں پریکٹس شروع کی اور اس میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ وہ عمر بھر پریکٹس کرتے رہے۔ جواہر لال نہرو نے بھی پریکٹس شروع کی۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ انھوں نے وکالت چھوڑ کر سیاسی

قیادت کا میدان اختیار کر لیا اور ۱۹۴۷ کے بعد ہندستان کے وزیر اعظم بنے۔

آدمی کسی کام کو بطور مشن اختیار کرے تو وہ اس کو ہر حال میں جاری رکھتا ہے، خواہ وہ اس میں کامیاب ہو یا ناکام۔ مگر جو کام بطور پروفیشن کیا جائے وہ اسی وقت تک جاری رہتا ہے جبکہ اس میں کامیابی حاصل ہو رہی ہو۔ کامیابی نہ ہونے کی صورت میں آدمی اس کام کو جاری نہیں رکھ پاتا۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں۔ ان میں سے اکثر کے لئے ان کی ملی اور اسلامی مہم محض ایک پروفیشن ہے نہ کہ ایک مشن۔ انھوں نے اسلام کے میدان کو بطور ایک باعزت کیریئر کے اختیار کیا ہے نہ کہ حقیقۃً اسلامی خدمت کے لئے۔

۹ دسمبر ۱۹۸۳

ایک کشمیری مثل ہے ــــ آکھ تہٰ آکھ گوکہہ۔ یعنی ایک اور ایک گیارہ "ایک" کی گنتی اگر الگ ہو تو وہ صرف ایک ہوتی ہے۔ لیکن اگر دو "ایک" اکٹھا ہو جائیں تو وہ مل کر گیارہ ہو جاتے ہیں۔ یہ کشمیری مثل اتحاد کی طاقت کو بتاتی ہے۔

۱۰ دسمبر ۱۹۸۳

نیوٹن نے دیکھا کہ سیب کے درخت سے ایک پھل ٹوٹ کر گرا اور وہ زمین پر آگیا۔ "سیب نیچے کیوں گرا، اوپر کیوں نہیں چلا گیا"۔ اس نے سوچا۔ اس سوچ نے بالآخر اس کو اس توجیہ تک پہنچایا کہ زمین میں قوت کشش ہے اور ہر چیز زمین کی طرف کھنچ رہی ہے۔ مگر یہی کل بات نہیں۔ کیوں کہ نیوٹن کے سامنے جو درخت تھا اس کے دو حصے تھے۔ جڑ اور تنہ۔ درخت کی جڑ زمین کے نیچے جا رہی تھی اور اس کا تنہ اور شاخیں اوپر کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ گویا سیب کے درخت سے پھل یا پتی کا ٹوٹ کر زمین پر گرنا اور اس کی جڑوں کا نیچے کی طرف جانا اگر اس بات کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ زمین میں قوت کشش ہے تو دوسری طرف درخت کے تنہ کا اوپر کی طرف جانا اس نظریہ کی تردید کر رہا تھا۔ مگر نیوٹن نے کچھ چیزوں کو لیا اور کچھ چیزوں کو حذف کیا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ وہ ایک ایسی حقیقت کو دریافت کرے جس کے ذریعہ سے پورے نظام شمسی کی توجیہہ کرنا اس کے لئے ممکن ہو۔

یہ حذف (elimination) کا طریقہ موجودہ دنیا میں کسی قابل عمل نتیجہ تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ اگر آپ حذف کا طریقہ اختیار نہ کریں تو آپ ہمیشہ انتشار ذہنی کا شکار رہیں گے،

آپ کسی بامعنی نظریہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

۱۱ دسمبر ۱۹۸۳

بہت سے لوگ شعبان کی پندرہ تاریخ کو حلوا پکاتے ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ اس روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دانت شہید ہوا تھا اور اسی بنا پر کوئی سخت چیز کھانے کے بجائے آپ نے حلوا تناول فرمایا۔

یہ بات تاریخ کے بالکل خلاف ہے۔ کیوں کہ محدثین اور ارباب سیر کے اتفاق کے مطابق آپ کا دانت غزوۂ احد میں شہید ہوا تھا اور غزوۂ احد شوال (۳ھ) میں پیش آیا ہے نہ کہ شعبان میں۔ نیز اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ اس دن آپ نے حلوا نوش فرمایا تھا۔

دانت شہید ہونے کے واقعہ سے "حلوا" کھانے کی سنت تو نکال لی گئی۔ مگر کسی کو اس سے دلچسپی نہیں کہ یہ بھی معلوم کرے کہ وہ کونسا فرض تھا جس کی ادائگی کے لئے آپ نے اتنی سرگرمی دکھائی کہ آپ کے دانت تک شہید کر دئے گئے۔ یہ دین داری نہیں، دین کے نام پر نفس پرستی ہے۔

۱۲ دسمبر ۱۹۸۳

زندگی کا یہ المیہ کیسا عجیب ہے کہ ایک شخص کو صرف پچاس سال تک اس دنیا میں رہنے اور کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ یہاں اپنی زندگی اس طرح بناتا ہے کہ اس کے ابتدائی تیس سال تعلیمی جدوجہد میں گزر جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنا عمل شروع کرتا ہے اور بیس سال کی زبردست محنت سے ترقی کی بلند ترین منزل پر پہنچتا ہے۔ عین اس وقت یہ حادثہ پیش آتا ہے کہ موت خاموشی کے ساتھ آتی ہے اور اس کو اس طرح اپنے قبضہ میں کر لیتی ہے کہ اس سے بچنے کے لئے وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ شاندار مکانات والا آدمی اچانک ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں نہ اس کے مکانات کی قیمت ہے اور نہ اس کی مکان سازی کی مہارت کی۔

انسان کی شخصیت کتنی زیادہ بامعنی ہے، مگر آخرت کو شامل کئے بغیر اس کی شخصیت کتنی زیادہ بے معنی ہو جاتی ہے۔

۱۳ دسمبر ۱۹۸۳

آپ کے سامنے ایک کرسی ہے۔ یہاں دو امکانات ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کرسی مضبوط ہو اور

ہوسکتا ہے کہ آپ کے بیٹھتے ہی کرسی ٹوٹ جائے۔ منطقی طور پر آپ کو حق ہے کہ آپ دونوں امکانات کو یکساں درجہ دیں اور کرسی پر نہ بیٹھیں۔ تاہم اب بھی بات ختم نہیں ہوتی۔ یہی شبہ آپ کو اس چھت کے بارے میں کرنا پڑے گا جس کے نیچے آپ کرسی کو چھوڑ کر کھڑے ہوئے ہیں۔ یہاں بھی اگر ایک طرف یہ امکان ہے کہ چھت قائم رہے تو دوسری طرف یہ امکان ہے کہ چھت گر پڑے۔ اب آپ شبہ میں پڑ کر گھر کے باہر آجاتے ہیں۔ مگر یہاں بھی بدستور آپ کے لئے دو امکانات موجود ہیں۔ ایک یہ کہ زمین پرسکون رہے، دوسرے یہ کہ زمین میں بھونچال آجائے۔ اب اگر آپ خشکی کو چھوڑ کر سمندر کے کنارے پہنچیں اور کشتی میں بیٹھنا چاہیں تو یہاں بھی دو امکانات کا مسئلہ آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ کیوں کہ اگر ایک طرف یہ امکان ہے کہ سمندر آپ کے لئے موافق رہے تو دوسری طرف یہ امکان بھی ہے کہ خوفناک موجیں اٹھ کر کشتی کو غرق کر دیں۔

تشکیک عملی طور پر ناممکن ہے۔ اس لئے ہر معاملہ میں ہم افادی نقطۂ نظر (pragmatism) کا طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ یہی طریقہ ہم کو زندگی کے وسیع تر اور ابدی معاملہ میں بھی اختیار کرنا چاہئے۔

۱۴ دسمبر ۱۹۸۳

ہندستان کی مسلم صحافت اور مسلم قیادت کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ "انگریز دشمنی" یا "ہندو خطرہ" کی بنیاد پر ابھری۔ نتیجہ یہ ہے کہ اپنے آغاز ہی سے اس کا انداز منفی ہے۔ شروع سے اب تک تقریباً بلا استثناء مسلمانوں کی صحافت اور قیادت پر سطحی جذباتیت کا انداز غالب رہا ہے۔ ایک لفظ میں ہندستانی مسلمانوں کی صحافت زرد صحافت (Yellow Journalism) ہے اور ان کی سیاست زرد سیاست (Yellow Politics)۔ اس قسم کی صحافت اور سیاست کسی قوم کو صرف مریض بنا سکتی ہے، اور وہی اس نے عملاً انجام دیا ہے۔

۱۵ دسمبر ۱۹۸۳

خالق کائنات کا معاملہ بے حد عجیب ہے۔ وہ انتہائی حد تک ظاہر ہونے کے باوجود انتہائی حد تک مستور ہے۔ شدت احساس کے تحت کبھی کبھی مجھے خیال آنے لگتا ہے کہ آج کی دنیا میں شاید کوئی ایک شخص بھی نہ ہو جو واقعی معنوں میں خالق کی ہستی کا یقین رکھتا ہو۔ خالق کے وجود میں روایتی عقیدہ رکھنے والے تو بے شمار نظر آتے ہیں، مگر خالق کے وجود میں زندہ یقین رکھنے والا شاید کوئی نہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے انسان جیسی ایک مخلوق کو پیدا کرکے دنیا میں آباد کر دیا اور اس کو اس امتحان میں ڈالا کہ وہ ایک بظاہر ناقابل یقین حقیقت پر یقین کرے۔ تاکہ خدا اس کو آخرت میں وہ نعمتیں عطا کرے جو ناقابل یقین حد تک بامعنی اور لذیذ ہیں۔

۱۶ دسمبر ۱۹۸۳

محمد عثمان (پیدائش ۱۳۳۳ھ) گیا (بہار) کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے ایک ملاقات میں بتایا کہ مولانا عبید اللہ سندھی آخر عمر میں کہا کرتے تھے کہ "جو تجربہ مجھ کو اس وقت ہے، اگر جلاوطنی سے پہلے مجھ کو وہ تجربہ حاصل ہوتا تو میں انگریزوں سے لڑائی مول نہ لیتا۔ کیوں کہ مسلمانوں میں ابھی کرنے کے اتنے کام ہیں کہ وہ بغیر لڑائی کے کئے جا سکتے ہیں۔"

یہی موجودہ زمانہ میں تقریباً ان تمام لوگوں کا حال ہوا ہے جن کو "اکابر ملت" کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی آخر عمر میں مایوسی کا شکار ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ اپنی جوانی کی عمر میں محض ردعمل کے تحت اٹھ کھڑے ہوئے۔ اگر وہ عمر کی پختگی کے بعد سوچ سمجھ کر اپنے عمل کا نقشہ بناتے تو وہ آغاز عمر میں وہی کرتے جو انھوں نے اختتام عمر میں کرنا چاہا مگر کرنے سے معذور رہے۔

۱۷ دسمبر ۱۹۸۳

ایک سیاسی مبصر کا قول ہے کہ بڑے لیڈر اکثر کسی بڑی مصیبت کی پیداوار ہوتے ہیں اور اپنے بعد کوئی بڑی مصیبت چھوڑ جاتے ہیں:

Great leaders are often the products of
catastrophes and the architects of catastrophes.

یہ وہ لیڈر ہیں جو منفی نعروں پر کھڑے ہوتے ہیں۔ جب کوئی قوم کسی مصیبت، خاص طور پر کسی کے ظالمانہ سلوک سے دوچار ہوتی ہے تو منفی نعروں پر اٹھنے والے قائدین کے لئے یہ بہترین وقت ہوتا ہے۔ وہ پرجوش تقریریں کرکے فوراً عوام کے اندر مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں۔ مگر منفی نعروں پر کھڑے ہونے والے لیڈر اس کے سوا کوئی اور کارنامہ انجام نہیں دیتے کہ وہ قوم کو ایک گڑھے سے بچانے کے نام پر دوسرے گڑھے میں گرا دیں۔

لیڈر کی ترقی اکثر حالات میں قوم کی بربادی کی قیمت پر ہوتی ہے۔

۱۸ دسمبر ۱۹۸۳

"اللہ کی قسم اتنی اچھی اڑ رہی ہے گڈی ..." مسلمان لڑکے نے کہا۔ ہندو لڑکا بولا "بھگوان کی قسم ایسی اچھی اڑتی ہوئی گڈی میں نے نہیں دیکھی"۔ عیسائی لڑکے نے کہا "مائی گاڈ، کمال کی گڈی ہے یہ"۔

آجکل کے زمانہ میں مذہب کی حقیقت بس یہی ہے۔ آج ہر آدمی اصلاً کوئی نہ کوئی "گڈی" اڑا رہا ہے۔ البتہ اسی کے ساتھ وہ مذہبی قسم بھی کھا رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قسم کھانے کے لئے کوئی شخص اللہ کا لفظ بولتا ہے، کوئی بھگوان کا اور کوئی گاڈ کا۔

۱۹ دسمبر ۱۹۸۳

اسلامی تربیت کے ایک اجتماع کے بعد میں نے آخری خطاب میں کہا: ہمارا تربیتی کیمپ ختم ہوگیا۔ اور اب ہم میں سے ہر شخص یہاں سے واپس روانہ ہوگا۔ مگر یاد رکھئے، یہاں سے جانے والا وہ ہے جو یہ سمجھے کہ وہ اپنی قبر کی طرف واپس جا رہا ہے۔ جو شخص یہ سمجھ کر یہاں سے روانہ ہو کہ وہ اپنے گھر کی طرف واپس جا رہا ہے، وہ گویا کہیں نہیں جا رہا ہے۔ کیوں کہ ہم میں سے ہر شخص کے آگے جو چیز ہے وہ گھر نہیں ہے بلکہ قبرستان ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم اپنے گھروں کو نہیں بلکہ اپنی قبروں کو واپس جا رہے ہیں — اسی حقیقت کو جاننے کا نام علم ہے، اور اسی حقیقت کو نہ جاننے کا نام بے علمی۔

موت کا سنگین ترین پہلو یہ ہے کہ اس کے بعد آدمی ان تمام امکانات سے کٹ جاتا ہے جو موجودہ امتحان کی دنیا میں اسے حاصل ہیں، حتی کہ امکانِ توبہ سے بھی۔

۲۰ دسمبر ۱۹۸۳

مولانا منت اللہ رحمانی (امیر شریعت بہار) ۲۳ دسمبر ۱۹۷۳ کو دہلی میں تھے۔ جمعیۃ بلڈنگ میں "ادارۃ المباحث الفقہیہ" کے دفتر میں ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ایک بات کہی جس کو میں نے انھیں کے قلم سے ایک کاغذ پر لکھوا لیا۔ اس کی نقل یہ ہے:

"مولانا ابوالحاسن محمد سجاد صاحب (۱۹۴۰ - ۱۸۸۳) نے مجھ سے کہا کہ ایک دفعہ مولانا محمد علی مونگیری (م ۱۹۲۷) کی خدمت میں عرض کیا کہ خدا بہتر جانتا ہے کہ جہاں جاتا ہوں اخلاص کے ساتھ جاتا

ہوں اخلاص کے ساتھ جاتا ہوں۔ لیکن جب تک رہتا ہوں، لوگ دین کی طرف مائل رہتے ہیں۔ اور وہاں سے ہٹنے کے بعد لوگ بھی دین کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اخلاص کا تو اثر ہونا چاہئے۔ حضرت مونگیری نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ ہر عصر اور زمانہ میں اپنی کسی نہ کسی صفت کے ساتھ جلوہ گر رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خیر القرون میں اپنی صفت "الہادی" کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ اور اس عہد میں اپنی صفت "المضل" کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس لئے نہ ہدایت دیرپا ہوتی ہے اور نہ اخلاص موثر۔ جس کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کا منصب ہدایت تھا، وہ گمراہ ہو رہے ہیں:

مولانا مونگیری نے جو بات کہی، وہ دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ اس دنیا میں فیض بقدر استعداد کا اصول کارفرما ہے۔ قرون اولیٰ کے لوگوں نے استعداد کا ثبوت دیا اس لئے وہ خدا کے انعام سے سرفراز ہوئے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان استعداد کا ثبوت نہ دے سکے اس لئے وہ خدا کے انعامات کو پانے میں بھی ناکام رہے۔

۲۱ دسمبر ۱۹۸۳

سقراط کا قول ہے کہ "آپ روح کا علاج کئے بغیر جسم کا علاج نہیں کرسکتے"۔ سقراط کا یہ قول معروف بیماریوں کے بارہ میں بھی صحیح ہے اور دوسرے انسانی مسائل کے لئے بھی۔

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ صحت مند ہونے کے لئے مریض کا اپنا ارادہ اور خواہش بھی انتہائی ضروری ہے۔ مریض اگر مایوسی کا شکار رہے تو ڈاکٹر کی سخت کوششوں کے باوجود اس کی حالت میں سدھار نہیں آسکتا۔ علاج کی کامیابی کا انحصار اگر ۵۰ فیصد ڈاکٹر پر ہے تو ۵۰ فیصد مریض پر۔

اسی طرح زندگی کے مسائل میں بھی آدمی کے ذہن کا بہت بڑا دخل ہے۔ ایک سچے رہنما کو پہلے آدمی کی سوچ درست کرنی پڑتی ہے، اس کے بعد ہی وہ مسائل کے حل کے لئے کسی گہرے عملی منصوبہ کو زیر عمل لاسکتا ہے۔

۲۲ دسمبر ۱۹۸۳

قرآن میں اسلام کو دین کامل کہا گیا ہے (الیوم اکملت دینکم) اس کا مطلب فہرست احکام کی تکمیل نہیں بلکہ لوازم تاریخی کی تکمیل ہے۔ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ اسلام دین مستحکم ہے۔ اسلام کا ظہور، دین خداوندی کی تاریخ میں ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہے۔ اسلام

نے اس امکان کو ختم کر دیا کہ آئندہ کوئی شخص یا گروہ خدا کے دین کے ساتھ تعدی کر سکے۔ اسلام نے خدا کے دین کو تمام پہلوؤں سے کامل کر کے اس کو ایسا مستحکم بنا دیا کہ قیامت تک اس کی برتری باقی رہے، وہ اپنے پیروؤں کے لئے ابدی سرفرازی کی ضمانت بن جائے۔

۲۳ دسمبر ۱۹۸۳

ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نرم ہے اور نرمی کو پسند کرتا ہے۔ اور اللہ نرمی پر وہ دیتا ہے جو شدت پر نہیں دیتا (ان اللہ رفیق ویحب الرفق ویعطی علی الرفق ما لا یعطی علی العنف) موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا نظریہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کٹر بن کر رہو تاکہ لوگ تم سے دبیں۔ اگر تم نرم ہو گئے تو لوگ تمہارے اوپر زیادتی کرنے لگیں گے۔ مسلمانوں کا یہ نظریہ سراسر قانون خداوندی کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار کوششوں کے باوجود مسلمان موجودہ زمانہ میں کچھ حاصل نہ کر سکے۔

۲۴ دسمبر ۱۹۸۳

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت ایسے شخص پر نہیں آئے گی، جو اللہ اللہ کہتا ہو (لا تقوم الساعة علیٰ احد یقول اللہ اللہ) کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کا مطلب زبان سے اللہ اللہ کہنا ہے۔ گویا جب کوئی شخص اللہ کا نام لینے والا نہ رہے گا، اس وقت قیامت برپا ہوگی۔

مگر یہ تشریح صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں "اللہ" باعتبار معنی ہے نہ کہ باعتبار لفظ۔ اس سے مراد اللہ کا تلفظ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت لوگ اللہ کی حقیقت سے بیگانہ ہو چکے ہونگے۔ لفظ اللہ کو زبان سے دہرانے والے تو ہوں گے مگر اللہ کی معنویت ان کے دلوں میں اتری ہوئی نہ ہوگی۔

۲۵ دسمبر ۱۹۸۳

اختر رائے پوری کی خود نوشت سوانح عمری چھپی ہے جس کا نام ہے: "گرد راہ" اس میں مصنف نے مشہور فرانسیسی مفکر سارترے کے ساتھ اپنی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ سارترے نے ان سے پوچھا کہ دوسری عالمی جنگ سے پہلے اور اس کے بعد کے پیرس میں انھیں کیا فرق محسوس ہوتا ہے۔

اختر رائے پوری نے جواب دیا کہ آج کی زندگی میں قدروں (values) کا نام ونشان نہیں ملتا۔ یہ سن کر سارترے نے کہا: نئے انسان کی نظر میں کپڑا دھونے کی مشین قدروں سے زیادہ

اہمیت رکھتی ہے۔

۲۶ دسمبر ۱۹۸۳

ایک عربی شاعر کا شعر ہے کہ جب حزام کوئی بات کہے تو اس کو مان لو، کیوں کہ بات وہی ہے جو حزام کہے:

اذا قالت حزام فصدقوها فان القول ما قالت حزام

بڑوں کی پرستش کا مزاج لوگوں میں پہلے بھی پایا جاتا تھا، اور آج بھی پایا جاتا ہے۔ اپنے بڑے یا اپنے قبیلہ کے لوگ جو کہیں اس کو صحیح سمجھ لینا۔ خواہ اس کے حق میں دلیل موجود نہ ہو۔ مگر یہ سراسر جاہلیت ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ہر بات کو دلائل پر جانچا جائے۔ ہر اس بات کو رد کر دیا جائے جو دلیل کی کسوٹی پر پوری نہ اترے۔ اور صرف اسی بات کو مانا جائے جو دلیل کی سطح پر ثابت ہو رہی ہو۔

۲۷ دسمبر ۱۹۸۳

ایک صاحب نے کہا کہ خدا نے پیغمبروں کو تمام حقیقتیں براہ راست دکھا دیں، اور ہم کو غیب میں رکھا۔ اگر ہم کو بھی تمام چیزیں دکھا دی گئی ہوتیں تو ہم دنیا میں زیادہ یقین کے ساتھ جی سکتے تھے۔

میں نے کہا کہ یہ ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت ہے۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے ہم گویا سیف سائڈ (safe side) میں ہیں۔ پیغمبر "مومن شاہد" ہوتا ہے، اس لئے اس کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ پیغمبر اگر ذرا بھی انحراف کرے تو اس کے لئے دگنا پکڑ ہے۔ اس کے مقابلہ میں عام لوگوں کی حیثیت "مومن غائب" کی ہے، اس بنا پر ان کے لئے معافی اور درگزر کا دروازہ بہت زیادہ وسیع ہے۔

۲۸ دسمبر ۱۹۸۳

امام حسین کے بارہ میں آج لوگوں کو صرف ایک بات معلوم ہے۔ یہ کہ وہ "شہید اعظم" تھے۔ مگر قدیم زمانہ میں ایسا نہ تھا۔ علامہ ابن تیمیہ نے امام حسین کے حادثہ کی بابت تین رایوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک وہ گروہ جو امام موصوف کو امام معصوم کہتا ہے اور ان کو واجب الاطاعت ثابت کرتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو امام موصوف کے کیس کو بغاوت اور امت میں انتشار پیدا کرنے کا کیس سمجھتا ہے۔ اس بنا پر وہ ان کو مجرم ٹھہرا کر ان کے قتل کو جائز قرار دیتا ہے۔ تیسرا گروہ ان دونوں رایوں کو غیر معتدل بتاتا ہے۔

اس کے نزدیک معتدل مسلک یہ ہے کہ ان کے معاملہ کو مجمل طور پر مظلوم شہادت کا معاملہ مانا جائے (منہاج السنۃ)

موجودہ زمانہ میں جو بے شمار گمراہیاں ہیں، اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ متاخرین نے متقدمین کے مسلک کو چھوڑ دیا۔

۲۹ دسمبر ۱۹۸۳

اسلامی انقلاب کے تین مرحلے ہیں۔ (۱) تبدیلیٔ فرد۔ (۲) تبدیلیٔ شاکلہ۔ (۳) تبدیلیٔ حکومت۔

اسلامی تحریک اولاً فرد کو اپنا نشانہ بناتی ہے۔ یعنی فرد کو اللہ سے ڈرنے والا بنانا اور اس کے اندر یہ احساس ابھارنا کہ وہ اپنے اعمال کے لئے آخرت میں جواب دہ ہے۔

اس کے بعد دوسرا کام زمانی شاکلہ کو بدلنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کو فکری انقلاب کہا جاسکتا ہے۔ عمومی سطح پر غیر اسلامی افکار کے مقابلہ میں اسلامی فکر کو وہی غلبہ حاصل ہو جائے جیسا کہ موجودہ زمانہ میں شہنشاہیت کے مقابلہ میں جمہوریت کو حاصل ہے۔

یہ دو کام جب قابل لحاظ مقدار میں ہو چکے ہوں، اس کے بعد ہی انسانی معاشرہ میں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آسکتا ہے۔ مذکورہ دونوں کام کو انجام دئے بغیر اگر کسی ملک میں اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ مضحکہ خیز ناکامی کے سوا کسی اور انجام تک نہیں پہنچ سکتی۔

۳۰ دسمبر ۱۹۸۳

اسلام میں تلقین کی گئی ہے کہ جب موت کا وقت آئے تو آدمی اپنی زبان سے کلمۂ توحید کا اقرار کرے۔ یہ "کلمہ پڑھنا" اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جیسے پنڈت لوگ منتر پڑھتے ہیں یا پڑھواتے ہیں۔ یہ دراصل آدمی کے آخری اندرونی احساسات کا ایک اظہار ہے۔

ایک مومن پر جب آخری وقت آتا ہے تو اس کو شدید احساس ہوتا ہے کہ اس کی زندگی اکارت چلی گئی۔ خدا کے سامنے پیش کرنے کے قابل کوئی کام وہ نہ کرسکا۔ اس وقت اس کے دل کی بے قراری چاہتی ہے کہ مرنے سے پہلے اپنے اعمال نامہ میں کوئی آخری چیز ریکارڈ کرادے۔ اس کے دل کی یہی بے قراری ہے جو کلمہ کی صورت میں نکل پڑتی ہے۔ کلمہ کے الفاظ بول کر گویا مرنے والا یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ خدایا، میں کوئی عمل تو پیش نہ کرسکا۔ البتہ میں اپنا اعتراف تیری خدمت میں پیش کرتا ہوں،

تو اسی کو میری طرف سے قبول کرلے۔

۳۱ دسمبر ۱۹۸۲

عبداللہ بن جعفرؓ سے ایک مرسل روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں جو شخص فتویٰ دینے میں سب سے زیادہ جری ہو وہ گویا جہنم میں کودنے کے لئے سب سے زیادہ جری ہے (أَجْرَؤُكُمْ عَلَى الْفُتْيَا أَجْرَؤُكُمْ عَلَى النَّار)

فتویٰ دینا بے حد ذمہ داری کا کام ہے۔ یہ خدائی حکم کا انسان کی زبان سے ادا ہونا ہے۔ اس لئے ہر وہ شخص جو اللہ سے ڈرتا ہو اور جس کے اوپر اللہ کی عظمت چھائی ہوئی ہو، وہ فتویٰ دینے سے آخری حد تک بچنا چاہے گا۔ وہ مجبوری کی صورت پیش آئے بغیر کبھی فتویٰ دینے کی ہمت نہیں کرے گا۔

یکم جنوری ۱۹۸۴ء

پہلی جنگ عظیم کے دوران جرمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے والے برطانی فوجیوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے متعلقین کے نام خط لکھیں اور اس میں یہ بتائیں کہ وہ جنگی قیدی ہونے کے باوجود جرمنی میں بہت اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ جرمن قید میں پوری طرح مطمئن ہیں۔ برطانی فوجیوں سے جو کچھ کہا جاتا اس کو وہ بے چون وچرا لکھ دیتے۔ مگر خط کے آخر میں ہمیشہ یہ جملہ بڑھا دیتے:

Tell this to the marines.

اس انگریزی فقرہ کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ "یہ بحریہ والوں کو بھی بتا دیا جائے"۔ جرمنوں نے اس فقرہ کو اس کے ظاہری مفہوم میں لے کر سمجھا کہ اس اضافہ سے کوئی حرج نہیں۔ کیوں کہ یہ اضافہ ان کی مزید پبلسٹی کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

لیکن اصل معاملہ اس کے برعکس تھا۔ یہ جملہ پرانی انگریزی بول چال میں محاورہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کو سنجیدگی سے نہ لیں۔ مگر جرمن اس کے اس مفہوم سے ناواقف تھے۔ اس لئے بطور خود تو وہ سمجھتے رہے کہ برطانی قیدیوں کے بارہ میں وہ خیریت کی خبر ان کے وطن بھجوا رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت کے اعتبار سے وہ خیریت کی تردید بھجوا رہے تھے۔ جاننے اور نہ جاننے میں کتنا زیادہ فرق ہوتا ہے۔

۲ جنوری ۱۹۸۴

طبعیات اور فلکیات دونوں مشترک طور پر کائنات کے بارے میں جو پیشین گوئی کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ کائنات بالآخر موت سے دوچار ہونے والی ہے۔ جیمس جینز کے الفاظ میں ــــــ کائناتی موت کے سوا اس سفر کا کوئی دوسرا ممکن انجام نہیں:

End of the journey cannot be other than universal death.

یہ کائناتی موت کچھ سائنس دانوں کے نزدیک حرارتی موت (Heat death) کی صورت میں پیش آئے گی۔ یعنی سورج اور دوسرے اجسام اپنی حرارت کھو دیں گے۔ ہماری دنیا میں ایک طویل برفانی دور (Ice age) شروع ہوگا جو انسان جیسی ہر زندگی کو ختم کر دے گا۔

موجودہ دنیا میں زندگی کا مظہر ایک عجیب وغریب مظہر ہے جس کی توجیہہ کرنے میں جدید

علما سخت حیرانی میں مبتلا ہیں۔ کریسی ماریسن نے زندگی کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ زندگی کہاں سے آئی، زندگی کہاں جا رہی ہے، سائنس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں:

Whence life comes, where life goes, science answers not.

اس قسم کی باتیں جو ایک آدمی سائنس میں پڑھتا ہے وہ اس وقت تک صرف ذہنی الجھاوے ہیں جب تک ان کے ساتھ پیغمبر کی بات کو شامل نہ کیا جائے۔ پیغمبر کی بات کو شامل کرتے ہی یہ تمام باتیں ایک کل کا مجموعہ بن جاتی ہیں، وہ آدمی کو شک سے نکال کر یقین کے مقام تک پہنچا دیتی ہیں۔ اب کائنات کی موت ایک نئی وسیع تر زندگی کا آغاز بن جاتی ہے اور زندگی اس وسیع تر دنیا کی طرف بامعنی سفر۔

۳ جنوری ۱۹۸۴

مصری لطیفہ بنانے کے ماہر ہیں۔ فوجی حکومت کے بعد جب پریس پر پابندیاں عائد ہوگئیں اور لوگوں کے لئے باقاعدہ شکل میں اظہار خیال کا موقع نہیں رہا تو مصر کے لوگ لطیفوں میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے۔

مصر کے ایک صاحب نے اس سلسلہ میں ایک لطیفہ بتایا جو ۱۹۶۵ کی جنگ کے بعد بنایا گیا تھا۔ ۱۹۶۵ کی جنگ میں اسرائیل کے مقابلہ میں مصر کو شکست ہوئی تھی۔ مصریوں نے لطیفہ بنایا کہ ایک بار مصر میں اسرائیل کی سلطنت قائم ہوگئی۔ جمال عبد الناصر اور جنرل عبد الحکیم کے لئے کوئی کام نہیں رہا چنانچہ دونوں نے مل کر ایک ہوٹل کھول دیا۔

ایک روز جنرل موشے دایان قاہرہ کی سڑکوں پر گھومتا ہوا مذکورہ ہوٹل میں آگیا۔ اس نے ہوٹل میں داخل ہوکر مخ (بھیجہ کا سینڈوچ) مانگا۔ ناصر نے اس سے کہا:

ما عندنا شی مخ، عندنا لسان بس۔

ہمارے پاس بھیجہ (کا سینڈوچ) نہیں، ہمارے پاس صرف زبان (کا سینڈوچ) ہے۔

یہ لطیفہ موجودہ زمانہ میں پوری مسلم دنیا پر صادق آتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہر مسلم ملک میں کثرت سے قائدین پیدا ہوئے۔ مگر ہر ایک بس صاحب لسان تھا، صاحب فہم ان میں سے کوئی بھی نہیں۔ اور

بلاشبہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

۴ جنوری ۱۹۸۴

مسلمانوں نے دور اول میں جب فلسطین پر قبضہ کیا اس وقت فلسطین اور شام کے عیسائی اس مسئلہ پر بحث کر رہے تھے کہ مسیح کا فضلہ پاک تھا یا ناپاک۔ یہی بات بعد کے زمانہ میں خود مسلمانوں کے ساتھ پیش آئی۔ عباسی دور کے آخر میں جب تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کیا اس وقت بغداد کے علماء اس بحث میں مصروف تھے کہ علی افضل ہیں یا معاویہ۔ کتنی مماثلت ہے دونوں واقعات میں۔

قوم کے زندہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے اہل علم نتیجہ خیز باتوں میں بحث کرتے ہوں۔ جب قوم کے اہل علم بے فائدہ باتوں میں بحث کرنے لگیں تو سمجھ لیجئے کہ قوم مر چکی ہے۔ زندہ لوگ زندہ معاملات پر گفتگو کرتے ہیں اور مردہ لوگ مردہ معاملات پر۔

ایک صاحب کے غیر ضروری سوالات پر میں نے یہ باتیں ان سے کہیں۔ وہ خاموش ہو گئے۔

۵ جنوری ۱۹۸۴

امیر معاویہ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے لڑکے یزید کی خلافت کے لئے بیعت لے لی تھی۔ چنانچہ ان کی وفات کے بعد یزید کو خلیفہ بنا دیا گیا۔ اس وقت حضرت عبد اللہ بن عباس مکہ میں تھے۔ مکہ میں خبر پہنچی تو لوگ اس معاملہ میں حضرت عبد اللہ بن عباس کا تأثر جاننے کے لئے ان کے پاس جمع ہو گئے۔ اس موقع پر حضرت عبد اللہ نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک جملہ یہ تھا:

وانّ ابنه يزيد لمن صالحي اهله فالزموا مجالسكم واعطوا طاعتكم و بيعتكم۔

بلاذری: انساب الاشراف، قسم ۲ صفحہ ۴، یروشلم ۱۹۴۰

ان کا لڑکا یزید ان کے لائق اہل خانہ میں سے ہے لہٰذا تم اپنی جگہ بیٹھے رہو اور اپنی طاعت اور بیعت اس کو دے دو۔

حضرت عبد اللہ کا یہ قول یزید کی موافقت سے زیادہ لوگوں کو اس کی مخالفت سے روکنے کے لئے تھا۔ اسی طرح محمد بن حنفیہ نے یزید کے بارے میں کلمۂ خیر کہہ کر لوگوں کو بغاوت سے روکنے

کی کوشش کی۔ حکمرانوں کے بارہ میں صحابہ و تابعین کا یہی طریقہ تھا۔ موجودہ زمانہ میں پہلی بار یہ سیاسی بدعت وجود میں آئی ہے کہ حکمرانوں سے ٹکراؤ کو اصل دینی کام سمجھ لیا گیا ہے۔

۶ جنوری ۱۹۸۴

سورہ الشوریٰ کی ایک آیت ہے جو قرآن میں اس طرح لکھی جاتی ہے:

ویمحُ اللہ الباطل ویحق الحق بکلمٰتہ

یہ دراصل یمحو (واؤ کے ساتھ) ہے۔ مگر پہلی بار جب قرآن لکھا گیا تو اس وقت قرآن کے کاتبین نے اس کو واؤ کے بغیر یمحُ لکھا۔ چنانچہ بعد کے تمام مصاحف میں وہ اسی طرح نقل ہوتا رہا۔ اور آج بھی وہ اسی طرح چھپتا ہے۔

اسی طرح قرآن میں یدع الانسان (الاسراء ۱۱) ہے۔ یہاں بھی وہ دراصل یدعو (واؤ کے ساتھ) ہے۔ مگر ابتدائی نسخہ میں چوں کہ وہ واؤ کے بغیر لکھا گیا تھا اس لئے آج بھی وہ اسی طرح لکھا جاتا ہے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کو اس کی ابتدائی صورت میں محفوظ رکھنے کے لئے کتنا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے۔ انسان کی عقل اور نحو کا علم کہتا ہے کہ اس کو یمحو اور یدعو لکھو مگر لوگوں نے قرآن میں کسی بھی قسم کا فرق یا تبدیلی نہیں کی۔ وہ آخری شوشہ کی حد تک اس کی ابتدائی صورت میں اس کو محفوظ کرتے رہے۔

قرآن کے کتابِ محفوظ ہونے کی یہ کتنی بڑی دلیل ہے۔

۷ جنوری ۱۹۸۴

موجودہ زمانہ کے علماء جن چیزوں کی کھوج میں ہیں ان میں سے ایک بالائی تہذیب ہے۔ زمین پر انسانی تہذیب کے علاوہ کیا بالائی خلا میں کوئی اور تہذیب ہے جو ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ پچھلے ۲۵ برسوں کے سائنسی مطالعہ نے کافی حد تک یہ امکان ظاہر کیا ہے کہ کائنات میں ہمارے علاوہ دوسری "ٹکنکل سولائزیشن" بھی ہو سکتی ہے۔

اس قیاس کی وجہ یہ ہے کہ جدید علماء کو کائنات میں ماورائی ذہانت (Extraterrestrial intelligence) کے آثار ملے ہیں۔ ان آثار کا نتیجہ یہ ہونا

چاہئے تھا کہ خدا کے وجود پر لوگوں کا یقین بڑھتا۔ مگر غیر خدا پرستانہ ذہن کا یہ کرشمہ ہے کہ وہ اولاً ذہانت کو انسانی ذہانت سمجھ رہے ہیں۔ جو چیز حقیقۃً خدا کا وجود ثابت کر رہی ہے اس کو اس معنی میں لے رہے ہیں کہ کائنات میں کسی سیارہ پر انسانی تہذیب جیسی کوئی اور تہذیب موجود ہے۔ حالانکہ کائنات میں "ذہانت" کے آثار ملنا اور ذہانت کا نظر نہ آنا یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ ذہانت اپنی نوعیت کے اعتبار سے غیر انسانی ہے، وہ غیر مرئی ہے نہ کہ انسان کی طرح مرئی۔

۸ جنوری ۱۹۸۴

مجھے نیچر سے بے پناہ دلچسپی ہے۔ ایک پتی کو دیکھ کر میرے اندر تموج (thrill) پیدا ہوتا ہے۔ ایک پتی کے اندر جو کاریگری ہے وہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی تمام انجینیرنگ سے زیادہ عظیم ہے۔

ایک بار میں نے دہلی کی ایک لائبریری میں نیویارک سے نکلنے والا میگزین لائف (Life) دیکھا۔ یہ جون ۱۹۸۰ کا شمارہ تھا۔ اس کے صفحہ ۱۰۷ پر ایک اشتہار تھا۔ اس اشتہار میں انگور کے خوشہ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ تصویر بالکل نیچرل رنگ میں تھی اور بے حد کامیاب تھی اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کاغذ کے صفحہ پر سچ مچ انگور کا خوشہ رکھا ہوا ہے۔

انگور کے خوشہ کی اس کامیاب تصویر کو میں لائبریری میں بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر بھی طبیعت سیر نہ ہوئی۔ واپس آکر میں نے اپنے پڑوسی مسٹر حسن عسکری سے کہا کہ آپ لائف میگزین کا جون ۱۹۸۰ کا شمارہ کہیں سے حاصل کرکے لے آئیے۔ وہ کناٹ پلیس میں کتاب کی دکانوں پر تلاش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک دکان دار کے یہاں ان کو وہ شمارہ مل گیا۔ انھوں نے مجھے رپورٹ دی کہ دکاندار اس شمارہ کے ۲۵ روپیہ مانگتا ہے۔ میں نے اسی وقت ان کو ۲۵ روپیہ دئے اور کہا کہ اس کو دکان دار سے خرید لیجئے۔ لائف کا یہ شمارہ میں بہت دن تک اپنی میز کی دراز میں رکھے رہا اور انگور کے خوشہ کی اس تصویر کو دیکھتا رہا۔

اس تصویر میں میں آرٹسٹ کا کمال نہیں دیکھتا تھا بلکہ مجھے اس کے اندر خدا کی تخلیق کا کمال دکھائی دیتا تھا۔ اس میں مجھے مخلوق کے روپ میں خالق نظر آتا تھا۔ اسی بات کو کسی شاعر نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے: ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار۔

۹ جنوری ۱۹۸۴

قدیم زمانہ میں پیغمبروں کی اتنی شدید مخالفت کیوں کی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پیغمبر اور دعاۃ دورِ شرک میں پیدا ہوئے۔ اس وقت تاریخ میں شرک کا تسلسل قائم ہو گیا تھا۔ جب کوئی چیز تاریخ پر اتنا چھا جائے کہ تاریخ میں اس کا تسلسل قائم ہو جائے تو اس کے خلاف آواز اٹھانا مشکل ترین کام ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پہلے انسانی گروہ ہیں جنھوں نے تاریخ کے اس تسلسل کو توڑا۔ انھوں نے شرک کا رشتہ انسانی تاریخ سے منقطع کیا۔ یہ ایک انتہائی مشکل کام تھا اور اسی مشکل کام کو انجام دینے کی وجہ سے وہ "خیرامت" کے مستحق قرار پائے۔

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران یہ تفصیلات پیش کرتے ہوئے میں نے کہا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ موجودہ مسلمان بحیثیت قوم "خیرامت" ہیں۔ مگر میں اس کو نہیں مانتا۔ میرے نزدیک صحابہ کرام (بنو اسماعیل) خیرامت تھے۔ ہم لوگ صرف ان کے متبع ہونے کا کریڈٹ پا سکتے ہیں، بشرطیکہ ہم ان کا اتباع کریں۔

خیرامت نسلی مسلمانوں کا لقب نہیں ہے۔ خیرامت ان لوگوں کی صفت ہے جنھوں نے اپنے آپ کو فی الواقع اس کا مصداق ثابت کیا۔ صحابہ کرام اس کا مصداق اول تھے۔ اب اگر کوئی گروہ اس کا مصداق ثانی بننا چاہے تو وہ صحابہ کرام جیسا بننے کی کوشش کرے۔

۱۰ جنوری ۱۹۸۴

الجمعیۃ ویکلی کی ادارت کے زمانہ میں ایک بار مجھے دار العلوم دیوبند جانا پڑا۔ وہاں مجھے النادی الادبی کے سالانہ جلسہ کی صدارت کے لئے بلایا گیا تھا۔

اس موقع پر دار العلوم میں میری چند تقریریں ہوئیں۔ ایک تقریر میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں ہمارا اصل مسئلہ افراد کار کا مسئلہ ہے۔ دین کے احیاء کے لئے آج زبردست مواقع کھل گئے ہیں۔ مگر وہ آدمی نہیں ملتے جن کو ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے استعمال کیا جائے۔ مجھے یاد ہے کہ ابھی میری تقریر جاری تھی کہ حاضرین میں سے ایک نوجوان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا:

"میں آپ کے مشن کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں۔ آپ جس طرح چاہیں مجھے استعمال کریں"۔

میں نے نوجوان کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ میں آپ کی اس پیش کش کی قدر کرتا ہوں۔ البتہ میں اس میں اتنی ترمیم کر رہا ہوں کہ آپ اپنے آپ کو آج پیش کرنے کے بجائے ایک مہینہ کے بعد پیش کریں۔ آپ ایک مہینہ کے بعد مجھے خط لکھیں اور اس میں وہ الفاظ تحریر فرمائیں جو اس وقت آپ نے اپنی زبان سے ادا کئے ہیں۔

اس کے بعد میں دہلی واپس آگیا۔ ایک مہینہ گزر گیا مگر مذکورہ طالب علم کا کوئی خط نہیں آیا۔ ایک کے بعد ایک مہینے گزرتے رہے یہاں تک کہ سال پورا ہو گیا مگر طالب علم کا کوئی خط مجھے نہیں ملا۔ اب اس واقعہ کو ۱۵ سال سے زیادہ ہو چکے ہیں مگر میرے انتظار کی مدت ابھی تک ختم نہ ہو سکی۔

یہ چھوٹا سا واقعہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی تصویر ہے۔ وقتی جوش کے تحت فوری طور پر وہ بڑی بڑی پیش کش کر سکتے ہیں، مگر مستقل طور پر کسی سنجیدہ کام میں اپنے آپ کو لگانا ان کے بس کی چیز نہیں۔ اور بلاشبہہ کسی قوم کے زوال یافتہ ہونے کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے۔

۱۱ جنوری ۱۹۸۴

ایک صاحب ہیں۔ ان کی اعلیٰ تعلیم لندن میں ہوئی۔ پھر انھیں ہندستان میں ایک اچھی ملازمت مل گئی۔ اب وہ یہاں کے ایک مرکزی شہر میں رہتے ہیں۔ مذکورہ بزرگ کو ایک شخص نے ایک انگریزی مضمون نظر ثانی کے لئے بھیجا۔ اس میں ہندستان ٹائمس کا ایک اقتباس بھی شامل تھا۔ نظر ثانی کے بعد جب مضمون واپس آیا تو اس کے ساتھ ان کا حسب ذیل نوٹ شامل تھا:

The quotation from the HT is too badly worded to be used intact. So I have re-phrased it, but not as a quotation.

یہ بات اردو میں کہنا ہو تو اس کو اس قدر سادہ اور بندھے ہوئے الفاظ میں نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان ہمیشہ استعمال سے بنتی ہے۔ اردو زبان کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کو شاعروں اور خطیبوں نے بنایا۔ اس لئے اس کے اوپر غیر حقیقی اسلوب چھا گیا۔ اس کے برعکس انگریزی زبان موجودہ زمانہ میں سائنس کے ماحول میں بنی اور سائنس میں آدمی مجبور ہوتا ہے کہ وہ

سادہ اور متعین زبان استعمال کرے۔ سائنس میں مصنوعی زبان یا مبالغہ آمیز اسلوب میں کوئی بات کہنا ممکن نہیں۔

اردو زبان کی بدقسمتی شاعر لوگ ہیں اور انگریزی زبان کی خوش قسمتی سائنس داں لوگ۔

۱۲ جنوری ۱۹۸۴

ایک صاحب سے بات ہو رہی تھی میں نے کہا ــــــ آدمی جہاں مرے گا وہیں وہ اٹھے گا۔

انھوں نے کہا اس کا کیا مطلب۔ میں نے کہا کہ میری مراد جسم کے اٹھنے سے نہیں ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آدمی کا خاتمہ جس شعوری حیثیت پر ہوگا اسی شعوری حیثیت پر وہ آخرت میں اپنے آپ کو پائے گا۔

ایک آدمی دنیا میں کبر اور حسد اور تعصب کے جذبات میں جی رہا تھا اور اسی پر اس کا خاتمہ ہوا تو آخرت میں بھی وہ اپنے انہیں جذبات کے ساتھ اٹھے گا۔ مگر وہاں چوں کہ وہ حالات نہ ہوں گے جو کسی آدمی کے لئے کبر اور حسد اور تعصب کا سامان فراہم کرتے ہیں اس لئے وہاں ایسا آدمی اپنے آپ کو اس حال میں پائے گا جیسے کوئی مچھلی پانی سے نکال کر خشکی میں ڈال دی جائے۔ دنیا میں وہ جس غذا پر جی رہا تھا وہاں وہ غذا اس کے لئے موجود نہ ہوگی اس لئے وہاں کے ماحول میں وہ بے غذا ہو کر رہ جائے گا۔

اسی طرح ایک شخص نے اس میں کمال پیدا کیا کہ وہ حقیقتِ واقعہ کے خلاف بولے اور اس کی بنیاد پر بڑائی حاصل کرے۔ دنیا میں بظاہر وہ کامیاب دکھائی دیتا ہے۔ کیوں کہ یہاں اس کو اپنے موافق الفاظ مل جاتے ہیں۔ مگر آخرت میں اس کی یہ صلاحیت بالکل بے قیمت ہو جائے گی۔ آخرت ایک ایسا عالم ہے جہاں کوئی ایسی ہی بات الفاظ میں ڈھل سکے گی جو حقیقت واقعہ کے مطابق ہو۔ اب جو لوگ حقیقت واقعہ کے خلاف بولنے والے بن کر مریں وہ آخرت میں اس حال میں اٹھیں گے کہ وہ بولنا چاہیں گے مگر انھیں الفاظ نہ ملیں گے کہ وہ بولیں۔ وہاں وہ اسی طرح بے زبان ہو جائیں گے جیسے کوئی اردو داں روسی زبان بولنے والوں کے درمیان زبان رکھتے ہوئے

بے زبان ہو جاتا ہے۔

۱۳ جنوری ۱۹۸۴

موجودہ زمانہ میں طبیعی سائنس کا اثر تمام علوم پر پڑا ہے۔ حتی کہ اب انسانی معاملات کا مطالعہ بھی انھیں اصطلاحوں میں کیا جانے لگا ہے جو جامد سائنسوں کے لئے مستعمل ہیں۔ مثلاً اکنامک تھیوری موجودہ زمانہ میں دو بڑی شاخوں میں تقسیم کی جاتی ہے:

۱۔ اکنامک اسٹیٹکس (s)

۲۔ اکنامک ڈائینمکس (Economic dianamics)

اسٹیٹکس اور ڈائینمکس دونوں غیر حیاتیاتی الفاظ ہیں۔ یہ مکنکس سے لئے گئے ہیں۔ آگسٹ کامٹے نے سب سے پہلے یہ دونوں الفاظ سوشل سائنسز میں استعمال کئے۔ اس کے بعد جان اسٹورات مل نے ان کو اکنامکس میں استعمال کیا۔ ۱۹۲۸ سے یہ الفاظ زیادہ واضح طور پر استعمال ہونے لگے جب کہ راگنر فریش (Ragnar Frisch) نے ان کی سائنسی تشریح کی۔

اصطلاحات کا یہ استعمال اس مفروضہ پر ہے کہ سماجی اور معاشی علوم بھی اسی طرح متعین قوانین کے پابند ہیں جس طرح جامد مادی علوم۔ مگر اس کی حقیقت ایک مفروضہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک منفرد مخلوق ہے اور انسان کے معاملات پر منفرد انداز ہی میں غور کیا جا سکتا ہے۔

۱۴ جنوری ۱۹۸۴

اچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ شیخ عبد الرحیم سندھی کے نام سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف تحریک مجاہدین میں کافی حصہ لیا۔ اسی طرح مولانا عبید اللہ سندھی ایک سکھ خاندان میں پیدا ہوئے اور پھر اسلام قبول کر لیا۔ انھوں نے دیوبند میں تعلیم پائی۔ اس زمانہ میں دیوبند میں سیاست کا زور تھا۔ چنانچہ وہ شیخ الہند کی تحریک میں شامل ہو کر انگریزوں کے خلاف سیاسی جہاد میں زبردست کام کرتے رہے۔

اس طرح کے بہت سے لوگ ہیں جنھوں نے موجودہ زمانہ میں اسلام قبول کیا۔ وہ غیر مسلموں میں دعوتی کام کے لئے بے حد موزوں ہو سکتے تھے۔ مگر چوں کہ مسلمان خود غیر مسلموں میں دعوتی کام سے بہت دور تھے اس لئے یہ نو مسلم بھی اسی سیاسی کام میں لگ گئے جس میں مسلم قائدین نے اپنے آپ کو مصروف

کر رکھا تھا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے خود بھی دعوتی کام نہیں ، اور جو لوگ خود سے اسلام کے دائرہ میں آئے ان کو بھی وہ دعوتی کام میں استعمال نہ کرسکے۔

۱۵ جنوری ۱۹۸۴

۱۹ اپریل ۱۹۷۵ کو ہندستان نے اپنا پہلا سٹلائٹ (آریہ بھٹ) چھوڑا۔ اسپیس کمیشن کے چیرمین پروفیسر ایس دھون سے پوچھا گیا کہ کیا خلائی ٹکنالوجی ایک ایسا تعیش ہے جس کا ہم تحمل نہیں کرسکتے:

Is space technology a luxury we cant't afford?

پروفیسر دھون نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہم خلا میں صرف اس لئے جاتے ہیں تاکہ ہم دوبارہ زمین پر واپس آسکیں:

We go into space only to come back to earth.

Illustrated Weekly of India, May 4, 1975

انسان اپنے عمل کی تبریر (justification) کے لئے ہمیشہ خوبصورت الفاظ پالیتا ہے۔

۱۶ جنوری ۱۹۸۴

ایک بڑے مسلمان عالم نے سیرت پر ایک مقالہ لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صفات کمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

کوئی لائے تو ایسا پیغمبر
کوئی دکھائے تو ایسا رسول

مذکورہ عالم کے یہ الفاظ پڑھتے ہوئے مجھے فرزدق کا یہ شعر یاد آگیا:

اولئك آبائی فجئنی بمثلهم

(یہ میرے آبا ہیں پھر تم ان کے جیسا میرے پاس لے آؤ)

مسلمانوں نے پیغمبر اسلام کو اپنا قومی ہیرو بنا لیا ہے۔ انھوں نے آپ کو قومی اکابر کا درجہ دے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر کے معاملہ میں مسلمانوں کی بولی وہی ہوگئی ہے جو فرزدق کی اپنے قومی بڑوں

کے بارہ میں تھی۔ اگر مسلمان یہ سمجھتے کہ پیغمبر خدا کی طرف سے آنے والا تمام انسانیت کا رہنما تھا تو ان کی زبان سے ہرگز ایسے الفاظ نہ نکلتے۔

۱۷ جنوری ۱۹۸۴

جدید دنیا میں آزادی کو خیر اعلیٰ تسلیم کیا گیا ہے۔ جدید مذہب کے نزدیک کوئی ایسا اقدام سراسر ناجائز ہے جس سے انسان کی آزادی چھنتی ہو۔ سگرٹ کی صنعت اس کی ایک مثال ہے۔ تمام ڈاکٹر اور علمائے صحت متفقہ طور پر سگرٹ کو صحت کے لئے سخت مضر بتاتے ہیں۔ اس کے باوجود اب تک سگرٹ کو بند نہ کیا جاسکا کیوں کہ ایسا کرنا انسانی آزادی کے خلاف ہوگا۔

امریکہ میں اس آزادیٔ عمل کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ ۱۹۷۲ میں وہاں کی چھ سگرٹ ساز فرموں سے ایک معاہدہ لیا گیا۔ یہ فرمیں امریکہ میں سگرٹ کا ۹۹ فی صد حصہ بناتی ہیں۔ تحریری معاہدہ جو لیا گیا وہ یہ تھا کہ کمپنیاں ہر سگرٹ کے اشتہار میں نمایاں طور پر یہ الفاظ لکھیں گی:

Cigarette smoking is injurious to your health.

(سگرٹ پینا آپ کی صحت کے لئے خطرناک ہے) یعنی سگرٹ بھی جاری رہا اور اسی کے ساتھ یہ اعلان بھی۔ اب اسی قسم کے قوانین دوسرے ملکوں میں بھی بنائے گئے ہیں۔

آزادی بلاشبہ اچھی چیز ہے، مگر جب آزادی بے قید چھوٹ کے ہم معنی بن جائے تو تو وہ اپنی افادیت کھو دیتی ہے۔

۱۸ جنوری ۱۹۸۴

جس زمانہ میں میں جماعت اسلامی سے وابستہ تھا اور اس کی مرکزی مجلس شوریٰ کا رکن تھا، اکثر بڑے اجتماعات میں مجھے کوئی تربیتی مقالہ پڑھنے کے لئے کہا جاتا تھا۔ "مومن کی تصویر" "قرآن کا مطلوب انسان" وغیرہ ایسے ہی مقالات ہیں جو میں نے جماعت اسلامی کے اجتماعات میں پڑھے۔

ان مقالات میں سے ہر مقالہ میں نے اس طرح لکھا تھا کہ پہلے میں نے پورا قرآن بغور پڑھا۔ پورے قرآن کو پڑھ کر اپنا ذہن بنایا کہ اس مقالہ میں مجھے کیا بات کہنا چاہئے۔ اس طرح

پورے قرآن کو پڑھ کر جو ذہن بنتا تھا اس کو میں دوسری معلومات سے مدلل کرکے اپنے مقالہ میں پیش کرتا تھا۔

یہ میرے مزاج کی وجہ سے تھا جو پیدائشی طور پر میرے اندر موجود ہے۔ مجھے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید میں پیدائشی سائنس داں (born scientist) ہوں۔ سائنس داں کا خاص مزاج حقیقت واقعہ سے مطابقت کرنا ہوتا ہے اور یہ مزاج میرے اندر بچپن سے ہے۔ مذکورہ عمل بھی میرے اسی ذہن کی وجہ سے ہوا۔

حقیقت واقعہ سے مطابقت کا مزاج مجھ سے تقاضا کرتا ہے کہ میں وہی کہوں جو اصل حقیقت کے عین مطابق ہو۔ اب چوں کہ اصل حقیقت وہ ہے جو قرآن میں ہے۔ اس لئے میں دل سے چاہتا تھا کہ اپنے مقالہ یا تقریر میں جو بات پیش کروں وہ قرآن سے ٹکرانے والی نہ ہو، وہ وہی ہو جو قرآن میں ہے۔ میرا یہ مزاج اتنا بڑھا ہوا تھا کہ میں مقالہ یا تقریر کے موقع پر از سر نو قرآن پڑھتا تھا، حالاں کہ اس سے پہلے میں بار بار اس کو پڑھ چکا ہوتا تھا۔

۱۹ جنوری ۱۹۸۴

کسی چیز کا کھونا وہی شخص برداشت کرتا ہے جس کے پاس اس کے بعد بھی اس سے بڑی چیز موجود ہو۔ جو آدمی کھونے کے بعد خالی ہو جائے وہ کبھی کھونے کو برداشت نہیں کر سکتا۔

ایک شخص کی جیب میں پچاس ہزار روپئے کے نوٹ بھرے ہوئے ہوں، اس کا اگر ایک روپیہ کہیں گر جائے تو وہ اس کی پروا نہیں کرے گا۔ مگر جس شخص کا کل اثاثہ ایک روپیہ ہو اس کا ایک روپیہ اگر کھو جائے تو وہ اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے لڑتے رہتے ہیں۔ اس طرح وہ صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ ان کے پاس کوئی بڑی چیز نہیں۔ اگر وہ کوئی بڑی چیز پائے ہوئے ہوتے تو ہرگز وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے لڑائی نہ کرتے۔

۲۰ جنوری ۱۹۸۴

كتب رجل الى حكيم يقول : لِمَ تبخل على الناس بالكلام. فقال الحكيم انّ الخالق سبحانه قد خلق لنا أذنين ولسانا واحداً لنسمع اكثر

ممّا نتكلم، لا ان نتكلم اكثر مما نسمع (العربي دسمبر ۱۹۸۵، صفحہ ۵۵)

ایک شخص نے ایک دانش مند آدمی کو خط لکھا کہ آپ لوگوں سے بولنے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ دانش مند نے جواب دیا: خالق نے ہمارے لئے دو کان پیدا کئے اور ایک زبان پیدا کی۔ تاکہ ہم اس سے زیادہ سنیں، جتنا کہ ہم بولتے ہیں۔ نہ یہ کہ ہم اس سے زیادہ بولیں جتنا کہ ہم سنتے ہیں۔

اگر لوگ اسی ایک بات کو پکڑ لیں تو دنیا کے آدھے جھگڑے ختم ہو جائیں۔

۲۱ جنوری ۱۹۸۴

جاپانی صنعت کا مطالعہ کرنے والے ایک شخص نے لکھا ہے:

Their decisions are highly effective. Yet they violate every rule in the book.

جاپانیوں کے فیصلے انتہائی پر اثر ہوتے ہیں۔ مگر وہ کتاب میں لکھے ہوئے ہر قاعدہ کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

زندگی اجتہاد کا امتحان ہے۔ زندگی میں ہمیشہ مجتہدانہ ذہن کامیاب ہوتے ہیں۔ تقلیدی ذہن رکھنے والوں کے لئے اس دنیا میں اس کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں کہ وہ تمام قوموں سے پیچھے چلے جائیں اور پھر دوسروں کی شکایت کرتے رہیں۔

مقلد کیوں تقلید کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے "بڑوں" سے ملنے والی چیز کو سب سے اعلیٰ سمجھ لیتا ہے۔ اب جب مقابلہ کی اس دنیا میں اسے شکست ہوتی ہے تو نفسیاتی طور پر وہ اپنے آپ کو غلط سمجھ نہیں پاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ناکامی کا الزام دوسروں کے سر ڈال دیتا ہے۔

مقلد آدمی ہمیشہ دوسروں پر الزام دے گا اور مجتہد آدمی خود الزام قبول کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مجتہد آدمی غلطی کرکے بھی دوبارہ صحیح راہ پا لیتا ہے، جب کہ مقلد کو کبھی اس کی توفیق حاصل نہیں ہوتی۔

۲۲ جنوری ۱۹۸۴

لال کنواں (دہلی) میں ایک پرانا پیپل کا درخت ہے۔ یہاں ہندو تقسیم ہند کے پہلے

سے پوجا کی رسمیں ادا کرتے رہے ہیں۔ اب پچھلے سال انھوں نے یہاں گھنٹہ لٹکا دیا اور اپنے پوجا کے اوقات میں گھنٹہ بجانے لگے۔

اس سے مسلمانوں کی نماز میں خلل پڑنے لگا۔ چنانچہ حسب معمول مسلمانوں نے شور وغل کیا۔ جلوس نکالا۔ حتیٰ کہ پولیس نے گولی چلائی۔ اس کے بعد سے پیپل کے پاس ایک مستقل پولیس چوکی بنا دی گئی۔ شور وغل کرنے والے مسلمان خاموش ہو کر گھروں میں بیٹھ گئے۔

اس پیپل کے قریب ایک مسجد ہے۔ یہی وہ قریبی مسجد ہے جس کے نمازیوں کی نماز "خراب" ہو سکتی تھی۔ اسی زمانہ میں ایک روز میں نے اس مسجد میں فجر کی نماز پڑھی۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ فجر کی جماعت میں صرف تین آدمی تھے۔ ایک امام اور دو مقتدی۔ یہ تینوں اتنے بوڑھے ہو چکے تھے کہ عجب نہیں کہ کبر السن ہونے کی وجہ سے وہ کم سنتے ہوں۔

نماز خراب ہونے پر جلوس نکالنے والے سب کے سب نوجوان تھے۔ جلوس کے دن نوجوانوں سے سڑک بھر گئی تھی۔ مگر نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں صرف تین بوڑھے موجود تھے۔ گویا نماز نہ پڑھنے والوں کی نماز خراب ہو رہی تھی۔

کیسے عجیب ہوں گے وہ لوگ جن کی نمازیں خراب ہو رہی ہوں حالانکہ وہ مسجد میں نماز کے لئے آتے ہی نہ ہوں۔ یہی وہ سیاست ہے جس نے ہندستانی مسلمانوں کے سارے معاملہ کو برباد کر رکھا ہے۔

۲۳ جنوری ۱۹۸۴

ایک صاحب تھے۔ ان کا نام شفیع اللہ تھا۔ وہ تعلیم یافتہ نہ تھے۔ وہ اکثر منت ماننے کے لئے مزاروں پر جایا کرتے تھے۔ ایک بار وہ کچھوچھہ یا اجمیر سے واپس آئے تو بستی کی مسجد کے امام صاحب نے ان پر تنقید کی اور کہا کہ آپ غیر اللہ سے مدد مانگنے جاتے ہیں، یہ شرک ہے، شفیع اللہ نے امام صاحب کی تنقید سنی تو بگڑ کر کہا:

ہم کو فائدہ ہے، ہم تو جائیں گے۔

یہی حال موجودہ زمانہ میں ہمارے لیڈروں کا ہے۔ وہ جذباتی سیاست چلاتے ہیں، وہ قومی نفرت اور تعصب کی بنیاد پر تحریکیں اٹھاتے ہیں۔ آپ کتنا ہی اس کے خلاف دلیل دیجئے۔

اس کو واقعات سے اور قرآن وحدیث سے بالکل باطل ثابت کر دیجئے۔ مگر وہ اپنی جھوٹی سیاست پر قائم رہیں گے، وہ کسی حال میں اس کو چھوڑنے والے نہیں۔ اس کی وجہ وہی نفسیات ہے جو مذکورہ شیخ اللہ کے یہاں نظر آتی ہے ۔ یہ لیڈر اتنے جاہل نہیں کہ وہ مذکورہ الفاظ بولیں۔ مگر وہ زبان حال سے یہی کہہ رہے ہیں:

ہم کو فائدہ ہے ، ہم تو اس کو کریں گے۔

ہمارے لیڈر جو جھوٹی سیاست چلا رہے ہیں یہی ان کا کل سرمایہ ہے۔ وہ اسی کے اوپر کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کی ساری مقبولیت اور ترقی اسی سے وابستہ ہے۔ اگر وہ اس کو چھوڑ دیں تو ان کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اوپر دلیل کام نہیں کرتی۔ بالکل بے دلیل ہو کر بھی وہ اپنے طریقہ کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔

۲۴ جنوری ۱۹۸۴

"کتابیں صرف دو ہیں : قرآن اور کائنات " بظاہر یہ بات بڑی عجیب لگتی ہے لیکن اگر لفظ بدل دیا جائے تو ہر آدمی اس سے اتفاق کرے گا۔ یعنی اگر اسی کو یوں کہا جائے کہ علم صرف دو ہیں: الہامی علم اور سائنسی علم تو ہر آدمی کو یہ ایک سیدھی سی بات معلوم ہوگی۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی بات کو سمجھنے کے لئے لفظ کو بدلنا پڑتا ہے۔ ایک شخص جس کی مادری زبان اردو ہو وہ اردو میں سوچتا ہو اور پھر تعلیم گاہ میں انگریزی زبان پڑھے تو اس کا ذہن انگریزی الفاظ کو ترجمہ کرکے سمجھے گا۔ مثلاً (ocean) کا لفظ بولا جاتے تو وہ اس کو صرف اسی وقت سمجھ پائے گا جب کہ وہ اس کو اپنے ذہن میں "سمندر" کے لفظ میں تبدیل کرلے۔

یہی حال معانی کا ہے۔ معانی کا اظہار مختلف انداز میں کیا جاتا ہے مگر ہر آدمی کا ذہنی ڈھانچہ الگ الگ ہوتا ہے۔ ایک معنوی حقیقت کسی آدمی کی ذہنی پکڑ میں صرف اس وقت آتی ہے جب کہ وہ اس کے اپنے ذہنی ڈھانچہ کے مطابق تبدیل کر دی گئی ہو۔

اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ شرح اور تفسیر کا مطلب کیا ہے۔ شرح اور تفسیر کوئی نئی بات کہنے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ یہ ہے کہ لفظ کو بدل دیا جائے۔ کوئی بات جو ایک قسم کے لفظ میں کہی گئی ہے اس کو دوسرے قسم کے لفظ میں بیان کر دیا جائے۔

۲۵ جنوری ۱۹۸۴

میری میز پر ایک رجسٹر تھا۔ میں نے اس کو ہٹانا چاہا۔ ایک صورت یہ تھی کہ میں اپنی کرسی سے اٹھتا اور رجسٹر کو لے جا کر دوسری میز پر رکھ دیتا۔ مگر میں نے چاہا کہ میں اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے رجسٹر کو دوسری میز پر پہنچا دوں۔ چنانچہ میں نے رجسٹر کو ہاتھ میں لے کر اسے دوسری میز کی طرف پھینکا۔ یہ دوسری میز چھوٹی تھی رجسٹر صحیح رخ سے اس کے اوپر نہیں پہنچا۔ وہ پھسل کر زمین پر گر گیا۔

اچانک مجھے خیال آیا "ہم ایک رجسٹر کو پھینک نہیں سکتے اور خدا اَن گنت تاروں اور سیاروں کو خلا میں پھینکے ہوئے ہے"۔ ہمارا پھینکا ہوا رجسٹر غیر متوازن ہو کر اِدھر اُدھر گر پڑتا ہے۔ مگر خدا کے پھینکے ہوئے اجسام نہایت صحت کے ساتھ اپنے اپنے مدار پر قائم ہیں۔ اربوں سال کے اندر بھی ان کے توازن میں کوئی فرق نہیں آیا۔

میری میز سے دوسری میز کا فاصلہ بمشکل تین میٹر ہے۔ مگر میرے لئے یہ ممکن نہ ہوا کہ میں رجسٹر کو اس طرح پھینکوں کہ وہ صحیح پوزیشن کے ساتھ دوسری میز پر گرے۔ مگر خدا کی قدرت کس قدر عجیب ہے کہ وہ لاتعداد اجسام کو لامحدود خلا میں گردش دئے ہوئے ہے اور ہر ایک اپنی صحیح ترین پوزیشن پر قائم ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت پہلے ساری کائنات کا نظام درہم برہم ہو جاتا اور یہ نوبت ہی نہ آتی کہ زمین پر انسان وجود میں آئے اور اپنی تہذیب یہاں بناسکے۔

۲۶ جنوری ۱۹۸۴

سورہ ق آیت ۳۸ کی تشریح میں مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں کہ: "اس میں ضمناً یہود کے اس خیال پر بھی تعریض ہے جو تورات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دنوں میں آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا"۔ تدبر قرآن، جلد ششم، صفحہ ۵۶۶

یہی بات مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اپنی تفسیر میں ان الفاظ میں لکھی ہے: "اس آیت میں ضمناً ایک لطیف طنز یہود و نصاریٰ پر بھی ہے۔ جن کی بائبل میں یہ افسانہ گھڑا گیا ہے کہ خدا نے چھ دنوں میں زمین و آسمان کو بنایا اور ساتویں دن آرام کیا"۔

تفہیم القرآن، حصہ پنجم صفحہ ۱۲۵

موجودہ زمانہ میں ہمارے اکثر اہل قلم کا یہ حال ہے کہ وہ ایک بات لکھتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ کسی دوسرے پہلو سے ٹکرا رہی ہے۔ سائنٹفک عبارت وہ ہے جس میں ہر پہلو کی رعایت شامل ہو۔ مگر موجودہ زمانہ کے مصنفین کے یہاں اس قسم کی سائنٹفک عبارت مشکل ہی سے کہیں تلاش کی جاسکتی ہے۔

مذکورہ عبارت میں اس کے لکھنے والوں نے یہود کو دیکھا مگر وہ خدا کو نہ دیکھ سکے۔ چنانچہ ان جملوں میں جو الفاظ ہیں وہ مخاطب کے اعتبار سے صحیح ہوسکتے ہیں مگر وہ متکلم کے اعتبار سے صحیح نہیں۔

مذکورہ دونوں مفسرین اس موقع پر نہایت آسانی سے تصحیح یا تردید کا لفظ استعمال کرسکتے تھے جو خدا کے شایان شان ہوتا۔ اس کے بجائے انھوں نے طنز اور تعریض کا لفظ استعمال کیا جو یقینی طور پر خدا کی عظمت وشان کے مطابق نہیں۔

۲۷ جنوری ۱۹۸۴

ایک لطیفہ ہے۔ کسی مولوی صاحب نے وعظ بیان کیا۔ وعظ میں انھوں نے کہا کہ وضو نماز کے لئے شرط ہے۔ جو شخص وضو کے بغیر نماز پڑھے گا اس کی نماز نہیں ہوگی۔ ایک پٹھان صاحب کھڑے ہوئے اور کہا کہ آپ غلط کہتے ہیں کہ وضو کے بغیر نماز نہیں ہوگی۔ ہم نے تو بارہا وضو کے بغیر نماز پڑھی ہے اور ہماری نماز ہوگئی (بارہا کردیم وشد)

مولوی صاحب پٹھان کی بات سُن کر ہنس پڑے۔ ان کے نزدیک پٹھان کی بات بیوقوفی کی بات تھی۔ کیوں کہ جو نماز وضو کے بغیر پڑھی جائے وہ نماز نہیں، صرف اٹھ بیٹھ ہے۔ دوسری طرف پٹھان کو یقین تھا کہ اس کی نماز ہوگئی، کیونکہ اس کے نزدیک نماز کے ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اس نے تکبیر اولی سے لے کر سلام پھیرنے تک کسی نہ کسی طرح تمام ارکان کو دہرادیا۔

اس واقعہ میں بظاہر مولوی صاحب صحیح نظر آتے ہیں اور پٹھان غلط۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں بہت زیادہ فرق نہیں۔ دونوں ہی کچھ ظاہری چیزوں کے دہرا لینے کو نماز سمجھتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ پٹھان نے اس دہرانے کی فہرست میں وضو کو شامل نہیں کیا ہے اور مولوی صاحب نے وضو کو بھی شامل کر لیا ہے۔

حالاں کہ نماز کا ہونا یہ ہے کہ اس کے اندر خشوع کی کیفیت پائی جائے۔ کیوں کہ خدا کی نظر میں وہی نماز نماز ہوتی ہے جس میں خشوع موجود ہو۔ نماز وہ ہے جو خدا کے یہاں قبول ہو جائے، نہ کہ وہ جس کو ہم بطور خود یہ سمجھ لیں کہ نماز ہوگئی۔

۲۸ جنوری ۱۹۸۴

تین خلائی ہیرو (space heroes) راکیش شرما، یوری مالی شیو، گناڈی اسٹریکالوف۔ اپریل ۱۹۸۴ کو اپنے آٹھ روزہ خلائی سفر سے زمین پر اترے تو وہ خلا میں پانچ ملین کیلو میٹر کا سفر طے کر چکے تھے۔ مگر جب ان کو خلائی مشین سے باہر نکال کر دوبارہ زمین پر لایا گیا تو وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے سے معذور تھے۔ اس دن ٹیلیوژن پر خلائی پروگرام کو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ مسٹر شرما زمین پر ایک مفلوج کی طرح پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے چہرہ پر سخت شرمندگی کے آثار ہیں اور لوگ ان کا بازو پکڑ کر ان کو کرسی پر بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ ان کا بے وزنی (weightlessness) کی حالت میں آٹھ دن رہنا تھا۔ مسٹر شرما اور ان کے روسی ساتھی جب زمین سے تین سو کلو میٹر اوپر خلا میں اڑان کر رہے تھے تو ان کا جسم بالکل بے وزن ہو چکا تھا۔ وہ خلائی گاڑی (Soyuz) کے اندر اسی طرح تیرتے تھے جس طرح مچھلی پانی میں تیرتی ہے۔ مسٹر شرما نے ایک خلائی انٹرویو کے درمیان کہا تھا کہ: اس وقت میں اپنے ٹوتھ پیسٹ اور برش کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہوں جو میرے ہاتھ سے چھوٹ کر چھت پر جا لگے ہیں۔

۲۹ جنوری ۱۹۸۴

قرآن نے علم کی دو قسمیں مانی ہیں۔ ایک تنزیلی، دوسرا عقلی۔ پہلا وہ ہے جو خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ بھیجا ہے۔ اور دوسرا وہ جو انسان نے اپنے تجربہ سے جانا ہو اور نسل در نسل تحقیقات کے بعد وہ لوگوں کے درمیان تسلیم شدہ بن جائے:

ائتونی بکتاب من قبل ھذا او اثارۃ من علم ان کنتم صادقین (الاحقاف ۴) کہو کہ میرے پاس قرآن سے پہلے کی کوئی الہامی کتاب لاؤ یا کوئی علم جو چلا آتا ہو۔

آیت میں اثارۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے لفظی معنی بقیہ (mnant کے ہیں۔ اردو میں اس کا صحیح مفہوم ہوگا "یا کوئی اور علم جو تمہارے درمیان چلا آتا ہو"۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایسا علم جس کو ایک کے بعد دوسرے اہل علم کی تحقیق رد نہ کرے، بلکہ وہ ان کے نزدیک مسلم چلا آرہا ہو۔ بالفاظ دیگر مصدقہ علم۔ مفسر ابن کثیر نے اس سلسلہ میں مختلف علماء کے اقوال نقل کئے ہیں اور لکھا ہے کہ یہاں کتاب سے مراد دلیل نقلی ہے اور اثارۃ سے مراد دلیل عقلی (ای لا دلیل لکم لا نقلیا ولا عقلیا علی ذالک) آجکل کی زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اول الذکر سے مراد الہامی علم (revealed knowledge) ہے اور دوسرے سے مراد سائنسی علم (Scientific knowledge)

۳۰ جنوری ۱۹۸۴

قال علیہ الصلاۃ والسلام:

من أراد الأخرۃ فعلیہ بالعلم، ومن اراد الدنیا فعلیہ بالعلم ومن ارادھما معاً فعلیہ بالعلم (العربی، کویت، دسمبر ۱۹۸۰، صفحہ ۱۰۵)

جو شخص آخرت چاہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ علم سیکھے۔ اور جو شخص دنیا چاہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ علم سیکھے۔ اور جو شخص دنیا و آخرت دونوں کو چاہے تو اس کے لئے بھی لازم ہے علم۔

علم کی ضرورت ہر شخص کو ہے، خواہ وہ دنیا کا طالب ہو یا آخرت کا۔ علم کے بغیر نہ صحیح طور پر دنیا مل سکتی ہے اور نہ صحیح طور پر آخرت۔

۳۱ جنوری ۱۹۸۴

ایک ایسے شہر کا تصور کیجئے جہاں کوئی مسجد نہ ہو اور بہت سے لوگ مسجد بنانے کے لئے اٹھیں۔ مگر ہر آدمی گنبد کھڑا کرنے سے اپنی مسجد کی تعمیر کا آغاز کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شہر میں ہزاروں آدمیوں کی کوششوں کے باوجود کبھی کوئی مسجد نہ بن سکے گی۔ مسجد بننے کے لئے بہت سی اینٹوں کو اس پر راضی ہونا پڑتا ہے کہ وہ بنیادوں میں دفن ہو جائیں۔ بہت سی اینٹوں کو چھت کا بوجھ سنبھالنے کے لئے نیچے کی دیوار میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ ان مراحل سے گزرنے کے بعد چھت بنتی ہے اور اس کے بعد یہ نوبت آتی ہے کہ اس کے اوپر وہ گنبد کھڑا ہو جو دیکھنے والوں کو دور سے نظر آئے۔ گنبد آخری مرحلہ کا کام ہے اور جب تک ابتدائی مرحلہ کا کام انجام نہ پائے آخری مرحلہ

کا کام کیسے انجام دیا جا سکتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کے احیاء کے لئے بے شمار شخصیتیں اور تحریکیں اٹھیں۔ مگر سب کی سب طوفان خیز کوششوں کے باوجود بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے "گنبد" سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ کوئی بھی "بنیاد" سے اپنا سفر شروع کرنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ ایسی حالت میں ان کی کوششیں نتیجہ خیز ہوتیں تو کیوں کر ہوتیں۔

یکم فروری ۱۹۸۴

ہر زبان کا اپنا اسلوب ہوتا ہے۔ اس اسلوب کو اہل زبان تو فوراً سمجھ لیتے ہیں۔ مگر غیر اہل زبان کو اس قابل بننے کے لئے بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے کہ وہ اسلوب کے فرق کو سمجھ سکیں۔ مثلاً "خیالات کہاں سے آتے ہیں" اس کو انگریزی زبان میں کہنے کی ایک صورت یہ ہے کہ یوں کہا جائے:

From where come ideas.

ایک شخص جو معمولی انگریزی جانتا ہو وہ اس جملہ کو سنے گا تو وہ یہی سمجھے گا کہ یہ انگریزی ہے۔ مگر جو شخص اسلوب کی نزاکتوں سے واقف ہے وہ پہلی ہی نظر میں اس کو رد کر دے گا کیونکہ یہ وہ انگریزی نہیں جو اہل زبان بولتے ہیں۔ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے صحیح انگریزی جملہ یہ ہے:

Where do ideas come from.

یہی معاملہ ہر زبان کا ہے، خواہ وہ انگریزی زبان ہو یا اور کوئی زبان —— غیر اہل زبان کی کتاب اہل زبان کے درمیان مقبول نہ ہونے کا خاص راز یہی ہے۔

۲ فروری ۱۹۸۴

مدینہ کے ابتدائی ایام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ نماز کے پکارنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس وقت کسی نے ناقوس کی تجویز پیش کی، کسی نے گھنٹہ کی، وغیرہ۔ مگر آپ نے اس طرح کی تجویزوں کو پسند نہیں فرمایا۔ اذان اگرچہ نماز کے لئے بلانے کی ایک تدبیر ہے۔ مگر اسلام کی روح یہ ہے کہ تدبیر عمل میں بھی اصل عمل کی شان پائی جائے۔

آخر میں حضرت عبد اللہ بن زید بن ثعلبہ نے خواب میں نماز کے الفاظ دیکھے اور آ کر آپ کو اپنا یہ خواب بیان کیا۔ آپ نے فرمایا: انہا لرؤیا حق انشاء اللہ (انشاء اللہ یہ سچا خواب ہے)، پھر آپ نے ان سے کہا کہ تم بلال کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ ان کو اذان کے الفاظ بتاتے جاؤ اور وہ پکارتے جائیں۔ کیوں کہ وہ تم سے زیادہ بلند آواز ہیں (فانہ اندیٰ صوتا منك، الرسول فی المدینہ، صفحہ ۴۱)

حضرت عبد اللہ بھی صحابی تھے اور حضرت بلال بھی صحابی تھے۔ مگر اذان پکارنے کے لئے آپ نے حضرت بلال کا انتخاب فرمایا۔ اگرچہ ان کا حال یہ تھا کہ وہ شین کی آواز نکال نہیں پاتے تھے اور اشہد کو اسہد کہتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو کام پیش نظر ہو اسی کے لحاظ سے آدمی کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اذان میں اصل اہمیت بلند آوازی کی ہے۔ اس لئے آپ نے حضرت بلال کا انتخاب فرمایا جو بلند آواز تھے، اگرچہ انھوں نے اذان کا خواب نہیں دیکھا تھا، اگرچہ بعض اعتبار سے ان میں کمی پائی جاتی تھی۔

۳ فروری ۱۹۸۴

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوئی تو آپ کا یہ حال ہوا کہ تنہائی آپ کو محبوب ہو گئی اور آپ غار حراء میں خلوت اختیار کرنے لگے (حُبِّبَ علیہ الخلاء فکان یخلو بغار حراء، بخاری)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ غار حراء میں کیا کرتے تھے۔ اگر آپ عبادت کرتے تھے تو وہ کس قسم کی عبادت ہوتی تھی۔ محدثین کا کہنا ہے کہ آپ کسی سابق امت میں سے نہ تھے۔ اور نہ کسی پچھلے نبی کے پیرو تھے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ فلاں پیغمبر (مثلاً حضرت موسیٰ یا عیسیٰ) کے طریقہ پر عبادت کرتے تھے۔ حضرت جبریئل ابھی تک آپ کے پاس آئے نہیں تھے کہ وہ اسلام کا طریق عبادت آپ کو بتائیں۔

پھر یہ عبادت کیسی تھی۔ اس کا جواب حدیث کی شرح کرنے والوں نے یہ دیا ہے کہ غار حراء میں آپ کی عبادت کا طریقہ یہ تھا کہ آپ وہاں غور و فکر کرتے تھے اور عبرت حاصل کرتے تھے (کان صفۃ تعبّدہ فی غار حراءَ التفکرُ والاعتبار)

۴ فروری ۱۹۸۴

زندہ قوم زندہ لوگوں کی قدر کرتی ہے اور مردہ قوم مردہ لوگوں کی۔ اس کی ایک مثال موجودہ زمانہ کے مسلمان ہیں۔

مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ زندہ لوگوں کو نظرانداز کرتے ہیں اور مردہ لوگوں کو پوجتے ہیں۔ ان کے نزدیک ساری اہمیت صرف ان لوگوں کی ہے جو مرچکے ہیں۔ جو لوگ ان کے سامنے زندہ موجود ہیں ان کی کوئی اہمیت ان کے نزدیک نہیں۔

یہاں ایک شخص کہے گا کہ آج ایسے بھی مسلمان ہیں جو زندہ ہیں۔ اس کے باوجود انھیں قوم کے اندر عزت اور مقبولیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ یہ زندہ لوگ وہ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو کسی مردہ شخصیت سے جوڑ رکھا ہے۔ وہ مردہ اسلاف کے نام پر کھڑے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جنھیں سلسلۂ اسلاف کی کوئی گدی اتفاقاً مل گئی ہے اور کچھ وہ ہیں جو اسلاف کی قصیدہ خوانی کرکے اپنے آپ کو ان کے سلسلے سے ملائے ہوئے ہیں۔

اسلاف پرستی کا یہ مزاج بےعملی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ لوگ جب کئے بغیر پانا چاہیں تو وہ اپنے اسلاف کی مبالغہ آمیز شخصیتوں سے ایسا رشتہ جوڑ لیتے ہیں۔ وہ ان کی فرضی تصویر سے اپنے لئے فخر کی غذا لیتے ہیں۔ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کی برکت سے سب کچھ ہو جائے گا۔

باعمل لوگ زندوں کی قدر کرتے ہیں اور مردہ لوگوں کو اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ وہ مردہ اسلاف کی فرضی کہانیوں میں جیتے رہیں اور خود کچھ بھی نہ کریں۔

۵ فروری ۱۹۸۴

نقل کیا ہے۔ ابن قیم نے مختصر لفظوں میں اس کی نہایت عمدہ تعریف کی ہے۔ انھوں نے کہا:

هو معرفة الحق بدليله

وہ حق کو اس کی دلیل کے ساتھ معلوم کرنا ہے۔

یہاں "حق" سے مراد اساسی حقیقتیں ہیں۔ مگر بعد کو لوگوں نے فروعی مسائل میں افضل اور غیر افضل اور راجح اور مرجوح کی تلاش غیر ضروری طور پر شروع کر دی اور اس کو حق کا مسئلہ سمجھ کر اس کو

فقہ قرار دیا۔ یہ ذہن اتنا بڑھا کہ جزئی اور فروعی مسائل کے بحث مباحثہ کو فقہ سمجھا جانے لگا۔

شریعت میں فقہ سے مراد حق کی معرفت ہے اور حق سے مراد اساسی چیزیں ہیں نہ کہ فروعی چیزیں۔ اساسی چیزیں ہمیشہ ایک ہوتی ہیں اور فروعی چیزوں میں ہمیشہ تنوع ہوتا ہے۔ اس لئے فروعی چیزوں کو ایک بنانے کی کوشش ہمیشہ اختلاف پیدا کرتی ہے۔ یہ ایسی چیزوں میں یکسانیت تلاش کرنا ہے جس میں یکسانیت ممکن نہیں۔

فقہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے حکمت اسلام کا نام تھی مگر اس کو ظاہری تفصیلات کے ہم معنی بنادیا گیا۔

۶ فروری ۱۹۸۴

صلح حدیبیہ ۶ھ میں ہوئی۔ اس کی دفعات بظاہر یک طرفہ طور پر فریق ثانی کے حق میں تھیں۔ چنانچہ حضرت عمر نے کہا کہ یہ اہانت آمیز صلح کیوں۔ مگر قرآن نے اس کو کھلی فتح (فتح مبین) قرار دیا۔

اس کی ایک وجہ وہ تھی جو شمس الائمہ سرخسی نے اپنی کتاب المبسوط اور شرح السیر الکبیر میں لکھی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس کے ذریعہ قریش پابند ہوگئے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کسی کی حمایت نہ کریں گے۔ صلح حدیبیہ کے فوراً بعد آپ نے خیبر کی طرف اقدام کیا اور قریش اپنے معاہدہ کی بنا پر غیر جانب دار اور ناطرفدار رہے۔ اس طرح یہ مہم بآسانی کامیاب ہوگئی۔

دوسرا اس سے زیادہ بڑا فائدہ دعوتی تھا۔ جنگ کے حالات ختم ہونے کے بعد دعوت کا کام بہت بڑھ گیا۔ اسی میں یہ تھا کہ آپ نے صلح حدیبیہ کے بعد ہمسایہ بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد حکمرانوں کو اپنی دعوت کا مخاطب بنایا۔ آپ نے جن حکمرانوں کو دعوتی خطوط روانہ کئے ان میں رومی حکمراں ہرقل، ایرانی حکمراں کسریٰ پرویز اور حبشی حکمراں اصحمہ نجاشی تھا۔ اس طرح آپ کی دعوت بیک وقت تینوں آباد براعظم (یورپ، ایشیا، افریقہ) میں پہنچ گئی۔ صلح حدیبیہ بظاہر میدان سے واپسی کے ہم معنی تھی۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زیادہ وسیع دائرہ میں عمل کے مواقع کھل گئے۔

۷ فروری ۱۹۸۴

ہندستان میں مختلف مذاہب اور مختلف فرقے آباد ہیں۔ ان کے عقائد اور کلچر جدا جدا ہیں ان کے درمیان مسلسل کش مکش جاری رہتی ہے۔ اس کا حل کیا ہو۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کے حل کے لئے ایک ترکیب وضع کی جو ان کے الفاظ میں یہ تھی:

"اقوام مختلفہ کی متحدہ جمہوریہ"

اسی طرح اس کے حل کے لئے مدنی فارمولا اور آزاد فارمولا پیش کیا گیا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ریاستوں میں حسب آبادی سیٹوں کا تناسب قائم کیا جائے اور مرکز میں ہندو اور مسلم ممبران کی تعداد برابر برابر ہو۔ اقبال نے الٰہ آباد کے خطبہ میں تقسیم کا نظریہ پیش کیا۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام حل محض بے معنی الفاظ کے مجموعے تھے، جیسا کہ فی الواقع وہ ثابت ہوئے۔ ہندستان میں مسلمانوں کے کرنے کا کام صرف ایک تھا اور وہ دعوت ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے تھا کہ وہ توحید خالص کی دعوت لے کر اٹھیں اور اس کے تمام ضروری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اسے جاری رکھیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے اکابر امت میں سے کوئی ایک شخص بھی نہیں جس نے مسلمانوں کے سامنے یہ پیغام رکھا ہو۔

۸ فروری ۱۹۸۴

"مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں مشرکین نے مسلمانوں پر دردناک مظالم کئے۔ یہاں تک کہ مسلمان اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ چلے گئے۔ مدینہ پہنچ کر ابتداءً مکہ پر حملہ کا منصوبہ نہیں بنایا گیا۔ اگرچہ "ہجرت کے پہلے سال ابواء، بواط، عشیرہ وغیرہ چھوٹے چھوٹے غزوات وسرایا وقوع پذیر ہوئے۔ ان کا مقصد مشرکین مکہ کے تجارتی سلسلوں کو جو شام ویمن وغیرہ سے قائم تھے، شکست دیکر ظالموں کی اقتصادی حالت کمزور اور مسلمانوں کی مالی پوزیشن مضبوط کرنا تھا"

یہ بتاتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانی اپنی تفسیر قرآن میں لکھتے ہیں: "مکہ کا ادب مانع تھا کہ مسلمان ابتداءً وہاں چڑھ کر جائیں۔ اس لئے ہجرت کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک یہ لائحہ عمل رہا" صفحہ ۲۲۸

مکہ کی طرف چڑھائی کرنے سے اگر مکہ کا ادب مانع تھا تو فتح مکہ کے موقع پر کیوں مکہ پر چڑھائی کی گئی۔

جب بھی کوئی غیر واقعی تشریح کی جائے گی تو وہ دوسرے معلوم حقائق سے ٹکرا جائے گی۔

دوسری بات یہ کہ اس طرح کی تشریح سے غلط ذہن بنتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "تیرہ سال" تک جو صبر کیا وہ سب ایک خاص شہر کے "ادب" کے خانہ میں چلا گیا۔ اس سے بعد کے مسلمانوں کو طریق عمل کی بابت کوئی رہ نمائی نہیں ملی۔

اس طرح کی باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ ہر حال میں بس لڑ جانے کو سب سے بڑا کام سمجھیں گے۔ اور رسول اللہ جو ایک عرصہ تک مکہ والوں سے نہیں لڑے اس کو وہ "ادب" کے خانہ میں ڈال دیں گے۔ اور اپنے لئے اس سے کوئی نصیحت نہ لے سکیں گے۔

۹ فروری ۱۹۸۴

قرآن میں ہے کہ: الیوم احل لکم الطیبات وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم (المائدۃ ۵)

یعنی آج تمام پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے حلال کر دی گئیں اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے۔

اس آیت سے کچھ لوگوں نے یہ نکال لیا کہ اس میں کہا گیا ہے کہ یہودی اور عیسائی لوگوں کا "طعام" تمہارے لئے حلال ہے۔ اب چونکہ یہودی اور عیسائی خنزیر کھاتے ہیں۔ خنزیر ان کا طعام ہے۔ اس لئے یہ مسلمانوں کے لئے بھی حلال ہوا۔

یہ استدلال بالکل جاہلانہ ہے۔ یہاں طعام سے مراد محض طعام نہیں بلکہ اس سے مراد ذبیحہ ہے یہاں طریق طعام کا ذکر ہے نہ کہ جنس طعام کا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی یہودی یا عیسائی اگر ایک حلال جانور کو اپنے مذہبی طریقہ پر ذبح کرے تو اس کا کھانا مسلمانوں کے لئے جائز ہے۔

تاہم جو شخص اسلام سے مرتد ہو کر یہودی یا عیسائی بن جائے تو اس کے احکام الگ ہیں۔ کیوں کہ مرتد ہو کر یہودی یا عیسائی بننے والوں کا ذبیحہ از روئے فقہ جائز نہیں۔

۱۰ فروری ۱۹۸۴

السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا (بمبئی) انگریزی کا مشہور ہفت روزہ ہے۔ وہ ۱۸۸۰ میں جاری ہوا۔ اس کی ۱۰ جون ۱۹۷۹ کی اشاعت کرکٹ نمبر تھی جس کا عنوان تھا "ورلڈ کپ کرکٹ اسپیشل"

یہ اشاعت ۵۰۰۰ ۴۰ کی تعداد میں چھپی۔ یہ تعداد اس کی پچھلے سو برس کی تمام اشاعتوں میں سب سے زیادہ ہے ـــــ آج کی دنیا میں لوگ کھیل تماشے کی باتوں کے سب سے زیادہ خریدار ہوتے ہیں۔ سنجیدہ باتوں سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ آدمی سطحی چیزوں میں اتنا زیادہ کھویا ہوا ہے کہ گہری باتوں میں دھیان دینے کا اسے خیال بھی نہیں آتا۔

۱۱ فروری ۱۹۸۴

میں جس زمانہ میں مدرسۃ الاصلاح میں پڑھتا تھا۔ اس زمانہ کا ایک لطیفہ ہے۔ ہم لوگ مولانا امین احسن اصلاحی کے کلاس میں تھے۔ وہ ہم لوگوں کو قرآن اور ادب پڑھاتے تھے۔

ایک روز درس کے دوران کوئی عربی لفظ آیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے لوگوں سے اس کا مطلب دریافت کیا۔ ایک بہاری طالب علم جس کا نام غالباً مطیع الرحمٰن تھا، وہ بول پڑے اور انھوں نے کہا:

" باڑیک "

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اس کو سن کر کہا " آپ نے تو اس کو اور موٹا کر دیا"

بہاری لوگ اکثر ر کو ڑ اور ڑ کو ر بولتے ہیں۔

۱۲ فروری ۱۹۸۴

" کلمہ گو کے لئے جنت ہے" یہ مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ بن گیا ہے۔ مجھے یہ بات قرآن وحدیث کی تعلیمات کے مطابق نظر نہیں آتی تھی۔ اگر چہ میں تسلیم کرتا تھا کہ دین میں اصل اہمیت ایمان کی ہے۔ سب کچھ ایمان پر منحصر ہے۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ "کلمہ گو کے لئے جنت ہے" کا عقیدہ کیوں کر صحیح ہے۔

اچانک ذہن میں یہ بات آئی کہ اس جملہ میں ایک صحیح بات کو غلط شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ـــــ " جنت صاحب ایمان کے لئے ہے"

دوسرے لفظوں میں یہ کہ جنت صاحب کلمہ کے لئے ہے نہ کہ محض کلمہ گو کے لئے۔ صاحب کلمہ یا صاحب ایمان وہ ہے جو کلمہ اور ایمان کی حقیقت کو اپنے اندر اتارے ہوئے ہو۔

کلمہ کا زبان سے تلفظ کرنا دوسری چیز ہے اور کلمہ کی حقیقت کا دل میں اترنا دوسری چیز ہے۔

اسی فرق کو میں ان لفظوں میں ادا کر رہا ہوں کہ ـــــ جنت صاحب کلمہ کے لئے ہے نہ کہ محض کلمہ گو

کے لئے۔

۱۳ فروری ۱۹۸۴

جب بھی اسلام کی بات کی جائے تو سننے والے کہتے ہیں کہ : موجودہ زمانہ کے مسلمان کہاں اس اسلام پر ہیں۔

یہ ایک غلط فہمی ہے "مسلمان" سے مراد کوئی نسلی گروہ نہیں ہے بلکہ وہ افراد ہیں جو ذہنی انقلاب کے ذریعہ مسلمان بنے ہوں۔ اسلام آدمی کے شعور میں ایک انقلاب لاتا ہے۔ جن لوگوں کے اندر یہ شعوری انقلاب آئے وہی دراصل وہ لوگ ہیں جن کو مومن اور مسلم کہا گیا ہے۔

جب بھی اسلام سے پیدا ہونے والے اخلاق وکردار کی بات کی جاتی ہے تو اس سے مراد وہ اہل اسلام ہوتے ہیں جو ذہنی انقلاب کے ذریعہ مسلمان بنے ہوں۔ محض اتفاقی پیدائش سے مسلمان بن جانے والوں کو اس معاملہ میں معیار نہیں بنایا جاسکتا۔

۱۴ فروری ۱۹۸۴

مسلمانوں کے جتنے قائد اور مفکر ہیں سب جہاد اور انقلاب کی باتیں کرتے ہیں۔ ہر ایک عالمی اور آفاقی الفاظ میں کلام کرتا ہے۔ ان میں کوئی نظر نہیں آتا جو احتساب خویش اور فکر آخرت کی باتیں کرے۔

اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل دینی سرمایہ جھوٹا فخر ہے۔ جھوٹے فخر نے ہر ایک کو کبر کی نفسیات میں مبتلا کر رکھا ہے۔ مذکورہ صورت حال کی وجہ غالباً یہی ہے۔

فخر اور کبر کی نفسیات رکھنے والے آدمی کو تواضع والا اسلام اپیل نہیں کرے گا۔ اس کو صرف انقلابی اسلام ہی اپیل کرسکتا ہے۔ ایسے لوگوں کو "احتساب کائنات" کی بات بڑی بات معلوم ہوگی۔ اس کے برعکس جو شخص احتساب خویش کی بات کرے وہ انھیں حقیر دکھائی دے گا۔ خواہ احتساب کائنات کی بات باعتبار حقیقت کتنی ہی بے معنی کیوں نہ ہو۔

۱۵ فروری ۱۹۸۴

قرآن کو پڑھئے تو اس میں سب سے زیادہ ذکر پیغمبروں کا ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں بار بار خدا کے رسول آئے۔ انھوں نے لوگوں کو توحید کا پیغام دیا۔ چند لوگوں نے مانا اور بیشتر

لوگوں نے نہیں مانا۔ پھر ماننے والوں کو بچا کر بقیہ تمام لوگ ہلاک کر دئے گئے۔

قرآن تاریخ کے اس پہلو کو اتنی کثرت سے بیان کرتا ہے گویا اس کے نزدیک سب سے زیادہ قابل تذکرہ تاریخی بات یہی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ تاریخ انسانی کا یہ پہلو انسانوں کی مدون کی ہوئی تاریخ میں سرے سے مذکور ہی نہیں۔ انسانوں کی لکھی ہوئی تاریخ کسی ایسے واقعہ کے ذکر سے بالکل خالی ہے۔ جو بات قرآن کے نزدیک سب سے زیادہ قابل ذکر تھی وہی تاریخ میں درج ہونے سے رہ گئی۔

ہماں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جاست

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا نے انسان کو موجودہ دنیا میں کس قدر زیادہ آزادی دی ہے۔ انسان کو یہ آزادی اگرچہ امتحان کے مقصد سے دی گئی ہے۔ مگر وہ اتنی مکمل ہے کہ انسان خواہ جو بھی کرے اس کو کوئی روکنے والا نہیں۔

اس سے دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ بے آمیز حق کی دعوت شیطان کو انتہائی حد تک ناپسند ہے۔ وہ اس کو مٹانے کے لئے ساری قوت لگا دیتا ہے۔ چنانچہ وہ پچھلے دور کی تمام تاریخوں کو مٹاتا رہا۔ پیغمبر آخر الزماں کی تاریخ کو وہ نہ مٹا سکا کیوں کہ آپ کے ساتھ خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ کی نصرتِ حفاظت شامل تھی۔

۱۶ فروری ۱۹۸۴

ہندستان میں آزادی کے بعد تقریباً دس ہزار فسادات ہو چکے ہیں۔ یہ فسادات زیادہ تر اس طرح ہوتے ہیں کہ مسلمان کسی چھوٹے سے واقعہ پر مشتعل ہو جاتے ہیں اور پھر ملک کے حالات کی بنا پر بہت جلد وہ مسئلہ ہندو مسلم مسئلہ بن جاتا ہے۔ دونوں کے درمیان ٹکراؤ ہوتا ہے جس میں ہمیشہ صرف مسلمان مارے جاتے ہیں۔ میں شاید ملک میں تنہا ایک شخص ہوں جو مسلمانوں کو صبر کی تلقین کرتا ہے۔ اور اس قسم کے بے فائدہ ٹکراؤ سے روکتا ہے۔

مسلمانوں میں جتنے بھی قلم اور زبانیں ہیں سب کے سب متفقہ طور پر مقابلہ اور ٹکراؤ کی باتیں کرتے ہیں۔ اور اس کو جہاد قرار دیتے ہیں۔ مگر فسادات کی پوری تاریخ بتاتی ہے کہ اس میں مرنے والے ہمیشہ صرف عام مسلمان ہوتے ہیں۔ ہمارے لیڈر اور ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ کبھی ان فسادات میں

مارا نہیں جاتا۔ وہ لوگ جو اپنی زبان وقلم سے لوگوں کو "جہاد" پر ابھارتے ہیں وہ خود ہمیشہ جہاد کے میدان سے دور رہتے ہیں۔ شہادت کے فضائل پر تقریر کرنے والے خود کبھی لڑ کر شہید نہیں ہوتے۔

ہمارے قائدین صرف دوسروں کو للکارنے کے لئے بہادر ہیں، وہ خود لڑنے کے لئے بہادر نہیں۔

۱۷ فروری ۱۹۸۴

کسی مفکر کا قول ہے کہ سزا کی شدت نہیں بلکہ سزا کی ناگزیریت وہ چیز ہے جو آدمی کو جرائم سے روکتی ہے:

It is not the severity of punishment that acts as a deterrent.
It is its inevitability.

دنیا کا کوئی بھی نظام ایسا نہیں جس کی سزا میں ناگزیریت ہو۔ جس کے بارہ میں آدمی کو یقین ہو کہ اس کو ضرور بھگتنا پڑے گا، اس سے بچ کر نکلنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے نظام اگرچہ ہر جرم کی سزا مقرر کئے ہوئے ہیں۔ مگر یہ سزائیں جرائم کا روک ثابت نہ ہو سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ صرف ایک ہی نظام ہے جس کی سزا میں ناگزیریت ہے اور وہ خدائی نظام ہے۔ جس آدمی کو خدا کی پکڑ اور اس کی سزا کا واقعی شعور حاصل ہو جائے، وہ لازماً پرہیزگار بن جائے گا۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوگا کہ جرم کرنے کے بعد خدا کی سزا سے اپنے آپ کو بچانا کسی بھی طرح ممکن نہیں۔

۱۸ فروری ۱۹۸۴

ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ لوگوں کا قائد بننا ہو تو لوگوں کے پیچھے چلو:

To lead the people, walk behind them.

یہ سستی اور سطحی قیادت کی نہایت صحیح تعبیر ہے۔ لوگوں کے درمیان قائد بننے کا سب سے آسان نسخہ یہ ہے کہ آدمی وہ بات کہنے لگے جو لوگوں کو پسند ہے۔

موجودہ زمانہ کے تمام بڑے بڑے لیڈروں کا کیس یہی ہے۔ انھوں نے عوام کی خواہشات کا ساتھ دیا۔ انھوں نے عوامی رجحانات کی ترجمانی کی۔ اس کی انھیں یہ قیمت ملی کہ عوام کی بھیڑ ان کے گرد جمع ہو گئی۔ اگر وہ عوام کی خواہشات کے خلاف کوئی پروگرام لے کر اٹھتے تو انھیں ہرگز یہ مقبولیت

حاصل نہ ہوتی۔

۱۹ فروری ۱۹۸۴

فزیکل سائنس کے قوانین میں سے ایک قانون یہ ہے کہ ہر عمل کا ایک لازمی ردعمل ہے جو اسی کے برابر اور عین اس کی مخالف سمت میں ہوتا ہے:

To every action there is an equal and opposite reaction.

یہی اصول انسانی زندگی میں بھی کارفرما ہے۔ ہمارا ہر عمل سماجی زندگی میں ایک ردعمل پیدا کرتا ہے۔ عقلمند وہ ہے جو اپنے عمل کے ردعمل کو جانے اور بے وقوف وہ ہے جو اپنے عمل کے ردعمل سے بےخبر ہے۔ اپنے عمل کے ردعمل کو جاننے والا اپنے رویہ پر نظرثانی کرے گا، وہ اپنی کمیوں کو جان کر زیادہ صحیح منصوبہ بندی کرکے آگے بڑھ جائے گا۔ مگر جو شخص اپنے عمل کے ردعمل کو نہ جانے وہ صرف دوسروں کی شکایت کرے گا۔ وہ کبھی اپنے عمل کو نتیجہ خیز نہیں بنا سکتا۔

۲۰ فروری ۱۹۸۴

انگریزی کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے:

Outline of Modern Belief.

یہ کتاب موجودہ صدی کے آغاز میں چھپی تھی۔ اس کی پہلی جلد میں صفحہ ۱۸ پر انسان کی قدیم ارتقائی شکلوں کی وضاحت کرتے ہوئے ایک تصویر ہے۔ اس تصویر میں پلٹ ڈاؤن مین (Piltdown man) کی دریافت کو دکھایا گیا ہے۔ اس نظریہ سے متعلق دو اہم شخصیتیں سکس (Sussex) کے متعلقہ علاقہ میں مزید ٹکڑے کی تلاش کر رہی ہیں جن سے پلٹ ڈاؤن مین کے ٹکڑوں کو جوڑ کر مکمل کیا جا سکے۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا ہے:

The Piltdown Discovery.

اس کے بعد تصویر کے نیچے یہ عبارت درج ہے:

Scene of the world famous discovery of the Piltdown Man of Sussex. The photograph shows Dr. A. Smith Woodward and Dr Charles Dawson screening and washing Piltdown gravel in search of more fragments of the skull and teeth. At the right a workman stands on the exact spot of the original discovery (p. 18).

یہ پلیٹ ڈاؤن مین جس کو حقیقت سمجھ کر کتابوں میں درج کر دیا گیا تھا بعد کو محض فریب (Forgery) ثابت ہوا۔

۲۱ فروری ۱۹۸۴

۱۹۴۷ کا واقعہ ہے۔ ہندستان کے انگریز وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن ملک کی آزادی کے بارے میں ایک اہم اعلان کرنے والے تھے۔ بڑے بڑے سیاسی لیڈر برلا ہاؤس میں جمع تھے تاکہ وائسرائے کی تقریر سن سکیں جو رات کو دس بجے ریڈیو پر ہونے والی تھی۔ مشہور صنعت کار مسٹر برلا بھی وہاں موجود تھے۔ وہ اپنے اوقات کے بے حد پابند تھے۔ ان کی زندگی میں ہر چیز کا ایک وقت مقرر تھا۔ رات کو وہ ہمیشہ آٹھ بجے سو جایا کرتے تھے۔ چنانچہ جب آٹھ بجے کا وقت ہوا تو مسٹر برلا لیڈروں کی مجلس سے اٹھ گئے اور یہ کہہ کر اپنے سونے کے کمرہ میں چلے گئے:

وائسرائے کی تقریر میں کل صبح کے اخبار میں پڑھ لوں گا۔"

زندگی میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی حقیقی اہمیت ہوتی ہے۔ اور کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی اہمیت اضافی ہوتی ہے۔ آدمی اکثر اوقات دونوں کے فرق کو نہیں سمجھتا اور اضافی چیز کو وہ اہمیت دینے لگتا ہے جو صرف حقیقی چیز کو دینا چاہئے۔

وائسرائے کی تقریر رات کو سننا صرف تسکین شوق کا مسئلہ تھا۔ ورنہ جہاں تک ضرورت کا سوال تھا، اس کو صبح کے اخبار میں پڑھنا بھی ویسا ہی تھا جیسا چند گھنٹہ پہلے رات کو سننا۔

۲۲ فروری ۱۹۸۴

۱۹۱۰ میں دارالعلوم دیوبند کا ایک جلسہ دیوبند میں ہوا۔ اس جلسہ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (سابق وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) بھی شریک ہوئے تھے۔ اس وقت باہمی مشورہ سے یہ بات طے ہوئی تھی کہ دیوبند کے کچھ ہونہار طلبہ ہر سال جدید تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیجے جائیں۔ اسی طرح علی گڑھ کے کچھ منتخب طلبہ دینی تعلیم کے لئے دیوبند بھیجے جائیں۔ مگر اس تجویز پر کبھی عمل نہ ہو سکا۔

موجودہ زمانہ میں بار بار ایسا ہوا ہے کہ مسلم رہنماؤں نے ایک اچھی تجویز منظور کی مگر اس تجویز کو واقعہ بنانے کے لئے کچھ نہیں کیا جا سکا۔ اس کے برعکس اسی مسلم قوم میں یہ منظر بار بار دکھائی دیتا ہے کہ

مسلم رہنما کسی جذباتی اشو پر کوئی بات طے کرتے ہیں اور پھر خود بھی اس پر چل پڑتے ہیں اور ان کے ساتھ بے شمار عوام بھی۔

اس کا راز یہ ہے کہ جذباتی اشو پر دوڑنا سب سے آسان کام ہے اور تعمیری مہم کو لے کر چلنا سب سے مشکل کام۔ یہی وجہ ہے کہ تعمیری مہم کے حصہ میں صرف لوگوں کے الفاظ آتے ہیں اور جذباتی مہم کے حصہ میں لوگوں کا عمل۔

۲۳ فروری ۱۹۸۴

انسان دولت پاکر سمجھتا ہے کہ اس نے وہ سب کچھ پا لیا جو اسے پانا چاہئے تھا۔ مگر بہت جلد موت آکر اس کے اس خیال کی تردید کر دیتی ہے۔ جو دولت اتنے کم وقت تک انسان کا ساتھ دے وہ کبھی انسان کا "سب کچھ" نہیں ہو سکتی۔ انسان کا سب کچھ وہی چیز ہو سکتی ہے جو ابدی طور پر اس کا ساتھ دے، اور ایسا ساتھ دینے والا خدا کے سوا کوئی اور نہیں۔

فرعون کی مومن بیوی نے آخر وقت میں دعا کی تھی: ربّ ابنِ لی عندک بیتاً فی الجنۃ (خدایا، میرے لئے جنت میں اپنے پاس ایک گھر بنا دے۔)

فرعون کی بیوی (آسیہ) مصر کے شاہی محل میں تھیں۔ مگر ان کو محسوس ہوا کہ یہ محل عارضی ہے۔ آج یا کل بہر حال وہ چھن جائے گا۔ مستقل محل وہی ہو سکتا ہے جو اللہ کے پڑوس میں بنے۔ جو شخص اس حقیقت کا ادراک کرلے اس کی زبان سے وہی دعا نکلے گی جو ملکہ مصر کی زبان سے نکلی۔

۲۴ فروری ۱۹۸۴

باجماعت نماز ہو رہی ہو اور امام کوئی غلطی کر جائے تو مقتدیوں کے لئے لقمہ دینا عین جائز ہے۔ اگر لقمہ صحیح ہے تو امام کے اوپر لازم ہے کہ وہ اس کو قبول کرے۔ لیکن اگر کوئی ایسا شخص لقمہ دے جو نماز میں شریک نہ ہو اور امام اس کو قبول کر لے تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اکثر فقہاء کے نزدیک اس کا دہرانا ضروری ہوگا۔

یہ صرف ایک فقہی مسئلہ نہیں بلکہ یہ زندگی کا عام قانون ہے ـــــــ ایک شخص جس کی کمائی میں آپ شریک نہ ہوں اس کے خرچ کے بارہ میں بھی آپ اس کو کوئی مشورہ نہیں دے سکتے۔ ایک ادارہ جس کی تاریخ آپ نے نہ بنائی ہو اس کے نہج میں تبدیلی لانا آپ کے لئے ممکن نہیں ہے۔ ایک تحریک

جس کو آپ نے چلایا نہ ہو اس کے رخ کو بدلنا آپ کے بس میں نہیں ہے۔ ایک ملک جس کی ترقی میں آپ کا خون اور پسینہ شامل نہ ہو اس کے مستقبل کے بارہ میں آپ کی خواہشیں قابل لحاظ نہیں ہو سکتیں۔

ایک صاحب نے مذکورہ فقہی مسئلہ پر یہ اعتراض کیا تھا کہ آخر اس شدت کی کیا ضرورت ہے۔ باہر کا بھی ایک شخص اگر صحیح لقمہ دے تو اس کو قبول کر لینا چاہئے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے یہ بات کہی۔

۲۵ فروری ۱۹۸۴

مسلمانوں کی جدید تاریخ میں غالباً سرسید پہلے قابل ذکر شخص ہیں جنھوں نے تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا:

" سب ترقی کی جڑ یہی ہے کہ سب سے پہلے علم کے خزانوں کو اپنے قابو میں کر لو"

(لکچروں کا مجموعہ، صفحہ ۳۸)

جس وقت سرسید نے یہ بات کہی اس وقت مسلمانوں کے تمام اکابر انگریزوں کے خلاف جنگ میں مشغول تھے۔ انگریز سے نفرت اسلام و ایمان کا معیار بنا ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرسید کی یہ بات لوگوں کی سمجھ میں نہ آسکی۔ سرسید کے بارہ میں کہا گیا کہ وہ انگریزوں کے ایجنٹ ہیں۔ انگریز نے ان کو اس لئے کھڑا کیا ہے تاکہ قوم کی توجہ سیاسی محاذ سے ہٹا دیں ——— جب مزاج بگڑا ہوا ہو تو صحیح بات بھی آدمی کو غلط صورت میں دکھائی دینے لگتی ہے۔

۲۶ فروری ۱۹۸۴

ایک عالم نے ایک بار فتویٰ دیا:

المسح علی الخفین واجب (خفین پر مسح کرنا واجب ہے) یہ ایک غیر معمولی فتویٰ تھا۔ کیوں کہ خفین پر مسح رخصت ہے نہ کہ واجب۔ پھر انھوں نے ایسا کیوں کہا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ عالم کے زمانہ میں لوگوں میں یہ ذہن پیدا ہو گیا تھا کہ خفین پر مسح خلاف اولیٰ ہے، اس لئے انھوں نے مسح کرنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ ذہن شرعی اعتبار سے درست نہیں۔ اس لئے مذکورہ عالم نے اس ذہن کی تصحیح کے لئے رخصت کے حکم کو واجب کے الفاظ میں بیان کیا۔ یعنی جب لوگوں میں خدا کی دی ہوئی رخصت سے کراہت پیدا ہو جائے تو اس وقت رخصت پر عمل کرنا لازم ہو جاتا ہے تاکہ

اس غلط ذہن کی اصلاح ہو۔

یہ حالات کے اعتبار سے کسی چیز پر زیادہ زور دینے کی مثال ہے۔ اور مصلح کو ہمیشہ ایسا کرنا پڑتا ہے۔ فقیہہ مسئلہ کو صرف مسئلہ کے اعتبار سے بیان کرتا ہے۔ مگر جو شخص مصلح ہو وہ مسئلہ کے ساتھ حالات کو بھی دیکھتا ہے۔ حالات کی رعایت سے کبھی وہ ایک چیز پر زیادہ زور دیتا ہے اور کبھی ایک چیز پر کم۔

۲۷ فروری ۱۹۸۴

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی ایک عربی کتاب ہے جس کا نام ہے:

کشف العناء عن وصف الغناء

اس کتاب کا اردو ترجمہ "اسلام اور موسیقی" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس اردو ترجمہ پر اس کے مترجم مولانا محمد عبد المعز صاحب کا مفصل دیباچہ ہے۔ اس دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں:

"خدا کے حکم میں حکمتیں تلاش کرنا ضعف ایمانی کی دلیل ہے۔ علم اسرار وحکم قرون اولیٰ میں ناپید تھا" صفحہ ۵۶

قرون اولیٰ میں مصنوعی باریکیاں نکالنے کا بے شک رواج نہ تھا۔ مگر کلام الٰہی میں جو فطری حکمت چھپی ہوئی ہے اس کی تلاش دور نبوت سے لے کر بعد کے ہر زمانہ میں جاری رہی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کے لئے قرآن میں تدبر کا حکم دیا گیا ہے۔

دین میں موشگافیاں کرنا اور مصنوعی قسم کی بے فائدہ باریکیاں نکالنا سب سے پہلے ایرانیوں نے شروع کیا۔ چونکہ عباسی خلفاء نے سیاسی اسباب کے تحت ایرانیوں کی حوصلہ افزائی کی تھی اس لئے یہ انداز بہت بڑھ گیا۔

جو لوگ خالص دینی مزاج رکھنے والے تھے ان کو اس قسم کے دماغی مشغلے فضول معلوم ہوئے۔ انھوں نے اس کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ مگر یہ بہت بڑا ظلم ہوگا کہ فطری حکمت اور مصنوعی باریکیوں میں فرق نہ کیا جائے اور دونوں کو یکساں طور پر ناپسندیدہ قرار دیا جائے۔ فطری حکمت اضافۂ ایمان کا ذریعہ ہے جبکہ مصنوعی باریکیاں صرف دماغی ورزش ہیں۔

۲۸ فروری ۱۹۸۴

ٹیپو سلطان (۱۷۹۹ - ۱۷۴۹) کے بارہ میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں یہ الفاظ

لکھے ہیں:

He was exceptional for having never allied himself with the English against any other Indian ruler. (IX/1025).

سلطان ٹیپو نے ۱۷۸۹ میں انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کا آغاز کیا۔ انھوں نے عرب، کابل، قسطنطنیہ، فرانس، ماریشش اپنے سفیر بھیجے تاکہ انگریزوں کے خلاف ان کا تعاون حاصل کریں۔ مگر کسی سے ان کو مدد نہیں ملی۔ انھوں نے ہندستانی راجاؤں اور نوابوں سے گفت گو کی مگر کوئی ان کا ساتھ نہ دے سکا۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ کو وہ انگریزوں سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔

عجیب بات ہے کہ یہی کہانی دوبارہ "ریشمی خطوط" کے قائدین نے دہرائی جس کے رہنما مولانا محمود حسن دیوبندی تھے۔ انھوں نے بھی عرب، ترکی، افغانستان اور دوسرے ملکوں میں اپنے نمائندے بھیجے اور ان سے انگریز کے خلاف مدد کی ناکام درخواست کی۔

کیسے عجیب تھے وہ لوگ جن کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ جو بیرونی ممالک ایک ریاست کے حکمراں (سلطان ٹیپو) کو مدد دینے پر راضی نہ ہوئے وہ عین اسی معاملہ میں مدرسہ کے علما کو مدد دینے کے لئے راضی ہو جائیں گے۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

ٹیپو سلطان نہایت بہادر اور باعزم انسان تھا۔ اس کا مشہور مقولہ اس کی سیرت کی مکمل تصویر ہے کہ "گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔" ہندستان میں انگریزوں کی خاص سیاست یہ تھی کہ جہاں وہ دیکھتے کہ دو ریاستوں میں کوئی اختلاف ہے تو وہ ایک کا ساتھ دے کر دونوں کو لڑا دیتے اور اس طرح اپنے لئے زمین ہموار کرتے۔ مگر ٹیپو واحد حکمراں تھا جو کسی کے خلاف انگریزوں کا ساتھی نہ بن سکا۔

سخت دشواریوں کے باوجود ٹیپو انگریزوں سے لڑتا رہا۔ انگریزوں کا عام طور پر یہ احساس تھا کہ برصغیر میں ان کے راستہ کی اصل رکاوٹ ٹیپو ہے۔ چنانچہ ۴ مئی ۱۷۹۹ کو جب ٹیپو انگریزوں کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا تو جنرل ہیرس (Harris) خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے چلا کر کہا کہ آج ہندستان ہمارا ہے:

یکم مارچ ۱۹۸۴

دو مسلم نوجوان ملنے کے لئے آئے۔ انھیں روزگار کی تلاش تھی۔ میں نے کہا کہ روزگار حاصل کرنے کا راز صرف ایک ہے:

آپ دوسروں کی ضرورت بن جائیں۔

آج ہر ادارہ اور ہر کاروبار میں کارکنوں کی ضرورت ہے، ایسے کارکن جن میں محنت اور دیانت داری کی صفت ہو۔ اگر آپ فی الواقع یہ دونوں صفت اپنے اندر پیدا کرلیں تو آپ لوگوں کی ضرورت بن جائیں گے۔ پھر روزگار آپ کے پیچھے دوڑے گا، آپ کو روزگار کے پیچھے دوڑنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

۲ مارچ ۱۹۸۴

انسان اس پر قادر نہیں کہ وہ اپنے آپ کو موت سے بچاسکے۔ انسان اس پر قادر نہیں کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے پیشی سے بچاسکے۔ انسان اس پر قادر نہیں کہ وہ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاسکے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کا اصلی عجز چھپا ہوا ہے۔

انسان اگر اپنے اس عجز کو جانے تو وہ کبھی سرکشی نہ کرے۔ کل کے دن عاجز ہونے والا آج ہی اپنے آپ کو عاجز محسوس کرنے لگے۔ وہ سرکشی کے بجائے حق پرستی کا طریقہ اختیار کرلے۔

۳ مارچ ۱۹۸۴

ہندستان کے سابق وزیر داخلہ مسٹر گلزاری لال نندا نے ۵ دسمبر ۶۳ ۱۹ کو احمد آباد میں ایک تقریر کی تھی۔ اس میں انھوں نے کہا تھا کہ دو سال کے اندر میں بد دیانتی، رشوت خوری اور بدعنوانی کو ختم کردوں گا۔ اس عرصہ میں میں عوام کو ایسا ایڈمنسٹریشن دوں گا جو صاف ستھرا اور فعال ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اگر میں اپنے دعوے میں کامیاب نہیں ہوا تو میں وزارت سے استعفا دے دوں گا۔ یہی بات دوبارہ انھوں نے ۲ جنوری ۶۴ ۱۹ کو دہلی کے ایک جلسہ میں دہرائی۔

یہ وہ وقت ہے جب کہ جواہر لال نہرو اور دوسرے ابتدائی کانگریسی لیڈر حکومت میں موجود تھے مگر واقعات بتاتے ہیں کہ گلزاری لال نندا اپنے منصوبہ میں ایک فیصد بھی کامیاب نہیں ہوئے۔

بلکہ ۱۹۶۴ میں ہندستان میں جتنا کرپشن تھا، اب ۲۰ سال بعد اس میں بے شمار گنا زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ سماجی بگاڑ کو صرف حکومت کی طاقت سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے ایک درجہ کی سماجی اصلاح بھی ناگزیر طور پر ضروری ہے۔ اس حقیقت سے مسٹر گلزاری لال نندا جتنے ناواقف تھے، اتنا ہی ناواقف وہ مسلم لیڈر بھی ہیں جو موجودہ زمانہ میں اسلامی حکومت قائم کرنے کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں۔

۴ مارچ ۱۹۸۴

کچھ برائیاں وہ ہیں جنھیں صرف " دیکھنا " پڑتا ہے۔ اور کچھ برائیاں وہ ہیں جن کو "بھگتنا" پڑتا ہے۔ جو شخص موجودہ دنیا میں کامیاب ہونا چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ دونوں میں فرق کرے۔

جو برائیاں اس سے دور ہیں اور جن کو وہ صرف دیکھ رہا ہے ان کو وہ نظرانداز کرے وہ صرف ان برائیوں کو اپنے لئے مسئلہ بنائے جن کو اسے بھگتنا بھی پڑ رہا ہو۔ آدمی اگر دونوں قسم کی برائیوں کو یکساں اہمیت دینے لگے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔

۵ مارچ ۱۹۸۴

مغرب کی نماز کے لئے وضو کر کے غسل خانہ سے نکلا تو موت کو سوچ کو بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ زبان پر یہ دعا جاری ہوگئی :

خدایا زندگی بہرحال ایک روز ختم ہونے والی ہے۔ اور جو چیز ختم ہونے والی ہے وہ گویا آج ہی ختم ہوگئی۔ خدایا مجھے بخش دیجئے، خدایا مجھے بخش دیجئے، خدایا مجھے بخش دیجئے۔

۶ مارچ ۱۹۸۴

بلند شہر کے ایک صاحب ملنے کے لئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ بزنس کرتے ہیں اور اب وہ اکسپورٹ کے کام میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ میں آپ سے ایک معاملہ میں مشورہ لینا چاہتا ہوں۔ میرے یہاں ایک امام صاحب ہیں وہ جن بھوت اتارنے کا کام کرتے ہیں۔ اس کام کو انھوں نے باقاعدہ تجارت بنالیا ہے

اور بہت منظم طریقہ پر لوگوں کا استعمال کر رہے ہیں۔ میں اس کو غیر اسلامی سمجھتا ہوں اور اس کو اپنے یہاں سے ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ مگر امام صاحب کے ساتھ کئی دادا قسم کے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ امام صاحب کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دادا لوگوں سے لڑائی مول لی جائے۔

میں نے کہا کہ ان حالات میں اگر آپ ان کے خلاف کوئی کارروائی کرتے ہیں تو اس سے صرف شر پھیلے گا اور کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ دوسری طرف آپ یقینی طور پر اپنا کاروباری نقصان کرلیں گے۔

میں نے کہا کہ زندگی میں ایک کام کو کرنے کے لئے دوسرے کام کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اگر آپ کو کلکتہ جانا ہے تو آپ کو امرت سر کی گاڑی چھوڑنی پڑے گی۔ اسی طرح اگر آپ بزنس کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو جھگڑا لڑائی سے اپنے آپ کو الگ کرنا ہوگا۔

آپ کو اگر امام صاحب کا درد ہے تو ان کو تنہائی میں سمجھائیے۔ اور اگر وہ سمجھانے سے نہ مانیں تو ان کے حق میں خدا سے دعا کیجئے۔ بس یہ آپ کی آخری حد ہے۔ اس سے آگے آپ کو جانے کی ضرورت نہیں۔

۷ مارچ ۱۹۸۴

ہندستان کی سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۵ کو ایک انٹرویو دیا تھا یہ انٹرویو آسٹریلیا کے براڈ کاسٹنگ کمیشن کے ٹیلی وژن پروگرام کے تحت تھا۔

انٹرویور نے ایک سوال یہ کیا تھا کہ کیا آپ پسند کریں گی کہ آپ مزید ۹ سال تک حکومت میں رہیں، جیسا کہ آپ ۱۹۶۶ سے ہیں۔ یہ سن کر مسز اندرا گاندھی نے کہا:

If anybody knows how hard my life is,
one should not even think of asking such question.

اگر کسی کو معلوم ہو کہ میری زندگی کتنی سخت ہے تو وہ مجھ سے اس قسم کا سوال کرنے کا خیال دل میں نہ لائے۔

(ہندستان ٹائمس ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۵)

جن گدیوں کو لوگ رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں وہ گدیاں خود بیٹھنے والوں کے لئے کانٹوں کا بستر ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جاہ پسندی واحد چیز ہے جو لوگوں کو ان گدیوں پر بٹھائے رکھتی ہیں۔ اگر جاہ پسندی کا مزاج نہ ہو تو اونچی گدیوں پر بیٹھنے والے اپنی گدیوں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوں۔

۸ مارچ ۱۹۸۴

ایک عرب مفکر کا قول ہے: رجل ذوھمۃ یحیی الامۃ (ایک باہمت آدمی پوری قوم کو زندہ کر دیتا ہے)

میرے نزدیک یہ بہت صحیح بات ہے۔ یہ دراصل افراد ہیں جو تاریخ بناتے ہیں۔ تاہم اس قول میں ایک بات چھوٹ گئی ہے۔ وہ یہ کہ باہمت آدمی کو ہمیشہ کچھ باہمت ساتھی درکار ہوتے ہیں۔ کوئی ایک شخص خواہ وہ کتنا ہی زیادہ حوصلہ مند ہو اور کتنا ہی زیادہ لائق ہو لیکن اگر اس کو اچھے ساتھی نہ ملیں تو وہ کوئی بڑا واقعہ رونما نہیں کر سکتا۔ پیغمبروں کی تاریخ اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

۹ مارچ ۱۹۸۴

ایک نوجوان نے پوچھا کہ مضمون نگار بننے کا طریقہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ مضمون نگاری مشکل ترین آرٹ ہے۔ آدمی ایک عمر لکھنے اور پڑھنے میں لگا دیتا ہے تب اس کو مضمون لکھنا آتا ہے۔

بازار میں بہت سی کتابیں چھپی ہوئی ملتی ہیں جن کا ٹائٹل ہوتا ہے "مضمون کیسے لکھیں" مگر میرا خیال ہے کہ اس قسم کی کتابیں وہی لوگ لکھتے ہیں جو خود بھی مضمون لکھنا نہیں جانتے۔ کوئی بھی شخص جو حقیقی معنوں میں مضمون لکھنا جانے گا وہ اس قسم کی کتابیں کبھی نہیں چھاپے گا۔

مضمون نگاری کا راز صرف مضمون نگاری ہے۔ آدمی پڑھے اور لکھے، پڑھے اور لکھے۔ اسی طرح وہ ۲۰ سال تک کرتا رہے تو انشاء اللہ اسے مضمون لکھنا آجائے گا۔ بشرطیکہ اس کے اندر اس کی فطری صلاحیت بھی موجود ہو۔

۱۰ مارچ ۱۹۸۴

"باپ دادا کا دھرم رائی سمان اور دوسرے کا دھرم پربت سمان ہو تب بھی باپ دادا کا دھرم نہ چھوڑو"۔ یہ اصول بہت سے لوگوں کے نزدیک نہایت اہم ہے۔ وہ دھرم کی جس لکیر کو پکڑے ہوئے ہیں۔ اس پر بالکل غور کرنا نہیں چاہتے۔ صرف اس لئے کہ یہ دھرم انھیں اپنے باپ دادا سے ملا ہے۔

مگر یہ اصول صرف دھرم اور مذہب کے معاملہ میں اختیار کیا جاتا ہے نہ کہ تمام

معاملات میں۔ مثلاً اگر کسی شخص کو اپنے باپ دادا سے مفلسی اور محتاجی کی وراثت ملی ہو تو وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا کہ وہ باپ دادا کی معاشی حالت پر پڑا رہے اور نئے ذرائع حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نظریہ کے پیچھے کوئی منطق نہیں۔ یہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی دنیا کے معاملات میں تو سنجیدہ ہے مگر خدا اور مذہب کے معاملہ میں وہ سنجیدہ نہیں۔

۱۱ مارچ ۱۹۸۴

ایک صاحب نے کہا کہ آپ الرسالہ میں اپنی تعریف چھاپتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بات صرف وہ شخص کہہ سکتا ہے جس نے الرسالہ کو پڑھا نہ ہو۔ اور نہ وہ مجھ سے واقف ہو۔

میں نے کہا کہ یہ اللہ کا فضل ہے کہ سچائی میری اپنی دریافت ہے۔ میں سنی سنائی باتیں نہیں لکھتا بلکہ وہ باتیں لکھتا ہوں جو میری اپنی دریافت ہوتی ہیں۔ اور جو شخص خود اپنی دریافت کردہ سچائی پر کھڑا ہوا ہو وہ کبھی کسی کی تعریف کا محتاج نہیں ہوتا۔

ایسا انسان اپنے آپ میں جیتا ہے۔ اس کی دریافت ہی اس کی تسکین کے لئے کافی ہوتی ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ مجھے نہ کسی کی تعریف سے خوشی ہوتی ہے اور نہ کسی کی تنقید پر غم۔ البتہ اگر کوئی شخص غیر حقیقت پسندانہ انداز اختیار کرتا ہے تو اس پر ضرور دکھ ہوتا ہے کہ یہ شخص حقیقت کے خلاف انداز کیوں اختیار کر رہا ہے، جب کہ ایسا انداز اس کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

۱۲ مارچ ۱۹۸۴

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے الرسالہ کی کافی تعریف کی۔ میں نے کہا کہ الرسالہ کا معاملہ ایک ذمہ داری کا معاملہ ہے نہ کہ تعریف کا معاملہ۔ آپ اگر الرسالہ سے متفق ہیں تو اس کی ایجنسی لیجئے اور اس کو پھیلائیے۔

میں نے کہا کہ اس وقت سب سے پہلا کام یہ ہے کہ قوم کو سمجھ دار بنایا جائے۔ اسی کو قرآن میں "تزکیہ" کہا گیا ہے (ویزکیھم) تزکیہ کا مطلب اسلامی اعتبار سے وہی ہے جس کو آجکل کی زبان میں ایجوکیٹ کرنا کہتے ہیں۔ یہی وہ کام ہے جس کو الرسالہ کے ذریعہ انجام دیا جارہا ہے۔ انھوں نے ایجنسی کی اہمیت سے اتفاق کیا۔ مگر کہا کہ گھر واپس جا کر خط لکھوں گا۔

میں نے کہا کہ اس قسم کے معاملات ملتوی نہیں کئے جاتے۔ ان کو فوراً شروع کر دیا جاتا ہے۔ انگریزی

کاایک مثل مجھ کو بہت پسند ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

There is no better time to start than this very minute.

شروع کرنے کا سب سے اچھا وقت یہ ہے کہ اس کو ابھی شروع کر دیا جائے۔

۱۳ مارچ ۱۹۸۴

حضرت علیؓ کا ایک قول پڑھا۔ الفاظ یہ تھے: العاقل ھوالذی یضع الشئ مواضعہ (عقل مند وہ ہے جو چیز کو اس کی جگہ پر رکھ سکے)

یہ دانشن آدمی کی نہایت صحیح اور جامع تعریف ہے۔ باتیں یا معلومات ہر شخص کے پاس ہوتی ہیں۔ مگر باتوں کو ان کی اصل حیثیت میں رکھ کر ان کی حقیقت کو سمجھنا، یہ بہت مشکل کام ہے اور گہری عقل والا آدمی ہی اس کو کر سکتا ہے۔ اسی لئے فارسی کا ایک مقولہ ہے کہ یک من علم را دہ من عقل می باید (ایک من علم کے لئے دس من عقل چاہئے)

۱۴ مارچ ۱۹۸۴

حضرت عمر کا بایاں ہاتھ بھی دائیں ہاتھ کی طرح چلتا تھا۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ وہ دونوں ہاتھوں سے کام کرتے تھے: (کان یعمل بکلتا یدیہ) حیاتیات کی رو سے دونوں ہاتھ کا یکساں طور پر چلنا اس بات کی علامت ہے کہ آدمی عام لوگوں سے زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت عمر غیر معمولی صلاحیتوں کے آدمی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بابت فرمایا:

لم أر عبقرياً يفري فريه

میں نے عمر جیسا عبقری نہیں دیکھا جو ان کے جیسا کام کر سکے۔

۱۵ مارچ ۱۹۸۴

جنگ بدر ۱۵ مارچ ۶۲۴ء (۱۷ رمضان ۲ھ) کو ہوئی، اور واٹرلو کی جنگ ۱۸ جون ۱۸۱۵ کو ہوئی۔ پہلی جنگ کے قائد محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور دوسری جنگ کا قائد فرانس کا نپولین تھا۔ عجیب بات ہے کہ دونوں مواقع پر جنگ سے پہلے والی رات کو بارش ہوئی۔ مگر بارش کا نتیجہ دونوں کے حق میں الگ الگ نکلا۔ رسول اللہ کے لئے بارش فتح کا سبب بنی اور نپولین کے لئے

بارش شکست کا سبب۔

بدر کے موقع پر یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی مسلمان وادی کے بالائی حصہ پر تھے۔ بارش ہوئی تو وہاں ریت جم گئی، اور جس زمین میں پہلے خشک ریت کی وجہ سے پاؤں دھنس رہے تھے وہ اتنی مضبوط ہوگئی کہ پاؤں اچھی طرح جم سکیں۔ دوسری طرف دشمن کا لشکر نشیب کی طرف تھا۔ چنانچہ وہاں بارش کے نتیجہ میں کیچڑ اور دلدل ہوگئی اور چلنا اور حرکت کرنا دشوار ہوگیا۔ مسلمانوں کے ساتھ اس معاملہ کا ذکر قرآن میں ان لفظوں میں آیا ہے : ویثبت بہ الاقدام (الانفال ۱۱)

واٹرلو کا معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ وہاں ۱۷ اور ۱۸ جون کی درمیانی شب میں بارش ہوئی یہ جنگ نپولین (فرانس) اور ولنگٹن (پروشیا) کے درمیان تھی۔ نپولین اس سے پہلے ولنگٹن کو کافی نقصان پہنچا چکا تھا۔ اور مورخین کے مطابق ۱۸ جون کا مقابلہ فیصلہ کن طور پر نپولین کے حق میں ہوتا۔ مگر رات کی شدید بارش کی وجہ سے نپولین نے محسوس کیا کہ زمین جنگ کے قابل نہیں ہے۔ اس نے دوپہر تک انتظار کیا تاکہ زمین سوکھ جائے۔ یہ تاخیر نپولین کے لئے الٹی ثابت ہوئی۔ اس درمیان میں انگریز جنرل بلوشر (Blucher) ولنگٹن کی حمایت میں بڑی فوج لے کر آگیا۔ اس کے بعد جب لڑائی ہوئی تو نپولین کمزور ثابت ہوا اور اس کو شکست ہوگئی۔ (برٹانیکا جلد ۷، صفحہ ۳۲)

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں اصل اہمیت اسباب کی نہیں بلکہ فیصلہ خداوندی کی ہے۔ ایک ہی قسم کے اسباب ایک شخص کے لئے کامیابی کا ذریعہ بن سکتے ہیں اور اسی قسم کے اسباب دوسرے شخص کے لئے ناکامی کا قبرستان۔

۱۶ مارچ ۱۹۸۴

حضرت عمر کا ایک قول ہے، وہ اکثر اپنے اس قول کو دہرایا کرتے تھے : اخوف ما اخاف علیکم اعجاب المرء برأیہ (سب سے زیادہ میں جس چیز سے تمہارے بارہ میں ڈرتا ہوں، وہ ہے آدمی کا اپنی رائے کو پسند کرنا)

اپنی رائے کو رائے سمجھنے کا مزاج ہلاکت کی بدترین قسم ہے۔ جس شخص کے اندر یہ مزاج پیدا ہو جائے وہ بس اپنے خیالات میں گم رہتا ہے۔ اس کو اپنے سے باہر کی صداقت کا علم نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں

حق کی پیروی کر رہا ہوں، حالاں کہ وہ صرف اپنی خواہشات کی پیروی کر رہا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں معاملہ کی سچائی تک پہنچ گیا ہوں حالانکہ وہ صرف اپنی ادھوری رائے میں بھٹک رہا ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنے ذہنی خول سے باہر نکلنا ہی نجات اور کامیابی کا آغاز ہے۔ جو لوگ اپنے ذہنی خول سے نہ نکلیں ان کا ذہنی خول ان کے لئے قبرستان بن کر رہ جاتا ہے۔

۱۷ مارچ ۱۹۸۴

کہا جاتا ہے کہ بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) پہلے صوفی ہیں جنھوں نے معراج کے واقعہ کو سالک کے لئے ایک نصب العین کی حیثیت سے پیش کیا۔ وہ خود بھی اسراء کی کیفیت سے بہرہ مند ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ ان کو آسمان پر پرواز کا روحانی تجربہ ہوا ہے۔ جہاں انھوں نے جنت اور دوزخ کا نظارا کیا ہے۔ شجرۂ توحید بچشم خود دیکھا ہے اور قرب الٰہی کی منزلیں طے کی ہیں۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اللہ سے علم لینے کا شرف بھی انھیں حاصل ہوا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ بایزید بسطامی کی طرف یہ انتساب درست نہ ہو۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ تصوف کی ساری دھوم اسی قسم کے پراسرار عقائد کی بنا پر ہے۔ بعد کے دور میں امت میں جو سب سے بڑا انحراف پیش آیا وہ یہ تھا کہ کسی بات کو جانچنے کا معیار کتاب وسنت نہ رہا بلکہ بزرگوں کے واقعات اور ملفوظات اس کا معیار بن گئے۔ یہی وہ انحراف تھا جس نے بے شمار قسم کی خرافات کو مسلمانوں کے اندر داخل کر دیا۔

۱۸ مارچ ۱۹۸۴

۱۹۷۱ میں میں احمد آباد گیا تھا۔ وہاں ایک مدرسہ نے اپنے سالانہ اجلاس میں مجھ کو صدر کی حیثیت سے بلایا تھا۔ جلسہ میں کافی لوگ آئے مگر تبلیغی جماعت کا حلقہ میری تقریر میں شریک نہیں ہوا۔

بعد کو خود تبلیغ والوں نے اپنی مسجد میں ایک پروگرام رکھا۔ وہاں انھوں نے اہتمام کے ساتھ کھانے کی دعوت کی اور میری تقریر کرائی جس میں احمد آباد کا پورا تبلیغی حلقہ شریک ہوا۔

اس وقت انھوں نے بتایا کہ تبلیغ والے کیوں آپ کے جلسے میں شریک نہیں ہوئے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم کو یہ خبر دی گئی کہ آپ داڑھی نہیں رکھتے۔ ہم نے سوچا کہ جو مولوی داڑھی نہ رکھتا ہو اس کی بات سننے سے کیا فائدہ۔ مگر بعد کو ہمارے کچھ آدمیوں نے آپ کو دیکھا اور یہاں آکر بتایا کہ ان کے

چہرہ پر توپوری داڑھی ہے۔ جب تحقیق ہوگئی کہ آپ واقعی داڑھی رکھتے ہیں تو ہم نے یہ پروگرام بنایا۔ تبلیغ کے ایک آدمی نے کھانے کے دسترخوان پر یہ واقعہ بیان کیا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر کتنی غلط باتیں مشہور ہوجاتی ہیں۔ اسی لئے قرآن میں یہ اصول بتایا گیا ہے کہ کسی کے بارہ میں اگر کوئی غلط خبر ملے تو اس وقت تک اس کو نہ مانو جب تک اس کی تحقیق نہ کرلو۔

سنی ہوئی بات کی تحقیق ہر مسلمان پر لازم ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ شخص ہوسکتا ہے جو بات کو سن کر بھول جائے اور اس کو دوبارہ کسی سے بیان نہ کرے۔ مگر جو شخص سنی ہوئی بات کو بیان کرے اس پر فرض ہے کہ وہ بیان کرنے سے پہلے اس کی تحقیق کرے۔

۱۹ مارچ ۱۹۸۴

ما اکل احد طعاماً قط خیراً من ان یاکل من عمل یدہ (حدیث)

سب سے بہتر کھانا وہ ہے جو کوئی شخص اپنے ہاتھ کی محنت سے کھائے۔

محنت کی روزی بلاشبہ سب سے بہتر روزی ہے۔ اس میں بے شمار فائدے ہیں جن کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی عمل ید (ہاتھ کے عمل) سے اپنی روزی پیدا کررہا ہو۔ یعنی خود مزدوری کرے اور پھر اس سے اپنی ضروریات پوری کرے۔ یہ اس حدیث کا براہ راست لفظی مفہوم ہے۔

تاہم دماغی محنت بھی بالواسطہ طور پر اس میں شامل ہے۔ جس طرح حدیث میں "اکل" سے مراد لفظی طور پر صرف کھانا نہیں ہے بلکہ عمل ید کے ذریعہ حاصل شدہ رقم سے وہ اپنی جو ضرورت بھی پوری کرے وہ سب اس میں شامل سمجھا جائے گا۔ اسی طرح خود "عمل ید" کا بھی ایک توسیعی مفہوم ہے اور اس کے اعتبار سے اس میں ہر وہ کوشش شامل ہے جو آدمی جائز طور پر کرتا ہے یا کرسکتا ہے۔

۲۰ مارچ ۱۹۸۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک لڑائی میں ایک مسلمان کے سر پر زخم آگیا اتفاق سے اس کو غسل کی حاجت پیش آئی۔ ایسی حالت میں پانی سر پر استعمال کرنا مہلک تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ ساتھیوں نے کہا کہ پانی کی موجودگی میں ہم تمہارے لئے کوئی گنجائش

نہیں پاتے۔ چنانچہ اس مسلمان نے اسی زخم کی حالت میں پانی سے غسل کیا اور اس کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا: قتلوہ قتلهم اللہ۔ انھوں نے اس کو مار ڈالا اللہ انھیں ہلاک کرے۔

اس واقعہ سے دین کی روح معلوم ہوتی ہے۔ دین کے جو احکام ہیں ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر حال میں ان کی تعمیل کی جائے گی، خواہ ان کی تعمیل ایک بے قصور انسان کی ہلاکت کا سبب بن رہی ہو۔ حکم کی تعمیل اور انسانی جان میں اگر ٹکراؤ ہو جائے تو حسب حالات حدود شریعت کے اندر احکام میں تغیر کیا جائے گا تاکہ انسانی جان بچائی جاسکے۔

۲۱ مارچ ۱۹۸۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار مسلمانوں کو انفاق کی رغبت دلائی۔ اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے چار ہزار دینار پیش کیا۔ عاصم بن عدی نے ایک سو وسق کھجوریں لاکر دیں۔ ایک غریب صحابی ابو عقیل جو محنت مزدوری کا کام کرتے تھے، انھوں نے دن بھر محنت کرکے دو صاع کھجور حاصل کی۔ اس میں سے ایک صاع کھجور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کی اور ایک صاع اپنے گھر والوں کو دی۔

مدینہ میں جو منافق تھے انھوں نے ان دونوں ہی قسم کے مسلمان کا مذاق اڑایا، جنھوں نے زیادہ مال دیا تھا ان کے بارے میں کہا کہ انھوں نے نمود و نمائش کے لئے دیا ہے۔ اور جو لوگ کم دے سکے تھے ان کے بارے میں کہا کہ جب اس شخص کے پاس دینے کے لئے نہیں تھا تو اس کو کیا ضرورت تھی کہ اپنا نام دینے والوں میں لکھوائے۔

اس قسم کے عیب نکالنا منافقت ہے۔ منافق کسی گزری ہوئی جماعت کا نام نہیں۔ ہر وہ شخص منافق ہے جس کے اندر منافق والی صفات پائی جائیں۔ اس واقعہ میں دوسرا سبق یہ ہے کہ مذاق اڑانے کی کوئی حد نہیں۔ ایک شخص اگر غیر سنجیدہ ہے تو وہ ہر بات کا مذاق اڑا سکتا ہے، خواہ وہ بات بذات خود کتنی ہی درست کیوں نہ ہو۔ جو شخص کسی کو غلط ثابت کرنے کے لئے اس کا مذاق اڑائے وہ خود اپنے آپ کو غلط ثابت کر رہا ہے۔

۲۲ مارچ ۱۹۸۴

عبد اللہ بن عباس کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار مدینہ کی مسجد میں تھے اور جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے۔ آپ نے ممبر پر کھڑے ہوکر ۳۶ آدمیوں کو نام لے کر پکارا اور فرمایا: اخـرج فـانك منـافق (تم مسجد سے نکل جاؤ، کیوں کہ تم منافق ہو۔)

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ منافقین کے بارہ میں جانے کی آخری حد کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کو ان کی منافقت کی بنا پر کوئی جسمانی سزا نہیں دی اور نہ ان کو قتل کرایا۔ آخری مرحلہ میں آپ نے صرف یہ کیا کہ ان کو نامزد کر کے مخلص مسلمانوں سے جدا کر دیا۔

پیغمبر کو قطعیت کے ساتھ معلوم ہوچکا تھا کہ کون منافق ہے اور کون منافق نہیں ہے۔ اس کے باوجود آپ نے کوئی مزید کارروائی ان کے خلاف نہیں کی۔ پھر بعد کے لوگوں کو تو اور بھی زیادہ اس کا پابند رہنا ہے کہ وہ کسی کو منافق قرار دے کر اس کے خلاف جارحانہ عمل کو اپنے لئے جائز نہ کریں۔

۲۳ مارچ ۱۹۸۴

سورہ حج کی آیت ..... والقائمین والرکع السجود کے تحت شاہ عبد القادر صاحب لکھتے ہیں: "پہلی امتوں میں رکوع نہ تھا۔ یہ خاص اسی امت محمدیہ کی نماز میں ہے"۔

اپنی امت کو افضل اور اکمل ثابت کرنے کے لئے لوگوں نے عجیب عجیب نظریے بنائے ہیں انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ حالانکہ حدیث اور قرآن سے یہ ثابت نہیں کہ پچھلی امتوں کی نماز رکوع کے بغیر ہوتی تھی۔

یہ بحث میرے نزدیک سراسر عبث ہے کہ ایک امت کو دوسری امت سے افضل اور اکمل ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس قسم کی کوشش اپنی ساری کامیابی کے بعد بالآخر جو تحفہ دیتی ہے وہ ہے مسلمانوں میں اسلام پر بے جا فخر اور دوسری قوموں میں اسلام سے بے جا توحش۔

۲۴ مارچ ۱۹۸۴

الکزنڈر ڈیوما (Alexander Dumas) ۱۸۲۴ میں پیرس میں پیدا ہوئے اور ۱۸۹۵ میں ان کی وفات ہوئی۔ وہ ایک کہانی نویس تھے۔ کہا جاتا ہے کہ الکزنڈر ڈیوما کا کوئی دوست

اگر ان سے ملنے کے لئے آجاتا جب کہ وہ اپنی تخلیق میں محو ہوں، تو وہ اس کو خوش آمدید کہنے کے لئے صرف اپنا بایاں ہاتھ بڑھا دیتے اور دائیں ہاتھ سے لکھنے کا کام بدستور جاری رکھتے۔

جب کسی آدمی کو ایک کام کی دھن ہو جائے تو اس کی مصروفیت کا عالم یہی ہو جاتا ہے۔ اور جو لوگ اس طرح اپنے مقصد میں مصروف ہوں وہی کوئی بڑا کام کرلے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

۲۵ مارچ ۱۹۸۴

ایک حدیث ہے: مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ۔ یعنی جس شخص نے میانہ روی اختیار کی وہ محتاج نہیں ہوا۔

یہ چھوٹا سا فقرہ معاشی زندگی کا اہم ترین راز بتا رہا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ محتاجی سے بچنے کا راز معتدل خرچ میں ہے نہ کہ زیادہ آمدنی میں۔

آدمی اپنے خرچ پر کنٹرول نہ رکھے تو ہر آمدنی اس کے لئے کم ہو جائے گی۔ اور اگر وہ اپنے خرچ پر کنٹرول رکھے تو ہر آمدنی اس کی ضرورت کے لئے کافی ثابت ہوگی۔

۲۶ مارچ ۱۹۸۴

قرآن میں پیغمبروں کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ لا اسئلکم علیہ من اجر۔ اس کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

"یعنی تمہارے مال کی مجھے ضرورت نہیں۔ میرا پیدا کرنے والا ہی تمام دنیوی ضروریات اور اخروی اجر وثواب کا کفیل ہے۔ یہ بات ہر ایک پیغمبر نے اپنی قوم سے کہی تاکہ نصیحت بے لوث اور مؤثر ہو۔ لوگ ان کی محنت کو دنیوی طمع پر محمول نہ کریں"۔ تفسیر قرآن، ۲۹۴

مذکورہ عبارت میں "اخروی اجر وثواب" کا لفظ محض تطبیق کے لئے شامل کیا گیا ہے۔ اس غیر ضروری تطبیق کو چھوڑ کر اس عبارت میں نہایت صحیح بات کہی گئی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ داعی کو دنیوی اور مادی اعتبار سے بے غرض ہونا پڑتا ہے۔ مدعو کی نظر میں بے غرض بننے کے لئے اس کو یک طرفہ قربانی دینی پڑتی ہے۔ اس کے بغیر کسی کو داعی کا مقام ملنا ممکن نہیں۔

۲۷ مارچ ۱۹۸۴

حضرت ابراہیمؑ نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے اسماعیل کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے ہیں۔

انھوں نے یہ خواب اپنے بیٹے اسماعیل سے بیان کیا۔ انھوں کہا کہ یا ابت افعل ما تومر ستجدنی انشاء اللہ من الصابرین (الصافات) اے باپ، جو حکم آپ کو ملا ہے اسے کر ڈالئے انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے۔

بظاہر یہ ایک قدیم واقعہ ہے۔ مگر یہ ایک مستقل حقیقت کو بتا رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ ہوتے ہیں جو تاریخ بناتے ہیں۔ حضرت اسماعیل نے ایک تاریخ بنائی۔ اسی طرح آج بھی اسماعیل جیسے لوگوں کی ضرورت ہے تاکہ دوبارہ اسلام کی تاریخ بنائی جاسکے۔

یہ کردار اسماعیل کیا ہے۔ وہ ہے اپنی ذات کو ہمہ تن مقصد اعلیٰ کے حوالے کر دینا۔ مقصد جو کچھ ہے اس کو کرنے کے لئے تیار ہو جانا، خواہ اس راہ میں اپنی ذات کو ذبح کر دینا پڑے۔

۲۸ مارچ ۱۹۸۴

مولانا شبیر احمد عثمانی سورہ احزاب کی تفسیر میں خاتم النبیین کی آیت کے تحت لکھتے ہیں:

" بعض محققین کے نزدیک انبیاء سابقین اپنے اپنے عہد میں بھی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت عظمیٰ ہی سے مستفید ہوتے تھے۔ جیسے رات کو چاند اور ستارے سورج کے نور سے مستفید ہوتے ہیں۔ حالانکہ سورج اس وقت دکھائی نہیں دیتا۔ اور جس طرح روشنی کے تمام مراتب عالم اسباب میں آفتاب پر ختم ہو جاتے ہیں اسی طرح نبوت و رسالت کے تمام مراتب و کمالات کا سلسلہ بھی روح محمدی صلعم پر ختم ہوتا ہے۔ بدیں لحاظ کہہ سکتے ہیں کہ آپ رتبی اور زمانی ہر حیثیت سے خاتم النبیین ہیں۔ اور جن کو نبوت ملی ہے آپ ہی کی مہر لگ کر ملی ہے" تفسیر قرآن مولانا شبیر احمد عثمانی صفحہ ۵۵۰۔

عجیب بات ہے کہ قدیم علماء بڑی بڑی باتوں کو اسی طرح مثالوں سے بیان کر دیتے ہیں۔ حالانکہ مثالوں سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ علم کی حدود نہیں جانتے۔

مذکورہ عبارت میں خاتم الانبیاء کی جو تشریح کی گئی ہے، اس کو ثابت کرنے کے لئے قرآن و حدیث کی کوئی واضح دلیل درکار ہے۔ یہ دلیل بھی عبارت النص سے نکلنی چاہیے۔ اتنی بڑی بات کے لئے استنباطی نص بھی ناکافی ہے، کجا کہ اس کو قیاسی منطق یا مثالوں کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔

سورج کی وہ حیثیت عالم افلاک میں نہیں ہے جو "بعض محققین" نے بتائی ہے۔ تاہم اس سے قطع نظر،

اس طرح کی مثال سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ اس کے ثبوت بننے کے لئے ضروری ہے کہ دعویٰ اور مثال میں ربط ثابت ہو اور دونوں کے درمیان ربط کا کوئی ثبوت نہیں۔ مثال ایسی چیز ہوتی ہے کہ اس کو جہاں چاہے جوڑ دیا جائے۔

۲۹ مارچ ۱۹۸۴

عرب کے ایک جاہلی شاعر نے کہا تھا:

الا لا یجھلن احد علینا

فنجھل فوق جھل الجاھلینا

کوئی شخص ہرگز ہم پر جہالت نہ کرے، ورنہ ہم تمام جاہلوں سے بڑھ کر اس کے اوپر جہالت کریں گے۔

برائی کی یہ قسم ہر دور میں پائی جاتی رہی ہے۔ بیشتر لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان کو چھیڑ دیجئے تو ان کے اندر کا شیطان جاگ اٹھتا ہے۔ اگر آپ نے ان کے اوپر کنکری پھینکی ہے تو وہ چاہیں گے آپ کے اوپر پتھروں کی بارش کر کے آپ کو نیست نابود کر ڈالیں۔

ایسی دنیا میں زندہ رہنے کا راز صرف ایک ہے۔ اور وہ اعراض ہے۔ آپ صرف اعراض (اوائڈ) کر کے لوگوں کے شر اور جہالت سے بچ سکتے ہیں۔ اگر آپ اعراض نہ کریں تو پھر لوگوں کے شر اور جہالت سے بچنا بھی آپ کے لئے ممکن نہیں۔

۳۰ مارچ ۱۹۸۴

ایک نوجوان ملنے کے لئے آئے۔ انھیں کام کی تلاش تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ الرسالہ کے دفتر میں کام کریں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کی تعلیم کہاں تک ہوئی ہے تو انھوں نے بتایا "الونتھ تک"۔ میں نے کہا کہ اپنے اس جملہ کو انگریزی میں کہئے کہ میں نے الونتھ تک پڑھا ہے۔ انھوں نے کچھ دیر تک سوچا اس کے بعد بولے:

I was read eleve'nth.

میں نے کہا کہ یہ انگریزی نہیں، یہ اے بی سی ڈی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پھر اس کی انگریزی کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کو انگریزی میں کہنا ہو تو اس طرح کہیں گے:

I have studied upto the eleventh standard.

آجکل کے مسلم نوجوانوں کے بارہ میں میرا تجربہ نہایت تلخ ہے۔ انگریزی تو درکنار، اردو میں بھی ایک اچھا خط لکھنے کی توقع ان سے بہت کم کی جاسکتی ہے۔ الرسالہ کے دفتر کے لئے ہم عرصہ سے ایک ایسے نوجوان کی تلاش میں ہیں جو اردو میں خطوط کا عمدہ جواب لکھ سکتا ہو۔ مگر اب تک ہمیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ یہی معاملہ ہنر کا ہے۔ الرسالہ کے دفتر کے لئے ایک انگریزی ٹائپسٹ عرصہ سے تلاش کیا جارہا ہے۔ مگر حال یہ ہے کہ ہندو اور عیسائی ٹائپسٹ تو بآسانی مل جاتے ہیں۔ مگر کوئی اچھا مسلم ٹائپسٹ ابھی تک نہیں ملا۔

یکم اپریل ۱۹۸۴

قدیم لٹریچر تمثیلات سے بھرا ہوا ہے۔ قدیم زمانہ کے علماء اکثر مثالوں کے ذریعہ بات کہا کرتے تھے۔ مگر مثال بذات خود دلیل نہیں۔ مثال پیش کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک وضاحت، دوسرے استدلال پہلی صورت علمی طور پر جائز ہے اور دوسری صورت علمی طور پر جائز نہیں۔

ایک بات جو دوسرے دلائل سے ثابت ہو چکی ہو اس کی مزید وضاحت کے لئے کوئی مثال پیش کرنا درست ہے۔ ایسی مثال اصل دعویٰ کی دلیل نہیں ہوتی وہ اصل دعویٰ کی صرف مزید تشریح ہوتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک دعویٰ کیا جائے اور اس کی دلیل کے طور پر ایک مثال پیش کی جائے۔ مثال کے طور پر وحدت الوجود کا نظریہ۔ اس نظریہ کے پیش کرنے والے ہمیشہ مثالوں کے ذریعہ اس کو ثابت کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک عام مثال سمندر اور قطرہ کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سمندر سمندر ہے اور قطرہ قطرہ۔ مگر قطرہ بھی انتہائی چھوٹی سطح پر سمندر ہی کا ایک حصہ ہے۔

مگر یہ مثال وحدت الوجود کے نظریہ کو ثابت نہیں کرتی۔ یہ مثال صرف اس وقت اصل نظریہ کا ثبوت بنے گی جب کہ اس کے ساتھ یہ بھی ثابت کیا جائے کہ دونوں میں استدلالی ربط ہے۔ مثلاً کوئی ایسی آیت یا حدیث پیش کی جائے جس میں صراحۃً یہ بتایا گیا ہو کہ خالق اور مخلوق کے درمیان وحدت الوجود کا رشتہ ہے اور اس رشتہ کو نظریاتی طور پر قابل فہم بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے سمندر اور قطرہ کی تمثیل دنیا میں قائم کر دی ہے۔ تم سمندر اور قطرہ کو دیکھو اور اس سے وحدت الوجود کے مسئلہ کو سمجھ لو۔

مثال ہمیشہ ایک علیحدہ چیز ہوتی ہے اس کو کسی بھی بات سے جوڑا جا سکتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ تمثیل استدلال کا سب سے کمزور طریقہ ہے :

Analogy is the weakest from of argument.

۲ اپریل ۱۹۸۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بیویاں کیوں کیں، اس کی توجیہ کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں :

"اکمل البشر نے خود اپنی نسبت فرمایا کہ مجھ کو جو جسمانی قوت عطا ہوئی ہے وہ اہل جنت میں سے چالیس مردوں کے برابر ہے۔ جن میں سے ایک مرد کی قوت ایک سو مرد کے برابر ہوگی۔ گویا دنیا کے چار ہزار مردوں کے برابر قوت حضور کو عطا فرمائی گئی تھی۔ اس حساب سے اگر چار ہزار بیویاں آپ کے نکاح میں ہوتیں تو آپ کی قوت کے اعتبار سے اسی درجہ میں شمار کیا جا سکتا تھا جیسے ایک مرد ایک عورت کے ساتھ نکاح کرے۔ لیکن اللہ اکبر، اس شدید ریاضت اور ضبط نفس کا کیا ٹھکانا کہ ۲۵ سال کی عمر اس زہد کی حالت میں گزار دی۔ دنیا کا سب سے بڑا بے مثال انسان جو اپنے فطری قویٰ کے لحاظ سے کم از کم چار ہزار بیویوں کا مستحق ہو، کیا نو کا عدد دیکھ کر کوئی انصاف پسند اس پر کثرت ازدواج کا الزام لگا سکتا ہے" صفحہ ۵۵۰

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت کا یہ کتنا سطحی انداز ہے۔ یہ سطحی انداز کیوں پیدا ہوا۔ اس کی وجہ دعوتی ذہن کا ختم ہونا ہے۔ مسلمان اپنے جذبہ فخر کی تسکین کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد انھیں اس کی فکر نہیں ہوتی کہ دوسروں پر ان کی باتوں کا کیا اثر پڑے گا۔

دعوتی ذہن دوسروں کی رعایت کر کے بولتا ہے، اور فخریہ ذہن اپنے سوا کسی اور کی رعایت کرنا نہیں جانتا۔

۳ اپریل ۱۹۸۴

کسی کا قول ہے : من ابصر عیب نفسہ شغل عن عیب غیرہ (جو شخص اپنے عیب کو دیکھے وہ دوسرے کے عیب کو دیکھنے سے دور رہے گا۔)

دنیا کے اکثر جھگڑے صرف اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ لوگ ہمیشہ دوسروں کے عیب کو دیکھنے میں لگے رہتے ہیں۔ اگر لوگوں میں اپنا عیب دیکھنے کا مزاج آ جائے تو اکثر جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

نیز یہ کہ اپنے عیب کو دیکھنا ہی آخر کار آدمی کے کام آتا ہے۔ اس سے آدمی کی اصلاح ہوتی ہے اور دنیا و آخرت میں اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے کے عیب میں مشغول رہنا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ سے بے خبر ہو جائے۔ وہ دوسروں کے پیچھے اپنے آپ کو کھودے۔

۴ اپریل ۱۹۸۴

قطر (رئاسة الشئون الدينية) سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے:

الحرمان والتخلف في ديار المسلمين

(مسلم ممالک کا پچھڑا پن) اس کتاب میں مختلف اعتبار سے مسلم ملکوں کا تخلف دکھایا گیا ہے۔ اس میں ایک بات یہ کہی گئی ہے:

تقول مصادر الامم المتحدة ان اكثر من نصف سكان بنجلاديش البالغ عددهم ۹۲ مليونا من البشر يعيشون دون مستوى الكفاف۔

اقوام متحدہ کے ذرائع بتاتے ہیں کہ بنگلہ دیش جہاں ۹۲ ملین انسان بستے ہیں اس کی آدھی سے زیادہ آبادی ناگزیر ضروریات سے کم تر سطح پر زندگی گزار رہی ہے۔

موجودہ صدی کے نصف اول میں ہندستان کے مسلم لیڈروں نے نعرہ لگایا کہ مسلمانوں کی بربادی کا سبب ہندو امتیاز ہے، اس لئے ہم کو الگ ملک (پاکستان) چاہئے۔ پاکستان بن گیا تو شیخ مجیب الرحمٰن جیسے لوگ اٹھے۔ انھوں نے کہا کہ سونار بنگلہ (سونے کے بنگلہ ملک) کو پاکستان نے کنگال بنا دیا ہے، اس لئے ہم کو الگ کرو۔ اس کے بعد بنگلہ دیش الگ ملک بن گیا۔ اب حال یہ ہے کہ بنگلہ دیش دنیا کا سب سے برباد ملک ہے۔ سونے کا بنگلہ مٹی کا بنگلہ بن گیا۔

مذکورہ کتاب کے مطابق مجموعی اعتبار سے مسلمان دنیا کی سب سے زیادہ پچھڑی ہوئی قوم ہیں اور ان کے پچھڑے پن کا مزید نقصان یہ ہے کہ عیسائی مشنریاں ان میں اپنے لئے کام کا میدان پا رہی ہیں۔ انڈونیشیا بھی انھیں پسماندہ مسلم ممالک میں سے ہے۔ ۱۹۷۶ میں "جمعیۃ الانجیل" نے دعویٰ کیا تھا کہ انڈونیشیا میں ۴۰۰ ہزار مسلم افراد عیسائی مذہب اختیار کر چکے ہیں۔

۵ اپریل ۱۹۸۴

اصول برتنے کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ اصول کے لئے اصول برتنا۔
۲۔ مفاد کے لئے اصول برتنا۔

ظاہری طور پر دیکھنے میں دونوں یکساں ہیں۔ مگر ظاہری شابہت کے سوا دونوں کے درمیان کوئی مشابہت نہیں۔ اصول کے لئے اصول برتنے والا ہی دراصل اصول پرست ہے۔ مفاد کے لئے اصول برتنے والا صرف مفاد پرست ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

بااصول زندگی قربانی کی زندگی ہے۔ جو شخص مفاد کے لئے اصول برتے وہ گویا اپنی قربانی کی قیمت اسی دنیا میں وصول کر لینا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اصول کے لئے اصول برتتا ہے اگر اس کا محرک رضائے الٰہی ہو، تو وہی وہ شخص ہے جو اپنی قربانی کی قیمت میں آخرت پائے گا۔

۶ اپریل ۱۹۸۴

فرانس میں ایک اصطلاح وضع ہوئی جس کو گال ازم (Degaullism) کہا جاتا تھا۔ یہ اصطلاح فرانس کے سابق حکمراں چارلس ڈیگال (۱۹۷۰ - ۱۸۹۰) کے نام سے لی گئی ہے۔

ڈیگال کو فرانس میں اقتدار ملا تو فرانس یورپ کا ایک کمزور ملک بنا ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ افریقہ میں اس کے مقبوضات میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ اور فرانس کی تمام طاقت ان تحریکوں کو دبانے اور کچلنے میں استعمال ہو رہی تھی۔ ڈیگال کی مثبت پالیسیوں (positive policies) کے لئے یہ صورت حال رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ فرانس نے اپنے (great power) ہونے کی حیثیت کھو دی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ افریقہ کے فرانسیسی مقبوضات کو آزاد کر دے۔ انسائیکلو پیڈیا کے الفاظ میں:

He settled the problem of Algeria when no one else could (7/965)

ڈیگال نے اس وقت الجیریا کے مسئلہ کو حل کر دیا جب کہ کوئی اس کو نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے نتیجے میں ڈیگال پر سخت تنقید یں ہوئیں۔ اس کے اوپر قاتلانہ حملے کئے گئے۔ اگلے الکشن میں اس نے حکومت کھو دی۔ جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے جنازہ میں چند رشتہ داروں کے سوا کوئی شامل نہ تھا۔ گال ازم اپنی قیادت کی قیمت پر ملک و قوم کو زندگی دینا ہے۔ برٹانیکا کے الفاظ یہاں قابل نقل ہیں:

Courage to take the necessary decisions with all the political and personal risks (7/965).

ہر قسم کے سیاسی اور ذاتی خطرات کا اندیشہ مول لے کر ضروری فیصلے کرنے کا حوصلہ۔ ڈیگال نے یہ حوصلہ دکھایا۔ اس نے اپنی قیادت کو ختم کرکے فرانس کو طاقت ور بنا دیا۔

۷ اپریل ۱۹۸۴

کم کی موجودگی زیادہ کی موجودگی کا ثبوت ہے۔ اگر زیادہ نہ پایا جائے تو کم کا پایا جانا بھی ممکن نہیں۔

اگر دنیا میں صرف اتنا ہی پانی ہو جتنا پانی لمبی بارش کے وقت اوپر سے برستا ہے تو زمین پر کبھی بارش نہ ہو سکے۔ تھوڑا پانی اس وقت برستا ہے جب کہ یہاں زیادہ پانی موجود ہو۔ بارش کے بقدر پانی برسنے کے لئے سمندر کے بقدر پانی کا ذخیرہ ہونا ضروری ہے۔

یہ فطرت کا قانون ہے۔ روشن سورج کو ظہور میں لانے کے لئے ایک روشن تر نور کا وجود ضروری ہے۔ پھول کی تخلیق اس وقت ممکن ہے جب کہ یہاں پھول سے زیادہ لطیف اور حسین ہستی موجود ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ محدود دنیا کی موجودگی لامحدود خالق کی موجودگی کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ کائنات خود خدا نہیں ہو سکتی۔ کائنات کا خالق وہی ہو سکتا ہے جو کائنات سے زیادہ عظیم ہو۔

۸ اپریل ۱۹۸۴

سورہ نساء کی آیت نمبر ۴۱ میں ہے: پس اس وقت کیا ہوگا جب ہم ہر ایک امت سے ایک گواہ لائیں گے اور تم کو ان لوگوں کے اوپر گواہ بنائیں گے۔ روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس آیت پر پہنچتے تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے (کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا اتیٰ علیہا فاضت عیناہ)

اس آیت کی تشریح میں مولانا عبد الماجد دریابادی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: جن بے دردوں نے قرآن کو کلام محمدی ٹھہرایا، وہ غور کریں کہ کہیں اپنے گڑھے ہوئے کلام سے بھی انسان کے آنسو جاری ہو سکتے ہیں (تفسیر ماجدی، جلد دوم، صفحہ)

یہ ایک صحیح مقدمہ کی غلط وکالت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ مگر مذکورہ

دلیل خالص علمی اعتبار سے اس کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں۔

آنسو نکلنے کا تعلق اصلاً قلب سے ہے نہ کہ کلام سے۔ کوئی کلام خواہ وہ اپنا ہو یا دوسرے کا، جب آدمی کو لطیف حقائق سے جوڑتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ آنسو حقیقۃً اس معرفت کا نتیجہ ہے جس کا تجربہ مختلف صورتوں میں آدمی کے اوپر گزرتا ہے۔ یہ تجربہ خود اپنے کلام سے بھی ہو سکتا ہے اور دوسرے کے کلام سے بھی۔ میرے اوپر بار بار یہ تجربہ گزرا ہے کہ میں نے اپنی تحریر پڑھی اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔

۹ اپریل ۱۹۸۴

پنڈت جواہر لال نہرو نے آزادی (۱۹۴۷) سے پہلے اپنی آٹو بیاگرافی لکھی۔ اس کا خاتمہ انھوں نے ان الفاظ پر کیا تھا کہ مستقبل میں کیا ہوگا کچھ نہیں معلوم، کتاب زندگی کے اگلے ورق سربمہر ہیں۔

اس کے بعد ہندستان آزاد ہوا اور جواہر لال نہرو کو ملک کا اقتدار حاصل ہو گیا۔ مگر سابقہ صورتحال بدستور باقی رہی۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۰ کو مدراس ایجوکیشن اسوسی ایشن اسکول کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے نہرو نے ملک کے سیاسی اور معاشی مسائل کا ذکر کیا۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۲ دسمبر ۱۹۶۰) کی رپورٹ کے مطابق انھوں نے کہا کہ ہمارے خوابوں کی دنیا جو ابھی قریب نہیں آئی ہے، مگر وہ آکر رہے گی:

One world of our dream, which is still perhaps not nearer, must come.

۲۷ مئی ۱۹۶۴ کو نہرو کا انتقال وزارت عظمیٰ کی کرسی پر ہوا۔ تاہم اپنے خوابوں کی دنیا سے اب بھی وہ اتنا ہی دور تھے جتنا کہ وہ آزادی اور اقتدار پانے سے پہلے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے نہ کہ اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کی جگہ۔ بیشتر انسان اپنی ساری زندگی مایوسی کا شکار رہتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس راز کو سمجھ نہ سکے۔

۱۰ اپریل ۱۹۸۴

سورہ نساء آیت نمبر ۶۹ میں ارشاد ہوا ہے کہ اور جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو ایسے لوگ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا انعام کیا، نبی اور صدیق اور شہید اور صالحین۔ اس آیت کی تشریح میں ایک مفسر قرآن لکھتے ہیں:

"اس اطاعت کا تعلق فرائض و واجبات سے ہے ورنہ اگر فرائض و واجبات کے علاوہ مستحبات، نوافل تطوعات کا بھی اسی قدر اہتمام ہو جائے تو پھر درجۂ ولایت خود ہی حاصل ہو جائے گا" (جلد دوم صفحہ ۸۰)

مفسر کی زبان سے یہ جملہ تصوف کے زیر اثر نکلا ہے جس نے ظواہر اعمال کو حقیقت اعمال کا بدل بنا دیا۔ یہ صحیح نہیں کہ کوئی شخص ان ظاہری اعمال کا اہتمام کرے جس کو عام طور پر مستحبات و نوافل کہا جاتا ہے تو وہ خود بخود ولی ہو جائے گا۔

ولایت دراصل معرفت کا ایک درجہ ہے۔ وہ کسی آدمی کو شعوری سفر کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ مستحبات و نوافل کا کوئی کورس ایسا نہیں جس کو پورا کر کے آدمی خود بخود ولی بن جائے۔

۱۱ اپریل ۱۹۸۴

سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۶ وضو کے بارے میں ہے۔ ابن العربی نے لکھا ہے کہ بعض علمائے کہا ہے کہ اس آیت کے اندر ایک ہزار مسئلے ہیں۔ انھوں نے مزید لکھا ہے کہ کچھ فقہاء مدینۃ السلام میں جمع ہوئے اور اس کا تتبع کیا تو وہ آٹھ سو مسائل تک پہنچے۔ مگر وہ ایک ہزار مسائل معلوم نہ کر سکے۔ (ولقد قال بعض العلماء ان فیھا الف مسئلۃ واجتمع اصحابنا بمدینۃ السلام فتتبعوھا فبلغوھا ثمان مأۃ مسئلۃ ولم یقدروا ان یبلغوھا الالف)

یہ بات میں نے ایک جدید تعلیم یافتہ آدمی کو سنائی تو اس نے ہنس کر کہا:

"جب وضو اتنی پیچیدہ چیز ہے تو نماز کتنی پیچیدہ چیز ہوگی"۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی آیت سے آٹھ سو اور ایک ہزار مسائل نکالنا بیہودہ بات ہے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام "حنیفیت سمحہ" کا نام ہے نہ کہ مسائل ظاہری کی کثرت کا۔

۱۲ اپریل ۱۹۸۴

حق کے داعی کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ یہ تمام کاموں میں سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ یہ دنیا میں خدا کی نمائندگی ہے۔ یہ روح کا اپنے آپ کو خدا کے حوالے کرنا ہے۔ یہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کا گواہ بننا ہے۔

۱۳ اپریل ۱۹۸۴

ٹیگور نے کہا ہے کہ ——— ساری عمر تاروں کو ٹھیک کرنے میں بیت گئی۔ جو انتم گیت

مجھے گانا تھا وہ میں نہ گا سکا۔

ایسا ہی کچھ حال میرا بھی ہے۔ جب بھی میں کوئی کتاب تیار کرتا ہوں تو وہ مجھے ناکافی معلوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو بات کہنی تھی وہ کہنے سے رہ گئی۔ کوئی کتاب بھی جو میں نے لکھی ہے وہ مجھے اپنی نظر میں ایسی نہیں لگتی کہ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں نے کہہ دیا۔

اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ حقیقت کے مقابلہ میں تمام الفاظ محدود ہیں۔ جس شخص کو حقیقت کا ادراک ہوتا ہے اس کو حقیقت کے مقابلہ میں اپنے تمام الفاظ محدود نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے ذخیرہ کے تمام الفاظ کو استعمال کرکے بھی محسوس کرتا ہے کہ حقیقت بیان ہونے سے رہ گئی۔

۱۴ اپریل ۱۹۸۴

مولانا آزاد سبحانی (م ۱۹۵۷) کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کا مشن یہ ہے کہ وہ دنیا میں خلافت الٰہیہ کا نظام قائم کریں۔ اس کو وہ سب سے زیادہ اہم دینی فریضہ سمجھتے تھے۔ حتی کہ ان کا خیال تھا کہ جب بھی دو مسلمان آپس میں ملیں تو ان کو چاہئے کہ اس کی یاد تازہ کرنے کے لئے ایک دوسرے کو اس طرح سلام کریں:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، نحن خلیفۃ اللہ۔

مولانا آزاد سبحانی نے یہ نہیں سوچا کہ "سلام" ایک مسنون فعل ہے۔ اس لئے اس کا وہی طریقہ صحیح ہو سکتا ہے جو سنت رسول اور سنت صحابہ سے ثابت ہو ——— نظریہ سازی آدمی کو سادہ حقیقتوں کو سمجھنے سے بھی محروم کر دیتی ہے۔

۱۵ اپریل ۱۹۸۴

میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ میری محبوب چیزیں تین ہیں ——— گھڑی، قلم، اور مسواک۔

مگر عجیب بات یہ ہے کہ آج تک مجھے اپنی پسند کا قلم نہیں ملا۔ میں نے بے شمار ملکی اور غیر ملکی قلموں کا تجربہ کیا۔ حال میں دبئی سے کراس (Cross) قلم منگوایا۔ مگر کوئی قلم میری پسند پر پورا نہیں اترتا۔

جان محمد صاحب (انگریز نومسلم) قلم کے بارہ میں میری دلچسپی کا حال جانتے تھے۔ وہ لندن سے دہلی آئے تو میرے لئے ایک قلم لائے۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے خاص طور پر تلاش کرکے آکسفورڈ کی ایک دکان سے اسے خریدا ہے۔ مگر اس کو بھی جب میں نے استعمال کیا تو وہ بھی میری پسند کے مطابق نہ تھا۔

جان محمد صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے کہا کہ آپ کو کوئی بھی قلم پسند نہیں آئے گا۔ میں نے کہا کیوں۔ انھوں نے کہا:

"اس لئے کہ آپ perfectionist ہیں"

یہ واقعہ ہے کہ میرے مزاج میں perfection بہت زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی چیز میرے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ کمالیت perfection بہت اچھی چیز ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں اس کا حصول ممکن نہیں۔

۱۶ اپریل ۱۹۸۴

سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۸ میں حکم دیا گیا ہے کہ کسی سے تمہاری دشمنی ہو جائے تب بھی تم اس کے ساتھ بے انصافی نہ کرو۔ اس آیت کی تشریح میں مفسر قرطبی لکھتے ہیں:

دلّت الآیۃ علیٰ ان کفر الکافر لا یمنع من العدل علیہ اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ کافر کا کفر اس سے نہیں روکتا کہ اس کے ساتھ انصاف کا معاملہ کیا جائے۔

وہ اسلام جس کی تعلیم یہ تھی کہ کافر و مشرک سے بھی بے انصافی کا معاملہ نہ کرو، اس اسلام کو ماننے والے آج اپنے دینی بھائیوں سے بھی انصاف کرنا نہیں جانتے۔

۱۷ اپریل ۱۹۸۴

غالباً ۱۹۶۶ کا واقعہ ہے۔ اس وقت میں ندوہ (لکھنؤ) میں تھا۔ ایک مسلم نوجوان قاہرہ سے ڈاکٹریٹ کر کے آئے تھے۔ ندوہ کے لڑکوں نے مجھے بتایا کہ وہ اشتراکیت سے متاثر ہیں۔ اور ہم لوگوں میں اشتراکیت کے حق میں تقریر کرتے رہتے ہیں مگر ہم لوگ ان کا توڑ نہیں کر پاتے۔ اجازت دیجئے تو ان کو آپ کے پاس لے آئیں۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، لے آیئے۔

اس کے بعد ایک روز رات کو ندوہ کے لڑکے مذکورہ "ڈاکٹر صاحب" کو لے کر میرے پاس آئے۔ گفتگو شروع ہوئی۔ ابھی انھوں نے اشتراکیت کی تبلیغ میں کچھ نہیں کہا تھا۔ میں نے آغاز کرتے ہوئے کہا:

"میں نے اشتراکیت کو سمجھنے کے لئے دس ہزار صفحات پڑھے ہیں" میرے اس جملہ کے بعد مذکورہ ڈاکٹر صاحب کا عجیب حال ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے اشتراکیت کے موضوع پر ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ

ادھر اُدھر کی بات کرتے رہے اور اس کے بعد چلے گئے۔

بعد کو ندوہ کے لڑکوں نے کہا کہ یہ تو بڑا عجیب ماجرا ہوا۔ ہم لوگوں سے تو جب بھی وہ ملتے تھے صرف اشتراکیت ہی کے موضوع پر بات کرتے تھے۔ اور آپ سے ملے تو وہ اشتراکیت کے موضوع پر ایک لفظ بھی نہیں بولے۔

۱۸ اپریل ۱۹۸۴

ایک فرنیچر ساز کمپنی کی گاڑی سڑک پر آکر کھڑی ہوئی۔ وہ اپنی کمپنی کا اشتہار کر رہی تھی۔ گاڑی کے اوپر جلی حروف میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

We treat your furniture like our own

ہم آپ کے فرنیچر کے ساتھ اپنے فرنیچر جیسا معاملہ کرتے ہیں۔

تاجر کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ گاہک کو یقین دلائے کہ وہ اس کے معاملہ کو اپنا معاملہ سمجھتا ہے۔ وہ اس کو جو چیز دے گا اس طرح دے گا گویا کہ وہ خود اپنے گھر کے لئے وہ چیز فراہم کر رہا ہے۔

تاجر اور گاہک کے درمیان اس قسم کا اعتماد قائم ہونا تجارت کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ یہی معاملہ دعوت کا بھی ہے۔ دعوت کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان گہرے اعتماد کی فضا قائم ہو جائے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن میں پیغمبروں کی زبان سے اپنے مخاطبین کے لئے یہ کہلایا گیا ہے کہ: اِنّی لکم ناصح امین (میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور تمہارا امین ہوں۔)

۱۹ اپریل ۱۹۸۴

ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے:

When we hate our enemies, we give them power over us - power over our sleep, our appetites and our happiness. They would dance with joy, if they knew how much they were worrying us. Our hate is not hurting them at all, but it is turning our own days and nights into hellish turmoil.

جب ہم اپنے دشمنوں سے نفرت کرتے ہیں تو ہم ان کو اپنے اوپر غلبہ دے دیتے ہیں، غلبہ اپنی نیند پر، اپنی اشتہا اور اپنی خوشی پر۔ وہ خوشی سے ناچیں اگر وہ جان لیں کہ وہ ہم کو کتنا زیادہ پریشان کر رہے

ہیں۔ ہماری نفرت ان کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچاتی۔ البتہ وہ ہمارے دلوں اور راتوں کو جہنمی عذاب میں تبدیل کر رہی ہے۔

دوسروں سے نفرت کرنا خود اپنے آپ سے نفرت کرنا ہے۔ اور دوسروں سے محبت کرنا خود اپنے آپ سے محبت کرنا۔

۲۰ اپریل ۱۹۸۴

میری پوری زندگی میں سب سے زیادہ نمایاں طور پر جو چیز چھائی رہی وہ ہے غیر مصالحانہ رویہ (uncompromising attitude) اپنے رشتہ داروں کے ساتھ، اپنے دوستوں کے ساتھ، جماعت اسلامی، ندوہ، جمعیۃ علماء، جس سے بھی میرا واسطہ پڑا ہر ایک کے ساتھ میرا رویہ غیر مصالحانہ رہا۔

اس غیر مصالحانہ رویہ کی مجھے بہت بھاری قیمت دینی پڑی۔ میری ہڈیاں پگھل گئیں اور میں قبل از وقت بوڑھا ہو گیا۔ میری زندگی میں ایسے لمحات آئے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اگلے دن میں کیا کھاؤں گا اور اپنے بچوں کو کیا کھلاؤں گا۔ مگر میرا غیر مصالحانہ رویہ بدستور باقی رہا۔

مگر عجیب بات ہے کہ میرے بے شمار جاننے والوں میں سے کوئی ایک شخص بھی نہیں ہے جو یہ کہہ سکے کہ میں نے اس کو غیر مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہو۔ میں نے خود ہمیشہ غیر مصالحانہ رویہ اختیار کیا۔ مگر دوسروں کو میں نے ہمیشہ یہ مشورہ دیا کہ تم مصالحت کا طریقہ اختیار کرو۔

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ جس چیز کو میں اپنے لئے صحیح سمجھتا تھا وہ میرے نزدیک دوسروں کے لئے غلط تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بے حد مشکل راستہ ہے۔ غالباً اس دنیا میں غیر مصالحانہ رویہ سے زیادہ دشوار اور کوئی کام نہیں۔

۲۱ اپریل ۱۹۸۴

تصوف کی تاریخ لکھنے والے تصوف کی تاریخ کو دور تابعین سے شروع کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ابن سیرین تابعی (۱۱۰ - ۳۳ھ) پہلے صوفی تھے۔ اسی طرح ابو حازم (م ۱۴۰ھ) فضیل بن عیاض (م ۱۸۷) بشر حافی (م ۲۲۷) وغیرہ۔ مگر ان لوگوں کا "تصوف" صرف یہ تھا کہ وہ زہد میں غلو کرتے تھے اور دنیوی چیزوں سے الگ رہنا پسند کرتے تھے۔

اس کے بعد تصوف کی فہرست میں جن لوگوں کا نام لیا جاتا ہے ان میں سے مثلاً ذوالنون مصری (م ۲۴۶ھ)

ہیں جنھوں نے قِدَم قرآن کا عقیدہ پیش کیا۔ بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) ہیں جن کی طرف وحدت الوجود کا نظریہ منسوب کیا جاتا ہے۔ ابوسعید الخراز (م ۲۷۹ھ) ہیں، جنھوں کے فنا اور بقا کے بارہ میں بعض خیالات پیش کئے۔ منصور الحلاج (م ۳۰۹ھ) ہیں جنھوں نے حلول کے نظریہ کی تبلیغ کی۔ مگر اس قسم کے لوگوں کا تصوف بھی صرف یہ تھا کہ انھوں نے عقیدہ اور روحانیت کے سلسلے میں بعض نئی باتیں کہیں۔ یہ لوگ اپنے ذہن کے مطابق دین کی معنویت پر زور دے رہے تھے۔ وہ اس معنویت کے حصول کے لئے متصوفانہ طریقے پیش نہیں کرتے تھے۔

تصوف کا آغاز کرنے والے حقیقۃً وہ لوگ ہیں جنھوں نے روحانیت اور تعلق باللہ کے حصول کے لئے نئے طریقے وضع کئے۔ یہ لوگ دور اول میں موجود نہ تھے۔ متصوفین کو جو چیز دوسروں سے الگ کرتی ہے وہ صرف روحانیت کی باتیں نہیں ہیں۔ بلکہ دراصل وہ طریقے اور تدبیریں ہیں جو انھوں نے یہ کہہ کر وضع کئے کہ اس کے ذریعہ روحانی مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یا اس مقصد کو حاصل کرنے کا یہ زیادہ آسان اور قریبی طریقہ ہے۔

۲۲ اپریل ۱۹۸۴

فریڈرک اعظم (Frederick the Great) کا قول ہے:

A crown is merely a hat that lets the rain in.

تاج صرف ایک ایسا ہیٹ ہے جو بارش کو اندر آنے دیتا ہے۔

ہیٹ عام آدمی کی ٹوپی ہے اور تاج بادشاہ کی ٹوپی۔ عام آدمی سے لوگوں کو کوئی جلن نہیں ہوتی۔ مگر جو شخص لوگوں کو اپنے سے بڑا دکھائی دے اس سے وہ جلنے لگتے ہیں۔ "ہیٹ" آدمی کو بارش سے بچاتا ہے۔ مگر "تاج" بارش کو دعوت دیتا ہے۔

زندگی میں شاید سب سے بڑی برائی یہی جلن ہے۔ آدمی کی انا کسی کو اپنے سے اونچا دیکھنا نہیں چاہتی۔ اس لئے آدمی ہر اس شخص کا دشمن بن جاتا ہے جو ماحول میں اس سے اونچا درجہ حاصل کرلے۔

مگر یہ نہایت بے فائدہ حرکت ہے۔ جس شخص کو کوئی بڑائی ملتی ہے اس کو وہ خدا کے دئے سے ملتی ہے۔ ایسی حالت میں کسی کی بڑائی پر جلنا گویا خدا کی تقسیم پر اعتراض کرنا ہے۔ اور کسی کو اس کے مقام سے نیچے لانے کی کوشش کرنا گویا خدا کے کئے کی نفی کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ــــ خدا نے چاہا مگر

انسان نے نہ چاہا۔ ایسا چاہنا جرم بھی ہے اور ناقابل حصول بھی۔

۲۳ اپریل ۱۹۸۴

ہندستان میں مراکش کے سابق سفیر عبدالحق سعدانی نے ایک بار ایک بیان جاری کیا۔ اس میں انھوں نے ایک چھپے ہوئے ہاتھ (Hidden hand) کی نشاندہی کی تھی جو ہندستان میں ہمارے مسلم بھائیوں کے خاتمہ (Exterminations of our brother Muslims in India) پر تلا ہوا ہے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۲۷ مئی ۱۹۷۹) یہ بیان دلی کے اخبارات میں چھپا تو اسی دن مراکشی سفیر کو ہندستان کے وزارت خارجہ کے دفتر میں بلایا گیا۔ ان کو تنبیہہ کی گئی کہ آپ کا بیان ہندستان کے داخلی امور سے متعلق ہے اور اس بنا پر سفارتی آداب کے بالکل خلاف ہے۔ چنانچہ اگلے ہی دن ۲۸ مئی ۱۹۷۹ء کے اخبار میں پہلے صفحہ پر یہ سرخی تھی:

Moroccan envoy apologizes for statement.

مراکشی سفیر عبدالحق سعدانی نے اپنے الفاظ میں سنجیدہ معذرت (Sincere apology) کے ساتھ دوسرا بیان شائع کیا جس میں سابقہ بیان کو واپس لے لیا گیا تھا۔ پہلے بیان میں مسٹر سعدانی نے کہا تھا کہ عرب سفیروں کی اکثریت اس احساس میں ان کے ساتھ ہے مگر دوسرے بیان میں انھوں نے اقرار کیا کہ یہ بات میں نے ذاتی طور پر کہی تھی۔

ایسا اقدام جس کو فوراً واپس لینا پڑے وہ صرف آدمی کی نادانی کا اشتہار ہے نہ کہ حقیقۃً کوئی اقدام۔ مزید ملاحظہ ہو۔

۲۴ اپریل ۱۹۸۴

جمعیۃ علماء ہند نے جولائی ۱۹۷۹ میں "ملک وملت بچاؤ" کی مہم چلائی تھی۔ اس کے تحت ہر روز ۵۱ افراد نئی دہلی کے بوٹ کلب پر گرفتاریاں دیتے تھے۔ مگر ملک وملت بچاؤ کی یہ مہم نہ صرف یہ کہ ملک وملت بچانے میں ناکام رہی بلکہ ملک اور ملت دونوں اس واقعہ سے بھی بے خبر ہے کہ کچھ لوگ "سر پر کفن باندھ کر" اس کو بچانے کے لئے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔

"آل انڈیا ریڈیو نے اپنے نیوز بلیٹن میں اس واقعہ کی کوئی خبر نہ دی۔ اس پر روزنامہ الجمعیۃ نے اپنے ایڈیٹوریل میں لکھا:

"اس ملک میں تقریباً دس کروڑ مسلمان ہیں۔ کیا ایک کروڑ ریڈیو سٹ مسلمانوں کے یہاں نہ ہوں گے۔ اگر ہوں گے اور امکان ہے کہ ہوں گے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمان ۲۰ کروڑ روپیہ سرکار کو صرف ریڈیو لائسنس کی صورت میں سالانہ ادا کرتے ہیں۔ بجلی اور ریڈیو سیٹ کی بڑی پرسیل ٹیکس اور دوسرے ٹیکسوں کی صورت میں جو رقم ان کی جیب سے نکلتی ہے وہ الگ رہی۔" الجمعیۃ ۱۱ جولائی ۱۹۷۹ء

جمعیۃ علماء ہند نے "ملک وملت بچاؤ" کی مہم دوسری بار ۲۱ فروری ۱۹۸۲ سے شروع کرنے کا اعلان کیا۔ مگر وہ عجیب وغریب طور پر اتنی کامیاب ثابت ہوئی کہ شروع ہوتے ہی ختم ہوگئی۔

مذکورہ شکایت میں اس وقت وزن ہو سکتا تھا جب کہ مسلمان ریڈیو استعمال کرنے والوں کی طرف سے ایک کروڑ خط آل انڈیا ریڈیو کے دفتر میں پہنچ جاتے۔ موجودہ حالت میں اس شکایت کا مطلب یہ ہے کہ خود مسلمانوں کو بھی اس "تاریخ ساز" واقعہ کی اطلاع نہ ہو سکی تو کہ ریڈیو اور دوسرے قومی شعبے اس کو جانیں۔

۲۵ اپریل ۱۹۸۴

روس کے سابق ڈکٹیٹر مارشل اسٹالن (۱۸۷۹ - ۱۹۵۳) کے آخری دنوں میں روسی اخبار پراودا میں گنا گیا تو صرف ایک اشاعت میں اسٹالن کا نام ۲۹ بار چھپا تھا۔ اسی طرح چینی ڈکٹیٹر ماؤزے تنگ کی زندگی میں ۱۹۶۶ میں ایک شخص نے ایک بار چینی اخبار (People's Daily) میں گنا تو اس کی صرف ایک اشاعت میں ماؤزے تنگ کا نام ۲۸۰ بار چھپا ہوا موجود تھا۔

آج جب کہ اسٹالن اور ماؤ مر چکے ہیں، ان کے ملکوں میں کوئی ان کا نام لینے والا نہیں۔ پراودا اور پیپلز ڈیلی بدستور چھپ رہے ہیں، مگر مہینوں گزر جاتے ہیں اور ان کے صفحات میں ایک بار بھی اسٹالن یا ماؤ کا نام نہیں آتا۔

یہی اس دنیا میں ہر ڈکٹیٹر کا انجام ہوتا ہے۔ ڈکٹیٹر اپنی زندگی میں اپنے ملک میں سب کچھ نظر آتا ہے۔ مگر مرنے کے بعد وہ اسی ملک میں بالکل بے کچھ ہو جاتا ہے۔

۲۶ اپریل ۱۹۸۴

افریقہ میں اسلام کی تیز رفتار اشاعت کا سبب کیا ہے۔ اس سلسلہ میں لندن سے شائع ہونے والی ایک انسائیکلو پیڈیا میں حسب ذیل الفاظ لکھے گئے ہیں:

اسلام کی اشاعت زیادہ تر مسیحیت کی قیمت پر حاصل ہوئی ہے۔ اکثر افریقیوں کے نزدیک مسیحیت امپیریلزم کے ہم معنی ہے۔ اور وہ رنگ کی بنیاد پر امتیاز کی حامل ہے جس کو سفید اقوام نے قائم کر رکھا ہے:

Much of Islam's expansion has been won at the cost of Christianity which, for many Africans is too closely identified with the imperialism and colour prejudices of the white races who had imposed it. p. 404.
Charles F. Adams, *Man and his Gods*, London 1974.

جزئی طور پر یہ بھی ایک سبب ہو سکتا ہے۔ مگر یہی اصل سبب نہیں ہے۔ اصل سبب ہے ——— توحید کے عقیدہ کا فطرت انسانی کے مطابق ہونا اور تمام انسانوں کو یکساں حیثیت ملنا۔

۲۷ اپریل ۱۹۸۴

مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴ - ۱۸۵۷) اپنی آخر عمر میں مسلمانوں کا گروکل بنانا چاہتے تھے۔ جس میں آریہ اپدیشکوں کی طرح مسلم نوجوانوں کو اسلام کی تبلیغ کے لئے تیار کیا جائے۔ انھوں نے ندوہ میں، جب کہ وہ اس کے معتمد تعلیمات تھے، خدام دین کے نام سے ایک مجلس بھی بنائی تھی۔ اس کے تحت کئی لڑکے ایسے تیار ہو گئے تھے جو ہندی اور سنسکرت میں تقریر کرنے لگے تھے۔ ندوہ کے ایک اجلاس میں ان تربیت یافتہ لڑکوں نے ہندی اور سنسکرت میں اسلام کی حمایت میں تقریریں کیں تو لوگوں کو کافی حیرت ہوئی۔

مگر مولانا شبلی کی یہ اسکیم کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محض وقتی دفاع کے جذبہ سے ابھری تھی نہ کہ مستقل دعوتی جذبہ کے تحت۔ مولانا شبلی کے زمانہ میں ہندستان کے بعض علاقوں میں آریہ مبلغین اپنا مذہب پھیلا رہے تھے اور یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ بہت سے جاہل مسلمان ان کی باتوں سے متاثر ہو کر اپنا مذہب بدل دیں گے۔ اس صورت حال نے مولانا شبلی کے اندر حمیت کا جذبہ ابھارا۔ اور انھوں نے چاہا کہ متاثر علاقوں میں تربیت یافتہ مبلغین کو بھیج کر آریہ سماجیوں کا توڑ کیا جائے۔

داعی وہ ہے جو انذار و تبشیر کے جذبہ سے بے تاب ہو کر اٹھے۔ عیسائی مشنریوں اور آریہ مبلغوں کے توڑ کے لئے اٹھنا حقیقۃً قوم پرستی ہے نہ کہ دعوت الی اللہ۔

۲۸ اپریل ۱۹۸۴

مدھو کشور (ایڈیٹر منشی) نے ٹائمس آف انڈیا میں ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں وہ کہتی ہیں کہ آج تعدد ازواج، زبانی طلاق اور پردہ یہ وہ چیزیں ہیں جن کو ہندو یہ ثابت کرنے کے لئے پیش

کرتے ہیں کہ مسلمان اور اسلام کس قدر پس ماندہ اور وحشی ہیں:

Today, polygamy, verbal divorce, and purdah are sighted by Hindus to prove how backward and barbaric Muslims and Islam are.

یہ اعتراضات سراسر بے بنیاد ہیں۔ تعدد ازواج ایک فطری ضرورت ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ آج بھی وہ کسی نہ کسی شکل میں تمام دنیا میں پایا جاتا ہے۔ کہیں فری سکس کی صورت میں اور کہیں کئی شادیوں کی صورت میں۔ حتی کہ ۱۹۷۵ میں ہندستان میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی جس کا نام تھا:

Committee on the status of women in India.

اس کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ہندوؤں میں تعدد ازواج کے واقعات ۵/۸ فیصد ہیں اور مسلمانوں میں ۵/۷ فیصد۔ یعنی مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں میں زیادہ۔ اسی طرح اسلام میں طلاق کا آسان ہونا انتہائی فطری ہے۔ ہندو سوسائٹی میں طلاق کو مشکل بنایا گیا ہے جس کی قیمت اس کو خواتین کی خودسوزی کی شکل میں دینی پڑتی ہے۔ اسی طرح پردہ بھی عین فطری ہے۔ پردہ کے معنی حقیقۃً عورتوں اور مردوں کے درمیان سرگرمیوں کے دائرہ کی تقسیم ہے اور دونوں صنفوں کے درمیانہ آزادانہ اختلاط کو روکنا ہے علمی تحقیق اور تجربہ دونوں بہتر معاشرہ کے لئے اس کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں۔

۲۹ اپریل ۱۹۸۴

روزنامہ الجمعیۃ (۱۰ فروری ۱۹۸۳) میں حکیم ظل الرحمٰن صاحب کا ایک مضمون چھپا تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں حسب ذیل پرجوش الفاظ لکھے تھے:

"وہ کون عقلمند تھا جس نے کروڑوں انسانوں کی تعداد پر اقلیت کا اطلاق کیا۔ عربی کا ایک لفظ قلیل ہے جس کا صیغہ تفضیل اقل ہے۔ جس کے معنی بہت ہی تھوڑے کے ہوتے ہیں۔ ہمارے علماء کی خاموشی نے اس لفظ کا اطلاق مسلمانوں پر کر دیا جس کے نتیجے میں ۱۲ کروڑ کی تعداد کا ایک طبقہ اس احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا کہ ہم اقلیت میں ہیں۔ اور ناقابل شمار چیز ہیں۔ مگر مسلمان ملک کی ثانوی اکثریت ہیں۔ خدارا اقلیت کے لفظ کو امت مسلمہ کی تاریخ سے نکال دیجئے۔ اور اپنے آپ کو ملک کی ثانوی اکثریت کہنے کی عادت ڈالئے۔ بلاشبہ عیسائی، سکھ اس ملک کی اقلیت شمار ہو سکتے ہیں لیکن مسلمان اس ملک کی اقلیت نہیں ہیں۔ ہم اس ملک کی ثانوی اکثریت ہیں" (الجمعیۃ ۱۰ فروری ۱۹۸۳)

مسلمانوں کا اصل مرض ان کا جھوٹا فخر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شکست کو بھی فتح کے خانہ میں لکھنا چاہتے ہیں اور اپنی کمی کو بھی زیادتی کے الفاظ میں بیان کرکے خوش ہوتے ہیں۔

" اقلیت " ایک جمہوری اصطلاح ہے۔ اس سے مراد نسبتی تعداد ہے نہ کہ مطلق تعداد۔ نسبتی تعداد کے اعتبار سے کبھی بارہ آدمی بھی اکثریت میں ہوجاتے ہیں اور کبھی ۱۲ کرور آدمی اقلیت میں۔ اسی غیر حقیقت پسندانہ انداز فکر کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان اپنی تعداد ۱۲ کروڑ اور ۲۰ کرور بتاتے ہیں۔ حالانکہ اس کے لئے ان کے پاس کوئی واقعی دلیل نہیں۔

۲۰ اپریل ۱۹۸۴

ٹی۔ ایس ایلیٹ نے کہا ہے ——— "اگر تم کسی گول چھید میں جا پڑو تو تمھیں اپنے آپ کو گیند بنا لینا چاہئے"۔ یہ زندگی کا نہایت قیمتی گر ہے۔ آدمی اگر اس کو پکڑ لے تو وہ موجودہ دنیا میں اس کی کامیابی کے لئے کافی ہوجائے۔

تاہم موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں سب سے کم جو صفت پائی جاتی ہے وہ یہی ہے۔ اس کی وجہ مسلمانوں کے وہ نادان لیڈر ہیں جو بے معنی الفاظ بول کر مسلمانوں کے ذہن کو بگاڑتے ہیں۔ مسلم لیڈروں کی فوج کی فوج بے سمجھے بوجھے پرجوش انداز میں یہ الفاظ دہراتی ہے: زمانہ باتو نسازد تو باز مانہ ستیز۔ حالانکہ خود ان لیڈروں کا یہ حال ہے کہ انھوں نے اولاً یہ نعرہ لگایا:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

اس کے بعد جب انھوں نے دیکھا کہ سارے ملک پر وہ اپنا جھنڈا نہیں لہرا سکتے تو انھوں نے یہ تجویز کیا کہ ملک کا ایک حصہ (جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے) ہمیں بانٹ کر دے دیا جائے۔ گویا "گول خانہ" کو اپنے لحاظ سے چوکھنٹا کرنے کے حالات نہیں تھے تو انھوں نے خود اپنے آپ کو گول کر لیا۔

یکم مئی ۱۹۸۴

میرٹھ کے شاہ گھاٹ میں ایک چبوترے کا جھگڑا تھا۔ وہاں ایک قبر ہے اور ایک پیپل کا درخت۔ ہندوؤں نے پیپل کو بنیاد بنا کر اس کو مندر کی حیثیت دینے کی کوشش کی۔ اور مسلمانوں نے قبر کو بنیاد بنا کر یہ دعویٰ کیا کہ یہ ہمارے بزرگ کا مزار ہے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ وہ اس قبر پر چادر چڑھائیں گے اور رسوم ادا کریں گے۔

جھگڑا بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ ۶ ستمبر اور ۷ ستمبر ۱۹۸۲ کی درمیانی رات کو مسلمانوں نے وہاں کے ایک پجاری کو قتل کر دیا۔ ۷ ستمبر ۱۹۸۲ کی صبح کو جب پجاری کے قتل کی خبر مشہور ہوئی تو شہر میں ہندو مسلم فساد کی آگ بھڑک اٹھی اور سارا شہر اس کی لپیٹ میں آگیا۔

اس فساد کا ایک طرفہ نقصان صرف مسلمانوں کو ہوا۔ بیسیوں مسلمان مارے گئے۔ ہزاروں گھر لوٹے اور جلائے گئے۔ کروروں روپیہ کا مالی نقصان ہوا۔ (الجمعیۃ ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۲)

ہندستان کے تمام ہندو مسلم فسادات کم و بیش اسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان کا خلاصہ صرف ایک ہے۔ چھوٹے نقصان کو برداشت نہ کرنا اور اس کے نتیجہ میں زیادہ بڑا نقصان سامنے آنا۔

۲ مئی ۱۹۸۴

اے بی نوبل (۱۸۹۶-۱۸۳۳) وہ شخص ہے جس کے نام پر مشہور نوبل انعام دیا جاتا ہے۔ وہ نئی نئی چیز ایجاد کرنے کی خاص صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ روانی کے ساتھ انگریزی، فرنچ، جرمن، رشین اور سویڈش زبانیں بول سکتا تھا۔ اس نے ڈائنا مائیٹ اور دوسری چیزیں ایجاد کیں۔ اس سلسلہ میں اس کی فیکٹری میں ۱۸۶۴ میں ایک سخت دھماکہ ہوا جس میں اس کا بھائی مر گیا۔ وہ ہر وقت نئی چیزیں دریافت کرنے کی دھن میں لگا رہتا تھا، یہاں تک کہ اس کو لوگ دیوانہ سائنس داں (mad scientist) کہنے لگے۔

سائنس کا میدان ہو یا مذہب کا میدان، ہر میدان میں کوئی قابل ذکر چیز پانے کے لئے دیوانہ بننا پڑتا ہے۔ "میڈ سائنٹسٹ" ہی کوئی نئی چیز دریافت کرتا ہے۔

نوبیل کی بعض دریافتوں کو اتفاقی دریافت (chance discovery) کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ کسی اور چیز پر تحقیق کر رہا تھا اور اتفاقاً کوئی اور چیز اس پر منکشف ہو گئی۔ مگر یہاں وہی الفاظ صادق آتے ہیں جو نوبیل انعام یافتہ ڈاکٹر رمن نے کہے تھے: یہ دریافت اگرچہ ایک اتفاق تھی مگر ایسا اتفاق صرف سائنس داں کو پیش آتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی نئی چیز دریافت کرنے کے لئے آدمی کو دیوانہ بننا پڑتا ہے خواہ وہ روحانیت کا میدان ہو یا طبیعیات کا میدان۔ دیوانگی کی حد تک کسی راہ میں لگے بغیر کوئی بڑی چیز کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔

۳ مئی ۱۹۸۴

ایک حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں اپنے کسی بندے کو مصیبت میں ڈالتا ہوں اور وہ اس پر صبر کرتا ہے تو میں اس کے گوشت کو زیادہ بہتر گوشت سے بدل دیتا ہوں اور اس کے خون کو زیادہ بہتر خون سے بدل دیتا ہوں (دمہ من خیر دم ولحمہ من خیر لحم)

صبر کیا ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی اس سمائی (capacity) کا ثبوت دے کہ وہ مشکلات و مصائب کو برداشت کر سکتا ہے۔ جو شخص ردعمل کی نفسیات میں مبتلا ہوئے بغیر مشکلات و مسائل کو برداشت کرلے تو اس کے اندر سے ایک نیا انسان ظہور (emerge) کرتا ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ اونچا انسان بن جاتا ہے۔

موجودہ دنیا میں روحانی ارتقاء کا ذریعہ صبر ہے۔ آدمی اگر ناخوشگواریوں پر صبر نہ کرے تو وہ نفسیاتی اعتبار سے پستی میں گر جاتا ہے۔ اور اگر وہ صبر کرلے تو وہ نفسیاتی اعتبار سے بلند ہو جاتا ہے۔ صبر اس دنیا میں ہر قسم کی اعلیٰ ترقیوں کا واحد زینہ ہے۔

۴ مئی ۱۹۸۴

اپریل ۱۹۷۷ کے ہندستانی الکشن میں جنتا پارٹی کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ جنتا پارٹی نے مسٹر مرارجی ڈیسائی کو اپنا پارٹی لیڈر چنا۔ اس کے بعد رام لیلا گراؤنڈ میں جنتا پارٹی کا بہت بڑا جلسہ ہوا۔ میں بھی اس جلسہ میں شریک تھا۔ اس جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر مرارجی ڈیسائی نے کہا:

"میں کوئی غلطی کروں تو آپ میرا کان پکڑ سکتے ہیں۔"

جنتا حکومت میں مسٹر چرن سنگھ وزیر داخلہ تھے۔ بعد کو انھوں نے اپنے ایک بیان میں بتایا کہ مارچ ۱۹۷۸ میں انھوں نے وزیر اعظم مسٹر مرارجی ڈیسائی سے کہا کہ آپ کے لڑکے کانتی ڈیسائی کے بارے میں کرپشن کی شکایات ہیں۔ اس کی باقاعدہ انکوائری کرائی جانی چاہئے اور اس کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا جانا چاہئے۔ (ٹائمس آف انڈیا ۶ جولائی ۱۹۷۸ء)

اس کے جواب میں مسٹر مرارجی ڈیسائی خفا ہوگئے۔ باہمی اختلاف یہاں تک بڑھا کہ جولائی ۱۹۷۸ میں مسٹر ڈیسائی نے مسٹر چرن سنگھ سے استعفا کا مطالبہ کیا۔ دونوں میں سخت رنجش پیدا ہوگئی۔ مسٹر اٹل بہاری واجپئی کے بیان کے مطابق ڈیسائی، چرن سنگھ ملاقات اس لئے نہ ہو سکی کہ مسٹر ڈیسائی کا

اصرار تھا کہ چرن سنگھ میرے یہاں آکر ملیں۔ یہ کشمکش یہاں تک بڑھی کہ جنتا حکومت ختم ہوگئی۔

(ٹائمس آف انڈیا ۸ جولائی ۱۹۷۸ء)

لفظوں میں کان پکڑوانا کتنا آسان ہے اور عمل میں کان پکڑوانا کتنا مشکل۔

۵ مئی ۱۹۸۴

ایک انگریزی اخبار کے اڈیٹر کی بعض باتوں سے اس کے دوستوں کو شبہ ہوا کہ وہ صحافت کی زندگی سے الگ ہونے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے پوچھا۔ کیا آپ صحافت سے ریٹائر ہونا چاہتے ہیں۔ اڈیٹر نے جواب دیا:

No, I will only retire at Nigambodh Ghat or Chandanwadi.

نہیں میں صرف نگم بودھ گھاٹ یا چندن واڑی پر ریٹائر ہوں گا (ہندستان ٹائمس ۹ جنوری ۱۹۸۴) اسی طرح ایک اڈیٹر صاحب نے ایک بار لکھا تھا: میں جہنم میں نہیں جاؤں گا، کیوں کہ وہاں بھیڑ ہوگی اور مجھے جنت میں جانا پسند نہیں، کیوں کہ وہاں سناٹا ہوگا۔

اس طرح کی باتیں اکثر لوگ مختلف شکلوں میں کرتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جنت اور جہنم کے بارہ میں سنجیدہ نہیں۔ اگر وہ جہنم کی آگ کے بارہ میں اسی طرح سنجیدہ ہوں جس طرح وہ دنیا میں ایک جلتے ہوئے الاؤ کے بارہ میں سنجیدہ ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ جنت کے عیش کو اسی طرح اہمیت دیں جس طرح وہ دنیا کے عیش کو اہمیت دیتے ہیں تو کبھی ان کی زبان سے ایسے الفاظ نہ نکلیں۔

۶ مئی ۱۹۸۴

کشمیر کے قانون کے مطابق کوئی باہر کا آدمی کشمیر میں زمین اور جائداد کا مالک نہیں ہوسکتا۔ یہ قانون وہاں مہاراجہ کے زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ یہی قانون ہے جس نے کشمیر میں بوٹ ہاؤس کو رواج دیا جو کشمیر کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔

۱۸۸۸ میں ایک انگریز سری نگر آیا۔ اس کو سرینگر بہت پسند آگیا۔ اس نے چاہا کہ وہاں مستقل قیام کرے۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ یہاں وہ ذاتی مکان نہیں بنا سکتا تو اس نے سرینگر میں قیام کے لئے یہ تدبیر نکالی کہ وہ کشتی میں مکان بنا کر اس کو پانی پر تیرا دے۔ اور پھر اس کے اندر رہے۔ یہی چیز بعد کو بوٹ ہاؤس کے نام سے مشہور ہوئی۔ مذکورہ انگریز کا نام کنارڈ (M.T.Kennard) تھا۔ اس نے

اپنی اس کشتی کے مکان کا نام وکٹری رکھا۔ اور اس کو دریائے جہلم کے پانی میں تیرا دیا۔

انسان جب دل سے کسی چیز کو چاہتا ہے تو اس کے لئے وہ ہر حال میں کوئی راستہ نکال لیتا ہے خواہ بظاہر وہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ معلوم ہوتا ہو۔

۷ مئی ۱۹۸۴

۱۷ویں صدی عیسوی میں تین بڑی مسلم حکومتیں تھیں۔ ترکی کی عثمانی خلافت، ہندستان کے مغل، فارس کی ایرانی حکومت۔ اس کے بعد ان ملکوں میں مغربی قوموں کا تدخل شروع ہوا۔ ۱۸۵۰ء تک مذکورہ تینوں مسلم طاقتیں یورپ کے زیر اقتدار آچکی تھیں۔ اسی طرح انڈونیشیا ڈچ کے قبضہ میں، ملیشیا انگریز کے قبضہ میں، الجیریا وغیرہ فرانس کے قبضہ میں چلا گیا۔

اس کے بعد تمام مسلم دنیا میں ردعمل شروع ہوا۔ ہر جگہ لوگ کسی نہ کسی شکل میں بیرونی حکمرانوں کے خلاف لڑنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ مگر یہ تمام لڑائیاں بس اس طرح پیش آئیں کہ مسلمان جس حال میں تھے اسی حال میں وہ مغربی اقوام سے لڑنے لگے۔ اس پوری مدت میں کوئی ایک بھی قابل ذکر مثال نہیں ملتی کہ مسلم ذمہ داروں کا کوئی وفد یورپ جائے اور وہاں سنجیدہ طور پر یہ جاننے کی کوشش کرے کہ یورپی قوموں کی اس طاقت کا راز کیا ہے کہ وہ اپنے ملکوں سے نکل کر ساری دنیا پر قابض ہو گئی ہیں۔

مسلمان محض جوش کے تحت لڑائی لڑتے رہے۔ انھوں نے اپنے ہوش کو استعمال کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ جدید تاریخ میں گاندھی پہلے لیڈر ہیں جنھوں نے نوآبادیاتی طاقتوں کے مقابلہ میں ہوش کا ہتھیار استعمال کیا۔

۸ مئی ۱۹۸۴

بائبل اور تلمود سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام "موسیٰ" فرعون کے گھر میں رکھا گیا تھا۔ فرعون اور اس کی بیوی جب حضرت موسیٰ کو دریا سے نکال کر اپنے محل میں لائے تو انھوں نے آپ کا نام "موسیٰ" تجویز کیا۔ آپ کا یہی نام مشہور ہو گیا۔

حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کے ایک فرد تھے۔ آپ کی قومی اور مذہبی زبان عبرانی تھی۔ مگر موسیٰ عبرانی زبان کا لفظ نہیں۔ یہ قبطی زبان کا لفظ ہے جو فرعون اور اس کی قوم کی زبان تھی۔ موسیٰ کے معنی قدیم قبطی زبان میں ہیں "پانی سے نکالا ہوا" یا "میں نے اسے پانی سے نکالا"

آجکل جس طرح الفاظ کے لئے جھگڑا کیا جاتا ہے، اگر حضرت موسیٰ کا وہ ذہن ہوتا تو فرعون کے رکھے ہوئے نام کو آپ پسند نہ کرتے اور بعد کے زمانہ میں اس کو بدل دیتے۔ مگر فرعون کا اور قبطی زبان کا یہی لفظ آپ کا مستقل نام بن گیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو "موسیٰ" ہی کے لفظ سے پکارا، جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے۔

اس سے سچے دین کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ سچا دین حقیقتوں کو دیکھتا ہے اور جھوٹا دین لفظوں کی کی بحث کرتا ہے۔ سچا دین حقیقت کو اہمیت دیتا ہے اور جھوٹا دین الفاظ کو۔

۹ مئی ۱۹۸۴

رابرٹ فراسٹ (۱۹۶۳ - ۱۸۷۴) امریکہ کا مشہور شاعر ہے۔ وہ امریکہ میں پیدا ہوا۔ مگر امریکہ میں ابتداءً اس کو مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ انگلستان میں اس کے قدر داں پیدا ہوئے۔ اور انھوں نے اس کے اعتراف میں مضامین لکھے۔ انگلینڈ کی قدر دانی کے بعد امریکہ والوں نے بھی اس کو تسلیم کر لیا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اپنے قریبی ماحول میں آدمی کا اعتراف نہیں کیا جاتا۔ قریبی لوگوں کو وہ اپنی طرح کا ایک "انسان" دکھائی دیتا ہے۔ مگر دور والوں کو اس کے صرف افکار پہنچتے ہیں۔ وہ اس کے جوہر کی بنیاد پر اس کو جانچتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں۔ قریب کے لوگ نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ جب کہ دور کے لوگ نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہو کر سوچتے ہیں۔ اس لئے دور کے لوگ کسی آدمی کو پہلے پہچان لیتے ہیں اور قریب کے لوگ نسبتاً دیر میں پہچانتے ہیں۔

۱۰ مارچ ۱۹۸۴

مجھے اپنی زندگی میں مسلمانوں کے بارے میں جو تجربات ہوئے ان کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ لوگوں کو شاید خدا کا اتنا ڈر بھی نہیں ہے جتنا کسی کو چیونٹی کاٹنے کا ہوتا ہے۔ خدا سے بےخوفی کے بغیر کوئی شخص ان افعال کی جرأت نہیں کر سکتا جن کا مشاہدہ آج کل بار بار ہوتا ہے۔ کاش لوگ جانتے کہ بےخوفی کا یہ لمحہ بہت دیر تک ان کے لئے باقی رہنے والا نہیں۔ لوگ جتنی زیادتی چاہیں کر لیں، بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ ان کی تمام آزادیاں ان سے چھن جائیں گی۔ حتیٰ کہ لوگوں کے پاس بےبسی کے سوا کوئی اور اثاثہ باقی نہیں رہے گا جس کو وہ اپنا سمجھیں۔

اس وقت لوگ بولنا چاہیں گے مگر ان کے پاس الفاظ نہ ہوں گے کہ وہ بولیں۔ وہ کرنا چاہیں گے مگر ان کے پاس طاقت نہ ہوگی کہ وہ کچھ کریں۔ اس زلزلہ خیز وقت کے آنے میں کچھ بھی دیر نہیں۔ جو وقت آنے والا ہے وہ آکر رہے گا، بلکہ جو وقت آنے والا ہے وہ آچکا۔ یہ صرف اندھے اور بے حس لوگ ہیں جو آنے والے وقت کو اپنے سے دور سمجھ رہے ہیں۔

لوگوں کے اوپر افسوس ہے۔ اگر وہ اپنے جیسے ایک انسان سے بے خوف ہیں تو کیا وہ خدا سے بھی بے خوف ہو گئے ہیں۔ کاش لوگوں کے پاس آنکھ ہو کہ وہ دیکھیں اور ان کے پاس عقل ہو کہ وہ سمجھیں۔

آہ انسان کے اوپر کتنا زیادہ بے بسی کا لمحہ آنے والا ہے، مگر وہ اپنے آپ کو کتنا زیادہ بااختیار سمجھ رہا ہے، آہ وہ انسان، جو اسی بات کو نہیں جانتا جس کو اسے سب سے زیادہ جاننا چاہئے، جو اسی بات سے بے خبر ہے جس سے اسے سب سے زیادہ باخبر ہونا چاہئے۔

۱۱ مئی ۱۹۸۴

مغربی جرمنی کے ایک پروفیسر ہیں جن کا نام دوبوئر ہے۔ انھوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اسلام سے کافی دل چسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جنوبی افریقہ کے عیسائی اپنی نسل پرستی کے لئے انجیل کا حوالہ دیتے ہیں مگر وہ انجیل کو باورچی خانہ کی کتاب کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے مطلب کی سطر کو بطور حوالہ اخذ کر لیتے ہیں۔ وہ یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کرتے کہ اس سطر کا سیاق وسباق کیا ہے۔

انھوں نے ایک انٹرویو میں کہا کہ جنوبی امریکہ میں اپنے قیام کے دوران میں نے وہاں کے لوگوں سے پوچھا کہ کیا تم ماسکو سے ڈرتے ہو۔ ان لوگوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ کیا تم لوگ امریکہ سے ڈرتے ہو۔ ان لوگوں نے دوبارہ کہا کہ نہیں۔ میں نے پوچھا کہ پھر تم لوگ کس چیز سے ڈرتے ہو۔ انھوں نے جواب دیا: ہم جنوبی امریکہ میں واقع عالمی سطح کی ۲۰۰ امریکی کمپنیوں سے خوف زدہ ہیں۔

قدیم زمانہ میں سیاسی خطرہ سب سے بڑے خطرہ کی حیثیت رکھتا تھا، مگر آج اقتصادی خطرہ سب سے بڑا خطرہ ہے۔

۱۲ مئی ۱۹۸۴

خدا کے دین میں لوگوں نے بے شمار قسم کے بگاڑ پیدا کئے ہیں۔ لیکن اگر تجزیہ کیا جائے تو بگاڑ

کی تمام قسموں کا خلاصہ صرف ایک ہے ـــــــ آخرت سے فرار۔ ہر بگاڑ کی تہ میں یہ جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح آخرت کی ذمہ داری سے فرار حاصل کیا جائے۔

کسی نے خدا کو مانتے ہوئے اس کی تشریح اس طرح کی کہ خدا کو سمندر قرار دیا اور انسان کو اس کا ایک قطرہ۔ موت کے بعد یہ قطرہ سمندر میں مل جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر خدا اور انسان کا کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اب ظاہر ہے کہ جب انسان کا الگ سے کوئی وجود ہی نہ رہ جائے تو کون کس کو پکڑے گا اور کون کس کا حساب لے گا۔

کسی نے سزا اور انعام کو اصولی طور پر مانتے ہوئے یہ کہا کہ زندگی ایک جبری چکر ہے۔ انسان زندگی کے لازمی قانون کے تحت بار بار ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف جاتا رہتا ہے، جو یا تو اس کی پچھلی زندگی کے اچھے عمل کا نتیجہ ہوتی ہے، یا برے عمل کا۔ اس فلسفہ میں بھی آخرت کا تصور حذف ہو گیا۔ کیوں کہ آخرت کا عقیدہ شعوری محاسبہ کا تقاضا کرتا ہے۔ جب کہ مذکورہ فلسفہ کے مطابق سب کچھ میکنیکل طور پر ہو رہا ہے۔

کچھ لوگوں نے آخرت کو پوری طرح مانتے ہوئے کفارہ کا عقیدہ گھڑ لیا۔ یعنی یہ کہ کوئی دوسرا شخص ہماری طرف سے ہمارے گناہوں کا کفارہ ہو چکا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق بھی آدمی کے اوپر سے آخرت کی ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جو کچھ ہمیں کرنا تھا وہ پہلے ہی دوسرا شخص انجام دے چکا۔ وغیرہ، وغیرہ

۱۳ مئی ۱۹۸۴

تاتار اصلاً ایک منگول قبیلہ تھا جو پانچویں صدی عیسوی کے بعد مشرقی منگولیا اور مغربی منچوریا میں آباد ہو گیا۔ اس قبیلہ کے ایک حصہ کو لے کر چنگیز خاں (۱۲۲۷ - ۱۱۶۲ء) نے اپنی فوج بنائی اور تیرہویں صدی عیسوی میں مشرقی یورپ پر حملہ آور ہوا۔ چنگیز خاں کی سلطنت کے خاتمہ کے بعد تاتاریوں کو ترک کہا جانے لگا۔

تاتاریوں نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کو برباد کیا۔

تاتاریوں نے جب خلافت عباسیہ کو تباہ کیا تو مسلم شہروں سے وہ لاکھوں کی تعداد میں عورتوں کو پکڑ کر لے گئے اور ان کو باندی بنا کر اپنے گھروں میں رکھا۔ تاتاریوں کو مسلمان بنانے میں ان مسلم خواتین

کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ مسلم عورتیں ہر تاتاری کے گھر میں داخل ہوگئیں۔ وہ اگرچہ باندی کے طور پر رکھی گئی تھیں مگر ان کے دینی جذبہ نے انھیں ابھارا کہ وہ اپنے مالکوں پر اسلام کی تبلیغ کریں۔ چنانچہ انھوں نے خاموشی کے ساتھ اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ یہ کام بہت عرصہ تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ بیشتر تاتاری مسلمان ہوگئے۔

تاتاری اسلام کے دائرہ میں داخل ہوکر اسلام کے خادم بن گئے، وہ تقریباً پانچسو برس تک مسلم دنیا کے حکمراں رہے۔

۱۴ مئی ۱۹۸۴

مسٹر خوشونت سنگھ ایک بار افریقہ کے سفر پر گئے تھے۔ اپنے اس سفر کی روداد انھوں نے السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں شائع کی تھی اس میں ایک بات یہ تھی:

On my last visit to Kenya and Uganda, I checked on the activities of Christian and Muslim missionaries working amongst the Negro tribes. Christians conceded that despite the unpleasant memories of Muslim Arab slavers, Islam was claiming more converts amongst African blacks than Christianity.
(Illustrated Weekly of India, July 7, 1974, p. 27)

کینیا اور یوگنڈا کے اپنے آخری سفر میں میں نے عیسائیوں اور مسلمانوں کی ان تبلیغی کوششوں کا جائزہ لیا جو نیگرو قبائل کے درمیان جاری ہیں۔ عیسائیوں نے اعتراف کیا کہ مسلم عرب بردہ فروشوں کی ناخوشگوار یادوں کے باوجود افریقہ کے سیاہ فام باشندوں میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد عیسائیت قبول کرنے والوں سے زیادہ ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کہنا غلط ہے کہ مسلمان چوں کہ بے عمل ہیں اس لئے ان کی تبلیغ غیر مسلموں میں مفید نہیں ہوسکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ بے عملی تبلیغ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ لوگ اسلام کے اصولوں کو دیکھ کر اسلام قبول کرتے ہیں نہ کہ مسلمانوں کے عمل کو دیکھ کر۔ اگر عمل کافی ہوتا تو کسی پیغمبر کی قوم کافر نہ رہتی۔

۱۵ مئی ۱۹۸۴

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ اپنے جس بندہ سے محبت کرتا ہے اس پر وہ مصیبت

ڈال دیتا ہے۔

مصیبت میں مبتلا کرنا، دوسرے لفظوں میں، آدمی کو حقیقت کی سطح پر زندگی گزارنے کا موقع دینا ہے۔ آدمی کی اصلی اور حقیقی حیثیت یہ ہے کہ وہ عاجز ہے، اس کو کسی قسم کا ذاتی اختیار حاصل نہیں۔

مگر جو شخص آرام اور سکون میں ہو، وہ زندگی کی اس حقیقت سے بے خبر ہوتا ہے۔ ایسے شخص کی زندگی مصنوعی سطح پر گزرنے لگتی ہے۔ اس کے برعکس جو شخص غم میں ہو اس کا غم اسے حقیقت کی سطح پر لے جاتا ہے۔ وہ عین اسی سطح پر زندگی گزارنے لگتا ہے جو باعتبار واقعہ اس کی سطح ہے۔

۱۶ مئی ۱۹۸۴

ڈاکٹر ایچ۔ ڈی سنکالیا (H.D. Sankalia) تاریخ اور علم الآثار کے مشہور ماہر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس بات کی کوئی اثریاتی شہادت نہیں ہے کہ مہابھارت کی لڑائی کبھی سرے سے ہوئی ہو:

There is no archaeological evidence of Mahabharata war at all.

ڈاکٹر سنکالیا پونہ میں یو این آئی کو ایک انٹرویو دے رہے تھے (اسٹیٹسمین ۲۵ ستمبر ۱۹۷۵)

۱۷ مئی ۱۹۸۴

سابق وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ لوگوں کو چاہئے کہ وہ خود اپنے اوپر ڈسپلن کو نافذ کریں نہ یہ کہ وہ ریاست کی طرف سے ان کے اوپر نافذ کیا جائے،

Discipline should be self-imposed, rather than state-imposed.

نظم اور ڈسپلن اوپر سے قائم کرنے کی چیز نہیں۔ لوگوں کے اندر ڈسپلن کا مزاج ہو، اسی وقت ڈسپلن قائم ہوتا ہے۔ جو ڈسپلن حکومت کی طرف سے قائم کیا جائے وہ صرف جبر ہوتا ہے اور دوسری بدتر خرابیاں پیدا کرتا ہے۔

تاہم ہندستان میں جو عام بدنظمی ہے اس کے لئے حکومت کو معذور نہیں قرار دیا جاسکتا۔ حکومت کی مشنری کی بھی ایک ذمہ داری ہے۔ اور اگر وہ اس کو ادا نہ کرے تو پھر اس مشنری کو قائم کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

۱۸ مئی ۱۹۸۴

سابق صدر مصر انور سادات نے ۶ اکتوبر ۱۹۸۳ کی مصر۔ اسرائیل جنگ کے واقعات کا انکشاف

کیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بتایا کہ مصری فوج نے ۶ اکتوبر ۱۹۷۳ کو نہر سویز پار کرنے کے لئے پنٹون پل استعمال کئے تھے۔ یہ پل روس سے حاصل کئے گئے تھے۔

انور سادات نے بتایا کہ روس نے ابتداءً ان کو ایسے پنٹون پل مہیا کئے جو دوسری جنگ عظیم میں استعمال کئے گئے تھے۔ اس قدیم طرز کے پنٹون پل کو جوڑنے میں پانچ گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ جدید ترین پنٹون پل آدھ گھنٹے کے اندر اندر جوڑے جاسکتے ہیں۔ میں نے وزیر اعظم روس مسٹر کوسی گن سے جب سخت احتجاج کیا تو روس نے جنگ بندی سے کچھ دیر پہلے جدید پنٹون پل مہیا کئے۔

دوسروں کے بل پر لڑنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ وہ اپنے دشمن کے خلاف لڑائی چھیڑ دیتے ہیں اور جب مدد دینے والے ان کی مدد نہیں کرتے تو ان کے خلاف شکایت لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی لڑائی بھی جھوٹی ہے اور ان کی شکایت بھی جھوٹی۔

۱۹ مئی ۱۹۸۴

اسلام کی تاریخ عجیب وغریب واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ تاہم ایک واقعہ شاید ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ تیرہویں صدی عیسوی کے نصف اول میں اسپین کی مسلم سلطنت مسیحی بادشاہ کے ہاتھوں ختم ہوگئی۔ اور اسی کے ساتھ تاتاریوں نے عباسی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ مگر عین اسی وقت دو حیرت انگیز واقعات پیش آئے۔ ایک طرف اسی زمانہ میں اسلام نے جنوبی ایشیا میں تجارت کے ذریعہ اپنا راستہ پالیا۔ دوسری طرف یہ واقعہ ہوا کہ فاتح تاتاریوں نے مفتوح مسلمانوں کے مذہب کو قبول کر لیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس طرح مثال قائم کر دی تھی کہ شکست کے بدترین حالات میں بھی اسلام کے لئے کامیاب پیش قدمی کے مواقع موجود رہتے ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے رہنماؤں کو اس سے کوئی سبق نہیں ملا۔ موجودہ مشکلات نے انھیں فریاد و احتجاج کے سوا اور کوئی تحفہ نہیں دیا۔

۲۰ مئی ۱۹۸۴

دو مسلمانوں میں بحث ہو رہی تھی۔ ایک مسٹر جناح کے دو قومی نظریہ کا حامی تھا۔ دوسرا مسلمان مولانا حسین احمد مدنی کے متحدہ قومیت کی تائید کر رہا تھا۔ اول الذکر مسلمان نے اپنے نقطۂ نظر کے حق میں دلیل دیتے ہوئے کہا:

"جناح کا دو قومی نظریہ بالکل صحیح تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم پائجامہ پہنتے ہیں اور اس

کو آگے سے باندھتے ہیں۔ ہندو لوگ دھوتی پہنتے ہیں اور اس کو پیچھے سے باندھتے ہیں"۔
کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جن کو یہ بھی نہیں معلوم کہ دلیل دوسری چیز ہے اور لطیفہ دوسری چیز۔

۲۱ مئی ۱۹۸۴

بمبئی ۲۱ ستمبر ۱۹۷۵: بمبئی میں مہاراشٹر اسٹیٹ اینٹی فاشزم کانفرنس کا دو روزہ اجلاس ہوا۔ کانفرنس میں کانگریس اور کمیونسٹ لیڈروں نے تقریریں کیں۔ آخر میں متفقہ طور پر جو رزولیوشن (اعلان نامہ) منظور کیا گیا۔ اس میں یہ درج تھا کہ اگر ملک میں ایمرجنسی لاگو نہ کی جاتی تو ہندستان میں بھی بنگلہ دیش کی کہانی دہرائی جاتی"۔

گویا ہندستان کے لئے بنگلہ دیش نہایت بری چیز ہے۔ مگر یہی "بنگلہ دیش" پاکستان کے لئے اتنی اچھی چیز ہے کہ خود ہندستان بنگلہ دیشیوں کی مدد کر کے اسے بنواتا ہے اور فخر کرتا ہے کہ ہم نے بنگلہ دیش بنوایا ہے۔

۱۲ مئی ۱۹۸۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ میں خلافت کی بحث شروع ہوئی۔ لوگ سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق نے اس موقع پر ایک تقریر کی۔ آپ نے قریش کے استحقاق خلافت کا ذکر کرتے ہوئے جو باتیں فرمائیں اس میں ایک جملہ یہ تھا: هم اول من عبد الله في الارض (وہ پہلے لوگ ہیں جنھوں نے زمین میں اللہ کی عبادت کی) اس عبادت سے واضح طور پر وہ عمل مراد ہے جو انھوں نے مکہ میں کیا اور مکہ میں اس وقت عبادت کے معنی ذکر و نماز کے سوا اور کچھ نہ تھے۔

خباب بن منذر انصاری نے جوابی تقریر میں انصار کا استحقاق خلافت ثابت کرتے ہوئے جو کچھ کہا اس میں ایک جملہ یہ تھا:

واللہ ما عبد واللہ علانیۃ الا فی بلادکم ولا جمعت الصلوٰۃ الا فی مساجدکم (خدا کی قسم انھوں نے اللہ کی کھلی عبادت نہیں کی مگر صرف تمہاری سرزمین میں۔ اور نماز باجماعت ادا نہیں کی گئی مگر صرف تمہاری مسجدوں میں (یعنی مدینہ میں)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کے ذہن میں عبادت کا مفہوم کیا تھا۔ عبادت ان کے نزدیک

پرستش کا نام تھی نہ کہ کسی اور چیز کا۔

۲۳ مئی ۱۹۸۴

ابو العباس احمد بن محمد بن کثیر الفرغانی (۹۰۳-۸۳۲ء) خلیفہ مامون رشید کے زمانہ کا مسلم سائنس داں ہے۔ وہ ترکستان کے شہر فرغانہ میں پیدا ہوا، اسی نسبت سے اس کو الفرغانی کہا جاتا ہے۔ مغربی مورخین اس کو الفریگانوس کہتے ہیں۔

زمین کا محیط (گھیرا) ناپنے کی کوشش قدیم زمانہ سے جاری رہی ہے۔ یونانی ہیئت دانوں نے بھی زمین کا محیط ناپنے کی کوشش کی تھی۔ ان میں ارسطو اور بطلیموس کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ارسطو نے اپنے بنائے ہوئے آلہ کے ذریعہ پیمائش کر کے بتایا تھا کہ زمین کا محیط ۴۵۹۶۴ میل ہے۔

الفرغانی نے خلیفہ متوکل عباسی کے زمانہ میں زمین کا محیط معلوم کرنے کی کوشش کی۔ الفرغانی اور اس کے ساتھیوں نے قدیم پیمانوں کے ذریعہ زمین کا جو محیط معلوم کیا وہ ۶۸۰۲ فرسخ تھا۔ یہ موجودہ پیمانہ کے لحاظ سے ۲۵۰۰۹ میل کے برابر ہوتا ہے۔

قدیم زمانہ میں جب کہ جدید پیمائشی ذرائع حاصل نہ تھے، الفرغانی اور اس کے ساتھیوں کی یہ دریافت حیرت انگیز تھی۔ انھوں نے زمین کے محیط کی جو پیمائش بتائی وہ اصل سے بہت قریب تھی۔ موجودہ زمانہ کی پیمائش کے مطابق زمین کا اصل محیط ۲۴۸۵۸ میل ہے۔

۲۴ مئی ۱۹۸۴

نیکی اور بدی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا علم وحی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ دوسری وہ جو ضمیر اور عقل کی سطح پر ہر انسان کو معلوم ہیں۔ نیکی اور بدی کی اسی دوسری قسم کو معروف اور منکر کہا جاتا ہے۔

موجودہ زمانہ کے لوگوں تک وحی کی ہدایت نہیں پہنچی ہے۔ مگر لوگوں کے اندر بڑھی ہوئی برائیوں کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اخلاقی سطح پر ہی ڈسکریڈٹ ہو رہے ہیں۔ وحی کی باتیں اگر لوگوں کو معلوم نہیں ہیں تو کیا انھیں عقل اور ضمیر کی باتیں بھی نہیں معلوم ہیں۔ کیا وہ معروف اور منکر کو بھی نہیں جانتے۔ پھر معروف اور منکر کے معاملہ میں لوگوں کی مجرمانہ غفلت کا ان کے پاس کیا جواز ہے۔

۲۵ مارچ ۱۹۸۴

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ آدمی جس چیز کی تلاش میں ہو اسی کو وہ پاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے

کہ آدمی جس چیز کی تلاش میں ہو اسی کے بارہ میں اس کا شعور جاگتا ہے۔ اس کے لئے اس کے اندر تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بارہ میں اس کی نظر اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ جہاں وہ اس کو دیکھے فوراً اسے پہچان لے۔

اب جس شخص کے اندر حق کی طلب جاگی ہو وہ حق کو دیکھے گا اور جس کے اندر باطل کی طلب جاگی ہو وہ باطل کو دیکھے گا۔

جو شخص اپنی بڑائی کا طالب ہو وہ دوسرے کی بڑائی کو دیکھنے میں ناکام رہے گا۔ جو شخص ناحق طریقہ پر فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہو وہ ان تعلیمات کا راز سمجھنے سے محروم رہے گا جن میں حق کا طریقہ اختیار کرنے کی خوبیاں بتائی گئی ہوں۔ جو شخص قومی مفاد کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے ہو وہ دعوتی مفاد کو سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ وغیرہ۔

۲۶ مئی ۱۹۸۴

آج کل ہر طرف احتساب کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ مگر یہ نام نہاد احتساب زمانہ اور کائنات کے احتساب کے لئے ہے نہ کہ اپنا احتساب کرنے کے لئے۔ زمانہ کا احتساب اور کائنات کا احتساب، یہ سب محض الفاظ کے کھیل ہیں۔ یہ اپنی بے عملی کو بڑے بڑے الفاظ میں چھپانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ احتساب کرنے والا صرف وہ ہے جو اپنا احتساب کرے۔ جو اپنے آپ کو پیاز کے چھلکے کی طرح چھیل کر دیکھے کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ جس نے دنیا میں اپنا احتساب کیا وہ آخرت کے حساب سے بچ جائے گا۔ اور جو شخص احتساب عالم کے نعرے لگائے اس کو اس قسم کے لفظی شعبدے خدا کی پکڑ سے بچانے والے ثابت نہیں ہو سکتے۔

۲۷ مئی ۱۹۸۴

"مرد نے ہمیشہ عورت کو ستایا ہے" ایک صاحب نے کہا۔ میں نے کہا کہ یوں نہ کہئے بلکہ یوں کہئے کہ طاقتور ہمیشہ کمزور کو ستاتا ہے۔ یہ مسئلہ مرد اور عورت کا نہیں بلکہ طاقت ور اور کمزور کا ہے۔ عورت جب نکاح کے بعد مرد کے گھر میں آتی ہے تو اکثر حالات میں وہ کمزور حالت میں ہوتی ہے۔ اس لئے مرد اپنے کو اس کے مقابلہ میں اپنے کو طاقت ور پاکر اس کو ستاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جب کبھی عورت کی پوزیشن زیادہ طاقتور ہو جاتی ہے تو وہ مرد کو ستانے لگتی ہے۔

بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ حالات سے کنٹرول ہوتے ہیں۔ ان کے جیسے حالات ہوں ویسے ہی

وہ بن جاتے ہیں۔ آدمی طاقت ور ہو، پھر بھی وہ کمزور کو نہ ستائے۔ آدمی برتر پوزیشن رکھتا ہو، پھر بھی وہ کمتر پوزیشن والے شخص کا احترام کرے، اس کے لئے ذہنی ڈسپلن کی ضرورت ہوتی ہے اور دنیا میں ہمیشہ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو ذہنی ڈسپلن کے ساتھ زندگی گزاریں۔ بیشتر لوگ وہ ہیں جو اپنے جذبات کے تابع ہوتے ہیں نہ کہ اپنی عقل کے تابع۔

۲۸ مئی ۱۹۸۴

میں باتھ روم میں بڑے شیشہ کے سامنے کھڑا تھا کہ اچانک مجھ پر ایک لمحاتی تجربہ گزرا۔ سامنے کے شیشہ میں میرا پورا وجود کامل صورت میں کھڑا ہوا موجود تھا۔ وہ ٹھیک ویسا ہی دکھائی دے رہا تھا جیسا کہ وہ شیشہ کے باہر فی الواقع تھا۔ اس وقت اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میں انسان کے اخروی مثنیٰ کو دیکھ رہا ہوں۔

ہر آدمی جو موجودہ دنیا میں ہے وہ اپنی سوچ اور اپنے عمل کے اعتبار سے اپنا ایک جوڑا یا اپنا مثنیٰ تخلیق کر رہا ہے۔ اس کا یہ مثنیٰ آخرت کی دنیا میں بن رہا ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی اپنے ظاہر کے مطابق ہوتا ہے۔ آخرت میں وہ اپنے باطن کے مطابق ہوگا۔ موجودہ دنیا میں آدمی کا ظاہری وجود بنتا ہے۔ آخرت میں آدمی کا باطنی وجود بن رہا ہے۔

موت کے بعد آدمی اپنے اس مثنیٰ کو پائے گا۔ میں نے جب اپنے وجود کو عین اس صورت میں بڑے شیشے میں دیکھا جیسا کہ وہ اس کے باہر تھا تو ایسا محسوس ہوا گویا میں آخرت کے معاملہ کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ دوسری دنیا کا اسی موجودہ دنیا میں تجربہ کر رہا ہوں۔

۲۹ مئی ۱۹۸۴

قرآن میں سب سے زیادہ زور جس چیز پر دیا گیا ہے وہ یہ کہ انسان صرف ایک خدا کو اپنا الٰہ مانے اور صرف اسی کی عبادت کرے۔

اس سے مراد یہ ہے کہ انسان صرف ایک خدا کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے۔ خدا کو ایک انسان سے اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ نفسیاتی سرافگندگی (psychological surrender) ہے۔ موجودہ زمانہ کے بعض مسلم مفکرین نے اس نفسیاتی سرافگندگی کو سیاسی سرافگندگی (political surrender) کے معنی میں لے لیا۔

یہ زبردست گمراہی ہے۔ جو لوگ اس فکر سے متاثر ہوئے ان کے لئے اسلام کمیونسٹ نظام کی طرح

بس ایک نظام بن گیا۔ اسلام کا اصل نشانہ انسان کی اپنی نفسیات ہے۔ مگر اس فکر نے اسلام کو ایک ایسی چیز بنا دیا جس کا نشانہ خارج میں ہو۔ چنانچہ اس فکر کے متاثرین خارجی سیاسی نظاموں سے ٹکرا رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام کو قائم کرنے کا کام کر رہے ہیں۔

۳۰ مئی ۱۹۸۴

قرآن کی سورہ نور کی آیت ہے: اللہ نور السماوات والارض (اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے) اس آیت کی تفسیر میں ابن کثیر نے لکھا ہے:

وقرأ بعضهم: الله منور السماوات والارض.

وعن الضحاك: الله نوّر السماوات والارض

(بعض نے اس آیت میں نور کو مُنوِّر پڑھا، یعنی روشن کرنے والا۔ ضحاک نے اس کو نوّر پڑھا، یعنی اللہ نے روشن کیا)

قدیم تفسیروں میں اس طرح کے فقرے جگہ جگہ آتے ہیں۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ نکالا ہے کہ قرآن میں اختلاف قرأت ہے۔ یعنی ایک آیت کو ایک عالم نے ایک انداز سے پڑھا اور دوسرے عالم نے اس کو دوسرے انداز سے پڑھا۔

مگر یہ غلط فہمی ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ قرأت کا اختلاف نہیں۔ یہ قرأتِ تفسیری ہے نہ کہ قرأتِ اختلافی۔ یعنی مذکورہ عالم نے "نور" کو منور یا نوّر پڑھ کر لفظ نور کی تفسیر کی نہ یہ کہ انھوں نے یہ بتایا کہ میرے نزدیک قرآن کی آیت اُس طرح نہیں ہے، اِس طرح ہے۔

۳۱ مئی ۱۹۸۴

انسان اس زمین کی سب سے زیادہ سرکش مخلوق ہے۔ وہ شیر اور بھیڑیے سے بھی زیادہ سرکشی کرتا ہے۔ کوئی دلیل یا کوئی شرافت انسان کو نہیں جھکاتی۔ وہ صرف اس وقت جھکتا ہے جب کہ اس کا سامنا ایسی طاقت سے ہو جس کے مقابلہ میں وہ اپنے آپ کو بالکل مجبور پائے۔

انسان کی سرکشی کے بارے میں مجھے بے حد تلخ تجربات ہوئے ہیں۔ ان کو سوچتے ہوئے میری زبان سے نکلا:

اللہ تعالیٰ کی ذات میں اگر وہ تمام صفتیں ہوتیں جو قرآن میں بتائی گئی ہیں مگر اس کے پاس

طاقت نہ ہوتی تو یہ انسان اللہ کے آگے کبھی جھکنے کے لئے تیار نہ ہوتا۔

یکم جون ۱۹۸۴

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ اعلیٰ انسان کی تعریف ایک لفظ میں کیا ہے، تو میں کہوں گا کہ اعلیٰ انسان وہ ہے جو سچائی کے انکار کا تحمل نہ کر سکتا ہو، جو خلافِ حق روش اختیار کرنے کے بعد زندہ نہ رہ سکے۔

۲ جون ۱۹۸۴

ابراہیم بلخی کا قول ہے: تعرف تقوی الرجل فی ثلاثۃ اشیاء۔ فی اخذہ وفی منعہ وفی کلامہ۔ یعنی تم کسی شخص کے تقویٰ کو پہچاننے کے لئے اس کی تین چیزوں کو دیکھو۔ وہ کس چیز کو اپناتا ہے۔ وہ کس چیز سے باز رہتا ہے۔ اور یہ کہ وہ کیا بات کرتا ہے۔

یہ تینوں چیزیں آدمی کے ذوق کو بتاتی ہیں۔ اور کسی آدمی کا ذوقِ انتخاب بلاشبہ وہ اہم ترین معیار ہے جس کے ذریعہ اس کی حقیقی شخصیت کو جانا جاسکے۔

۳ جون ۱۹۸۴

شاہ یعقوب مجددی (بھوپال) نے کسی شخص کو دیکھا کہ وہ ایک سنت (غالباً داڑھی) کو چھوڑے ہوئے ہے۔ انھوں نے اس شخص سے کہا کہ تم کو اس سنت پر عمل کرنا چاہئے۔ مذکورہ شخص بے پروائی کے ساتھ بولا:

جناب، یہ سنت ہی تو ہے۔

شاہ یعقوب مجددی نے فرمایا:

بے شک یہ عمل سنت ہے۔ لیکن تیرا لہجہ کفر ہے۔

بے عملی گناہ ہے۔ مگر سرکشی اس سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے۔ بے عملی کے ساتھ اگر شرمندگی ہو تو شاید اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو معاف کر دے۔ مگر جو شخص بے عملی کے ساتھ سرکشی دکھا رہا ہو وہ کسی طرح قابل معافی نہیں۔

۴ جون ۱۹۸۴

مصطفیٰ ریاض پاشا (۱۹۱۱-۱۸۳۴) مصر کی حکومت میں وزیر تھا۔ وہ جمال الدین افغانی

(۱۸۳۸-۱۸۹۷) سے متاثر تھا۔ جمال الدین افغانی جب مصر آئے تو اس نے ان کو جامعہ ازہر میں استاد مقرر کرادیا اور ان کو مصر میں دینی کام کے مواقع دیے۔

مگر جمال الدین افغانی کے نزدیک سب سے بڑا کام سیاست تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مصر کی موجودہ حکومت برطانیہ کے زیر اثر ہے۔ چنانچہ وہ مصری حکومت کے خلاف ہوگئے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مصر سے نکال دئے گئے اور مصر میں کوئی خاص دینی اور تعمیری کام نہ کرسکے۔

موجودہ زمانہ کے تمام مسلم لیڈر اسی قسم کی جھوٹی سیاست میں مبتلا رہے ہیں۔ اس سیاست نے عملاً تو مسلمانوں کو کچھ نہیں دیا، البتہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملے ہوئے مواقع برباد ہوکر رہ گئے۔ وہ پہلے ہی مرحلہ میں "کل" کی طرف دوڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کل سے بھی محروم رہے اور جزء سے بھی۔

۵ جون ۱۹۸۴

مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم ۳۱ دسمبر ۱۹۷۱ کو ہمارے دفتر (جمعیۃ بلڈنگ) میں آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ مولانا شبیر احمد عثمانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ بیان کیا کرتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ حضرت عمر نے ایک بار ایک چادر لی اور اس کو اوڑھ کر اپنا منھ ڈھانپ کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد چادر ہٹائی اور فرمایا:

لیس ھٰذا من الاسلام بشئ (اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں) اس کے بعد حضرت عمر نے چادر کو دونوں کندھوں پر ڈال لیا اور سینہ تان کر بیٹھ گئے اور فرمایا: ھٰذا ھو الاسلام (اسلام حقیقۃً یہ ہے)

۶ جون ۱۹۸۴

شیخ مجیب الرحمٰن جنرل یحییٰ خاں کے زمانہ میں پاکستان میں قید کر لئے گئے تھے۔ اس کے بعد بھٹو کے زور دینے پر وہ رہا کئے گئے۔ وہ پاکستان کی قید سے رہا ہو کر مخصوص ہوائی جہاز کے ذریعہ ۸ جنوری ۱۹۷۱ کو لندن پہنچے۔ اس وقت ہوٹل کلیرج میں ہندستانی ہائی کمشنر مسٹر آپا بی پنت نے مل کر ان کو مسز گاندھی کی مبارک باد پیش کی۔ شیخ مجیب نے ہندستانی وزیر اعظم کی مبارک باد سنی تو ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے۔ ان کی زبان سے نکلا کہ وہ ایک عظیم خاتون ہیں:

She is a great lady, a grand lady.

شیخ مجیب الرحمٰن اس کے بعد "بنگ بتا" کہے جانے لگے۔ تاہم ان کے بعد کے واقعات نے بتایا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے آنسو حقیقۃً خوشی کے آنسو نہ تھے بلکہ وہ نادانی کے آنسو تھے۔ اور اس نادانی کی سب سے زیادہ سنگین قیمت خود شیخ مجیب الرحمٰن کو بھگتنی پڑی۔

۷ جون ۱۹۸۴

۱۰ جولائی ۱۹۶۹ کو میں نے اپنی نوٹ بک میں یہ الفاظ لکھے تھے:

" ہر ایک نے بڑے بڑے واقعات کو اپنا عنوان قیادت بنا رکھا ہے۔ حالانکہ زندگی کا راز چھوٹے چھوٹے واقعات کو پکڑنے میں ہے نہ کہ بڑے بڑے واقعات کے پیچھے دوڑنے میں" سر الحیاۃ کائن فی البدایۃ المتواضعۃ

۸ جون ۱۹۸۴

انسان ہماری معلوم دنیا میں ایک انتہائی مستثنیٰ واقعہ ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ انسان ایک کائناتی حادثہ ہے:

Man is a cosmic accident.

ایک استثنائی واقعہ خصوصی منصوبہ بندی کو بتاتا ہے۔ مگر "منصوبہ بندی" کا لفظ چوں کہ ذہن کو خدا کی طرف لے جاتا ہے، اس لئے اس کو حادثہ کہہ دیا گیا۔ حالاں کہ انسان اتنا عجیب واقعہ ہے کہ اس کو حادثہ کہنا کسی بھی طرح ممکن نہیں۔

استثنا لازمی طور پر ارادہ کو ثابت کرتا ہے۔ زمین کا ایک مستثنیٰ کرہ ہونا ثابت کرتا ہے کہ یہاں کوئی بالاتر ہستی ہے جس نے قصد و ارادہ کے تحت عام کروں سے الگ ایک کرہ بالکل مختلف انداز میں بنایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زمین جیسے ایک کرہ کا وجود خدا کے وجود کا ثبوت ہے، اگرچہ بہت کم لوگ ہیں جو اس آئینہ میں خدا کو دیکھ پاتے ہوں۔

۹ جون ۱۹۸۴

۱۹۵۴ میں میں نے اپنی نوٹ بک میں یہ فقرہ لکھا تھا:

" حقیقت کبھی اتنی سادہ نہیں ہوتی جتنا ایک مخلص آدمی اسے سمجھ لیتا ہے۔"

جب میں نے یہ سطریں لکھیں اس وقت میری عمر ۳۰ سال سے کم تھی۔ اب میں دیکھتا ہوں تو

نظر آتا ہے کہ ہمارے قائدین ۶۰ سال کی عمر کو پہنچ کر بھی اس راز سے بے خبر ہیں۔ وہ اپنی سادگی کے تحت بار بار ایسے اقدامات کرتے ہیں جو حقیقی صورت حال سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اس سادگی کا انھیں خود تو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ کیوں کہ وہ پھر بھی مقدس قائد بن کر عوام کے درمیان مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں۔ مگر عوام کو اس کا اتنا زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے جس کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

۱۰ جون ۱۹۸۴

چیکوسلواکیہ کی ایک مثل ہے کہ ایک نئی زبان سیکھو اور ایک نئی روح حاصل کرو:

Learn a new language and get a new soul.

یہ ایک حقیقت ہے کہ زبان کا بہت گہرا تعلق انسان کے ذہنی ارتقاء سے ہے۔ اگرچہ زیادہ زبان جاننا بذات خود انسانی ارتقاء کے لئے کافی نہیں لیکن انسانی ارتقاء کا تجربہ وہی لوگ کرتے ہیں جو ایک سے زیادہ زبانیں جانتے ہوں۔

مصر کے مشہور ادیب ڈاکٹر احمد امین نے اپنی خود نوشت سوانح عمری (حیاتی) میں لکھا ہے کہ پہلے میں صرف اپنی مادری زبان (عربی) جانتا تھا۔ اس کے بعد میں نے انگریزی سیکھنا شروع کیا۔ غیر معمولی محنت کے بعد میں نے یہ استعداد پیدا کر لی کہ میں انگریزی کتابیں پڑھ کر سمجھ سکوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب میں انگریزی سیکھ چکا تو مجھے ایسا محسوس ہوا گویا پہلے میں صرف ایک آنکھ رکھتا تھا اور اب میں دو آنکھ والا ہو گیا۔

یہ اللہ کا فضل ہے کہ میں اپنی مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانیں سیکھنے کا موقع پا سکا۔ میں کم و بیش ۵ زبانیں جانتا ہوں: اردو، عربی، فارسی، انگریزی، ہندی۔ اگر میں صرف اپنی مادری زبان (اردو) جانتا تو یقیناً معرفت کے بہت سے دروازے مجھ پر بند رہتے۔

۱۱ جون ۱۹۸۴

پیٹر استینو (Peter Ustinov) کا قول ہے کہ غصہ کو جب عقل سے دبایا جائے تو اس کا نام برداشت ہے:

Tolerance is anger suppressed by reason.

سماجی زندگی میں غصہ اور تلخی کا پیدا ہونا ایک بالکل فطری بات ہے۔ کوئی آدمی اس سے بچ نہیں سکتا۔ مگر اس کے اظہار کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ غصہ کو غصہ کی شکل میں ظاہر کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ غصہ کو برداشت کی شکل میں ظاہر کیا جائے۔

غصہ کو برداشت کی شکل میں ظاہر کرنا اپنے اندر زبردست فائدہ رکھتا ہے۔ مگر ایسا وہی شخص کر سکتا ہے جو اپنے اندر زبردست عقل رکھتا ہو۔ کم عقل آدمی غصہ کو برداشت کے روپ میں ظاہر کرنا نہیں جانتا۔

جو لوگ غصہ کو برداشت نہ کر سکیں، انھیں اس سے بھی زیادہ بڑی چیز برداشت کرنی پڑتی ہے، اور وہ اپنا مفاد ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ غصہ کو غصہ کی شکل میں ظاہر کرنا صرف ان لوگوں کے لئے مفید ہے جنھیں اپنے نفع نقصان کا کوئی درد نہ ہو۔ ژاں پال سارترے نے جو بات تشدد کے بارہ میں کہی ہے وہی غصہ کے بارہ میں بھی صحیح ہے۔ اس نے کہا کہ تشدد ان لوگوں کے لئے موزوں ہے جو اپنے پاس کھونے کے لئے کچھ نہ رکھتے ہوں:

Violence suits those who have nothing to lose.

۱۲ جون ۱۹۸۴

واٹر کولر میں ڈیل کرنے والی ایک دکان میں یہ سائن بورڈ لگا ہوا تھا:

Going in for cheap water coolers may land you in hot water.

یہ ایک دلچسپ جملہ ہے جس کا اردو میں ترجمہ کرنا بہت مشکل ہے۔ مگر اس کا مفہوم تقریباً وہی ہے جس کو اردو زبان کی مثل میں اس طرح ادا کیا گیا ہے: سستا روئے روز روز مہنگا روئے ایک روز۔

اکثر لوگ سستی چیز خریدنے کی طرف دوڑتے ہیں مگر سستی چیز خریدنے سے بہتر یہ ہے کہ سرے سے خریداری ہی نہ کی جائے۔ کیوں کہ قیمت کی کمی خود چیز میں کسی کمی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آدمی چیز خرید کر بھی بے چیز رہتا ہے۔

تاہم ہندستان کے بارے میں یہ بات صرف جزئی طور پر صحیح ہے۔ ہندستان میں بدعنوانی کا راج ہے۔

یہاں کا تاجر زیادہ قیمت لے کر بھی اکثر اچھی چیز نہیں دیتا۔ دوسرے ملکوں میں آدمی زیادہ قیمت دیکر اچھی چیز پالیتا ہے مگر ہندستان میں اچھی چیز پانے کے لئے ایک اور چیز درکار ہے اور وہ وہی ہے جس کو خوش قسمتی کہتے ہیں۔

۱۳ جون ۱۹۸۴

کسی قوم کے لئے جو چیز سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ مزاج ہے۔ اسلام سب سے زیادہ خدا کی عظمت کا تصور دلاتا ہے۔ اس سے افراد کے اندر تواضع کا مزاج پیدا ہوتا ہے۔ جن لوگوں کے اندر خدا کے مقابلہ میں تواضع آجائے وہ انسانوں کے مقابلہ میں بھی متواضع بن کر رہتے ہیں۔ یہی اسلام کا اصل مزاج ہے اور یہی تمام انسانی خوبیوں کا خلاصہ ہے۔ اسی سے انسان کے لئے ہر قسم کی بھلائی کے دروازے کھلتے ہیں۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلم مصلحین نے یہ غلطی کی کہ انھوں نے مسلمانوں کے اندر فخر کا مزاج بنایا۔ موجودہ زمانہ کے مسلم مصلحین کے افکار کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ ہے: میں مسلمان ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ اقبال اس ذہن کے بنانے میں سب سے آگے ہیں۔ وہ اس معاملہ میں یہاں تک گئے کہ نہ صرف دیگر اقوام کے مقابلہ میں انھوں نے مسلمانوں کو فخر کا سبق دیا۔ بلکہ عجیب وغریب طور پر خود خدا کے مقابلہ میں بھی فخر کرنا سکھایا:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے — کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

اقبال کے اس قسم کے اشعار جو ذہن بناتے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ فخر کی حدود انسانوں سے گزر کر خدا تک پہنچ جاتی ہیں۔

اس قسم کی ذہن سازی جو ہمارے مصلحین نے کی اس کا نتیجہ انھیں یہ ملا کہ انھیں زبردست شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ مگر قوم بربادی کے آخری گڑھے میں پہنچ گئی۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان جس طرح برباد ہو رہے ہیں، اس کا واحد سب سے بڑا سبب ان کا جھوٹے فخر کا مزاج ہے۔

۱۴ جون ۱۹۸۴

یقین سب سے بڑی طاقت ہے۔ وہی عرب جو ابرہہ کے ہاتھیوں کو دیکھ کر بھاگ گئے تھے،

انھیں عربوں نے بعد کو قادسیہ کی جنگ میں شہنشاہ ایران کی ہاتھیوں کی فوج کو لپسپا کر دیا۔
پہلے عرب اور بعد کے عرب میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یقین کی طاقت کا فرق ہے۔ ابرہہ (اصحاب الفیل) کا واقعہ اس وقت ہوا جب کہ عرب بت پرستی میں مبتلا تھے۔ خدائی عقیدہ سے پیدا ہونے والا حوصلہ ان کے اندر پیدا نہیں ہوا تھا۔
مگر قادسیہ کی جنگ میں جو عرب تھے وہ ایمان کی دولت پا چکے تھے۔ انھیں یقین کی وہ طاقت مل چکی تھی جو ابتدائی عربوں کو حاصل نہ تھی۔

۱۵ جون ۱۹۸۴

سپرجین کا قول ہے کہ جو لوگ تیزی سے وعدہ کر لیتے ہیں وہ عام طور پر اس کو پورا کرنے میں سست ہوتے ہیں:

Those who are quick to promise are generally slow to perform.
C.H. Supergeon.

سنجیدہ آدمی جس کے اندر وعدہ پورا کرنے کا مزاج ہو، وہ وعدہ کرنے سے پہلے سوچے گا۔ وہ چاہے گا کہ میں وہی وعدہ کروں جس کو میں پورا کر سکوں اور وہ وعدہ نہ کروں جس کو پورا کرنا میرے لئے مشکل ہو۔ اس کا یہ ذہن اس کو وعدہ کرنے کے معاملہ میں محتاط بنا دے گا۔
اس کے برعکس جو لوگ وعدہ پورا کرنے کا مزاج نہ رکھتے ہوں، جو اپنے الفاظ یہ سمجھ کر منھ سے نہ نکالیں کہ اس کو انھیں اپنا عمل بنانا ہے۔ ایسے لوگ فوراً وعدہ کر لیں گے۔ جب انھیں وعدہ پورا کرنا ہی نہیں ہے تو وعدہ کے بارہ میں انھیں یہ سوچنے کی کیا ضرورت کہ وعدہ کرتے ہوئے کیا لفظ بولیں اور کیا لفظ نہ بولیں۔

۱۶ جون ۱۹۸۴

ہندستان کے سابق وزیر غذا رفیع احمد قدوائی کا انتقال ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ کو ہوا تھا۔ لکھنؤ کے اخبار قومی آواز (۲۸ اکتوبر ۱۹۵۴) کی رپورٹ کے مطابق شام کو جب ان کی میت دفن کے لئے قبرستان لے جائی گئی تو وہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کا زبردست مجمع تھا۔ اس وقت میت کے قریب ایک گفتگو ہوئی۔ وہاں کھڑے ہوئے ایک تعلیم یافتہ شخص نے اپنے ساتھی سے انگریزی میں کہا:

"دیکھو ، رفیوجیوں نے آکر رفیع صاحب سے کہا کہ شرنارتھیوں کا محکمۂ وزارت آپ اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ رفیوجی اور ایک مسلمان پر اتنا بھروسہ کرے۔ کیا شخصیت تھی ان کی۔"

دنیا میں بلند مقام حاصل کرنے کا سب سے زیادہ یقینی رازیہی ہے۔ آدمی اپنے کردار اور اپنے عمل کے ذریعہ لوگوں کے اندر اتنا اعتماد پیدا کرلے کہ غیر بھی اس سے یہ کہنے لگیں کہ آپ ہمارے معاملات کو سنبھال لیجئے۔ آپ سے زیادہ بہتر شخص ہماری نظر میں کوئی دوسرا نہیں۔

۱۷ جون ۱۹۸۴

جو لوگ منصفانہ نظام قائم کرنے کے نام پر ہنگامہ کرتے ہیں۔ اور قائم شدہ حکومت کو توڑنے کی تحریک چلاتے ہیں وہ بلاشبہ غیر سنجیدہ لوگ ہیں۔ بلکہ نتیجہ کے اعتبار سے وہ ملک وقوم کے دشمن ہیں۔ کیوں کہ ایسی کوشش کا انجام ہمیشہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ایک بری حکومت ختم ہو جائے اور اس کی جگہ اس سے زیادہ بری حکومت قائم ہو جائے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انصاف لانے والے دراصل افراد ہیں نہ کہ کوئی نام نہاد نظام۔ یہ صرف افراد ہیں جو کوئی نظام قائم کرتے ہیں۔ افراد اگر اچھے ہیں تو اچھا نظام قائم ہوگا اور افراد اگر برے ہیں تو برا نظام قائم ہوگا۔ جو لوگ افراد نہ بنائیں اور حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے جلسے جلوس اور ہنگامے کریں وہ کبھی کوئی صالح نظام قائم نہیں کرسکتے۔

موجودہ حالت میں ہر ملک میں یہ حال ہے کہ افراد بگڑے ہوتے ہیں۔ افراد کے سامنے اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں کہ وہ اپنے لئے زیادہ سے زیادہ حاصل کریں اور اس کے لئے ہر ممکن طریقہ استعمال کریں۔ یہی وجہ ہے کہ انصاف آجکل ایک خرید وفروخت کی چیز بن گئی ہے۔ ہنری والڈروف فرانس نے موجودہ سماج کے بارے میں بالکل صحیح کہا ہے کہ مجرم دراصل وہ شخص ہے جو مہنگے وکیلوں کو خریدنے کی طاقت نہ رکھتا ہو:

A criminal is a person without sufficient means to employ expensive lawyers.
Henry Waldorf Francis

۱۸ جون ۱۹۸۴

دو مصری عالم ملاقات کے لئے آئے۔ ان میں سے ایک کا نام عبد الکریم البدوی اور دوسرے کا نام نمیر علی المنس ہے۔ یہ لوگ تقریباً دو گھنٹہ تک رہے۔ ان سے کافی دلچسپ باتیں ہوئیں۔

انھوں نے ایک مصری عالم کا قصہ سنایا۔ کسی سفر میں ان کی ملاقات ایک عیسائی پادری سے ہوئی۔ پادری نے کہا، میں نے سنا ہے کہ آپ کے یہاں ایک خاتون گزری ہیں جن کو آپ لوگ مقدس مانتے ہیں۔ حالاں کہ ان کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ انھوں نے زنا کا ارتکاب کیا تھا۔

مصری عالم نے نہایت سنجیدگی سے کہا کہ جناب، ہم دو عورتوں کو مقدس مانتے ہیں۔ ایک وہ خاتون (عائشہ) جن کا نکاح ہوا اور ان کے بارے میں کچھ مخالفین نے زنا کا الزام لگایا۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق ایک اور مقدس خاتون (مریم) ہیں۔ جنھوں نے نکاح نہیں کیا اور ان پر بھی لوگوں زنا کا الزام لگایا۔ پھر آپ کی مراد دونوں میں سے کس خاتون سے ہے۔ یہ سن کر پادری بالکل خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد پھر وہ ایک لفظ نہیں بولا۔

کسی اعتراض کا جواب دینے کے دو طریقے ہیں۔ ایک، منطقی طریقہ۔ دوسرے، وہ طریقہ جس کی ایک مثال اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔ میرا مزاج علمی اور منطقی انداز کا ہے۔ میں ہر سوال کا جواب منطقی انداز میں دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ خالص علمی اعتبار سے منطقی جواب کی زیادہ اہمیت ہے۔ مگر بعض اوقات مذکورہ بالا قسم کا جواب ہی زیادہ مفید ہوتا ہے۔ کوئی علمی اور منطقی جواب مذکورہ پادری کے لئے اتنا موثر نہیں ہو سکتا تھا جتنا کہ مصری عالم کا جواب موثر ہوا۔

۱۹ جون ۱۹۸۴

حبیب بھائی (حیدر آباد) نے تجارت سے متعلق بہت سے دلچسپ واقعات بتائے۔ ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا۔

مشہور صنعت کار مسٹر برلا کی جوٹ مل میں ایک افسر تھے۔ ان کا نام مسٹر گپتا تھا۔ ایک روز مسٹر برلا نے ان کا معائنہ کیا اور ان کے کام کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے اپنی محنت کی تفصیلات بتائیں اور کہا کہ میں نہایت محنت کے ساتھ اپنی ڈیوٹی انجام دیتا ہوں۔ مسٹر برلا نے گپتا صاحب سے کہا کہ آپ استعفا دے دیں۔ وہ حیران ہوئے کہ جب میں اتنا زیادہ کام کرتا ہوں تو مجھ سے استعفا کا مطالبہ کیوں کیا جا رہا ہے۔ مسٹر برلا نے جواب دیا: آپ کہتے ہیں کہ میں ہمیشہ محنت کرتا ہوں۔ مگر مجھے تو وہ آدمی چاہئے جو عقل کو استعمال کرے۔

اس کے بعد حبیب بھائی نے کہا کہ بڑی ترقی کے لئے عقل اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہے نہ کہ صرف

محنت و مشقت کی۔

محنت کرنا بلاشبہہ قابل قدر چیز ہے، مگر اس سے زیادہ قابل قدر چیز محنت کرانا ہے، محنت کرنے والا اکیلا محنت کرتا ہے، مگر محنت کرانے والا سینکڑوں اور ہزاروں آدمیوں سے محنت کرا کے کام کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔

۲۰ جون ۱۹۸۴

ایک بڑے تاجر سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تجارت میں کامیابی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ صرف قسمت۔ انھوں نے کہا کہ محنت سے آدمی دو وقت کی روٹی پا سکتا ہے، مگر دولت تو قسمت ہی سے ملتی ہے۔ انھوں نے برناڈ شا کا ایک قول سنایا جس کا مطلب یہ تھا کہ ——— اس طرح کام کرو گویا کہ ہر چیز کا انحصار تمہارے اوپر ہے مگر جب دعا کرو تو اس طرح دعا کرو جیسے کہ ہر چیز کا انحصار خدا کے اوپر ہے:

Work as if everything depends on you. Pray as if everything depends on God.

۲۱ جون ۱۹۸۴

مولانا عبد اللہ صاحب نے بعض جدید مصنفین کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اعلیٰ عقلی معیار پر دین کو ثابت کر دیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ محض خوش فہمی کی بات ہے ورنہ آپ جن مصنفین کا نام لے رہے ہیں انھیں شاید یہ بھی خبر نہیں کہ عقلی استدلال حقیقی معنوں میں ہے کیا۔

پھر میں نے ایک مشہور مصنف کی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس میں اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اس میں ایک مقام پر یہ کہا گیا ہے کہ اسلام انسانی مساوات کا مذہب ہے جب کہ دوسروں کے یہاں مساوات نہیں پائی جاتی۔

انھوں نے اس کا طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ خطبہ حجۃ الوداع سے اس قسم کے الفاظ نقل کئے ہیں: لا فضل لعربی علی عجمی و لا بیض علی اسود: کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں۔ کسی سفید فام کو کسی سیاہ فام پر فضیلت نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے یہ کہا ہے کہ ساؤتھ افریقہ میں سیاہ فام اور سفید فام سے الگ الگ معاملہ کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں کالے نیگروؤں کو وہاں کے سفید فام

لوگوں کے برابر حقوق حاصل نہیں، وغیرہ

اب ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ استدلال غیر علمی اور غیر عقلی ہے۔ اس لئے کہ اس میں نظریہ کا تقابل عمل سے کیا گیا ہے۔ اسلام سے نظریہ لے لیا گیا اور مغرب سے عمل۔ نظریہ کا تقابل نظریہ سے ہونا چاہئے اور عمل کا تقابل عمل سے۔ مذکور مسلمان مصنف کو یہ کرنا چاہئے تھا کہ وہ خطبہ حجۃ الوداع کے مقابلہ میں اقوام متحدہ کا حقوق انسانی کا چارٹر پیش کرتے اور دونوں کا تقابل کر کے اپنا نظریہ ثابت کرتے۔

۲۲ جون ۱۹۸۴

ایک صاحب نے الرسالہ کے بارے میں کچھ مخالفانہ ریمارک دئے۔ جب ان کا خط مجھ کو ملا تو میں نے فوراً انھیں لکھا کہ آپ نے الرسالہ کے بارے میں جو ریمارک دئے ہیں اس کی کوئی مثال تحریر فرمائیں، محض لفظی ریمارک سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی جب تک اس کو دلیل اور مثال سے واضح نہ کیا جائے۔ جب ان کا کوئی جواب نہیں آیا تو میں نے پھر ان کو یاد دہانی کا خط لکھا۔ کئی مہینے تک میں ان کو یاد دہانی کے خطوط لکھتا رہا مگر انھوں نے الرسالہ کے "زبان و بیان" کے بارے میں کسی ایک غلطی کی نشاندہی نہیں کی۔ ہماری قوم کا یہ عجیب ذہن ہے کہ وہ الزامی لفظ بولنے کو تنقید کرنا سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ تنقید نام ہے تجزیہ (Analysis) کا۔

آخر چھ مہینہ کے انتظار کے بعد میں نے ان کو ایک آخری خط لکھا۔ اس میں دوسری باتوں کے ساتھ یہ سطریں بھی تھیں:

غلطی کرنا صرف ایک وقتی فعل ہے۔ مگر غلطی نہ ماننا ایک ابدی جرم ہے۔ یہ اپنی شخصیت کو خود اپنے ہاتھوں ہلاک کرنا ہے۔ غلطی کرنے کے بعد اگر آدمی اپنی غلطی کو مان لے تو وہ اسی وقت ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر آدمی اپنی غلطی کو نہ مانے تو یہ تمام غلطیوں میں سب سے بڑی غلطی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو شخص دوسرے کو مجرم ظاہر کرنا چاہتا تھا وہ خود اپنی نظر میں ہمیشہ کے لئے مجرم بن جاتا ہے۔ اب آپ کے لئے واحد راستہ صرف یہ ہے کہ کھلے طور پر اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔ اگر آپ اپنی غلطی کا اعتراف نہ کریں تو یاد رکھئے، آپ ساری عمر اپنے ضمیر کے سامنے غلط کار بنے رہیں گے۔

۲۳ جون ۱۹۸۴

خروشچوف ۱۹۶۴ء تک روس کے وزیر اعظم تھے۔ ان کے بارہ میں ایک لطیفہ کسی اخبار

میں پڑھا تھا۔ لینن گراڈ کے دورہ میں وہ ایک فیکٹری دیکھنے گئے۔ اور ایک روسی مزدور سے کارخانہ کے حالات پوچھے۔ مزدور نے فوراً کارخانہ کی تعریف شروع کردی۔ اس نے کہا کہ یہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ پیداوار روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

"تم کس کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہو" خروشچوف نے بگڑ کر مزدور سے کہا "تم جانتے نہیں کہ میں کون ہوں"۔ میں سوویت روس کا وزیر اعظم خروشچوف ہوں"۔ مزدور فوراً بولا: معاف کیجئے گا، میں سمجھا تھا کہ آپ کوئی غیر ملکی سفیر ہیں"۔

۲۴ جون ۱۹۸۴

ایک نوجوان تشریف لائے۔ انھوں نے اسی سال دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں مصنف بننا چاہتا ہوں۔ مجھے بتائیے کہ میں کس طرح مصنف بنوں۔

یہ بات انھوں نے لمبی تمہیدی گفتگو کے بعد کہی۔ میں نے کہا کہ اگر آپ اس لئے میرے پاس آئے ہیں تو آپ نے اپنا وقت بھی ضائع کیا اور میرا وقت بھی ضائع کیا۔ میں نے کہا کہ مصنف کبھی مشورہ سے نہیں بنتا۔ مصنف کوئی شخص صرف اپنے عمل سے بنتا ہے۔ اگر آپ مصنف بننا چاہتے ہیں تو آپ کو کسی سے مشورہ لینے کی ضرورت نہیں۔ آپ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں مہارت پیدا کیجئے اور دونوں زبانوں کا ضروری لٹریچر پڑھ ڈالیے۔ اور پھر دس سال تک لکھنے کی مشق کیجئے۔ اس کے بعد آپ خود بخود مصنف بن جائیں گے۔

میں نے کہا کہ مصنف دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو خود ہی لکھتے ہیں اور خود ہی پڑھتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جن کی لکھی ہوئی چیز کو ساری دنیا پڑھتی ہے۔ پہلی قسم کا مصنف بننے کے لئے آپ کو کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اس قسم کے مصنف آپ ابھی اور اسی وقت ہیں۔ لیکن اگر آپ دوسری قسم کا مصنف بننا چاہتے ہیں تو آپ کو غیر معمولی جدوجہد کرنی پڑے گی۔ حتی کہ از سر نو آپ کو دوسرا جنم لینا پڑے گا۔

میں نے کہا کہ یاد رکھئے، لکھنا سب سے زیادہ مشکل آرٹ ہے۔ اس سے زیادہ مشکل آرٹ دنیا میں اور کوئی نہیں۔ مگر نادان لوگ اس سب سے زیادہ مشکل آرٹ کو سب سے زیادہ آسان آرٹ سمجھ لیتے ہیں۔

۲۵ جون ۱۹۸۴

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے اپنی تفسیر "تفہیم القرآن" کے آخر میں "خاتمہ" کے عنوان سے ایک صفحہ لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے "صمیم قلب" کے ساتھ یہ اعلان کیا ہے:

"اصحاب علم سے میری درخواست ہے کہ وہ میری غلطیوں پر مجھے متنبہ فرمائیں۔ جس بات کا بھی غلط ہونا دلیل سے مجھ پر واضح کر دیا جائے گا، ان شاء اللہ اس کی اصلاح کروں گا۔ میں اس بات سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ کتاب اللہ کے معاملہ میں دانستہ غلطی کروں یا کسی غلطی پر جا رہوں۔"

جلد ششم صفحہ ۵۷۵

راقم الحروف کی کتاب "تعبیر کی غلطی" گواہ ہے کہ میں نے مولانا مودودی کو ان کی قرآنی غلطیوں پر آگاہ کیا۔ "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" نامی کتاب میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کو میں نے علمی دلائل سے رد کیا۔ یہ دلائل اتنے واضح تھے کہ مولانا مودودی میرے شدید اصرار کے باوجود ان کا جواب نہ دے سکے۔ مگر انھوں نے اپنی غلطیوں کا اعتراف نہیں کیا، یہاں تک کہ ان کا آخری وقت آگیا۔

کیسی عجیب بات ہے۔ آدمی اعلان حق کا کریڈٹ لیتا ہے مگر وہ اعتراف حق کا کریڈٹ لینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ میری غلطی کو دلائل سے ثابت کر دیا جائے تو میں مان لوں گا۔ مگر جب دلائل کے ذریعہ اس کی غلطی ثابت کر دی جاتی ہے تو وہ اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ وہ غیر متعلق الفاظ بول کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنے عدم اعتراف کے لئے کافی عذر فراہم کر لیا ہے۔

۲۶ جون ۱۹۸۴

اعلیٰ انسان وہ ہے جو ایک بااصول انسان (Man of principle) ہو۔ اس کے مقابلہ میں ادنیٰ انسان وہ ہے جو غرض مند انسان (Man of interest) ہو۔ خدا کسی ذاتی غرض کے بغیر لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ وہ خود اپنے اصولوں کے تحت لوگوں کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ آخرت میں خدا کی قربت وہ لوگ پائیں گے جو اس اعتبار سے خدا کے ہم صفت ہوں، جنھوں نے بشریت کی سطح پر اس اخلاقیات کا ثبوت دیا ہو جس اخلاقیات پر حق تعالیٰ خدائی سطح پر قائم ہے۔

آخرت میں خدا کی صحبت انھیں لوگوں کو حاصل ہوگی جو موجودہ دنیا میں بااصول ہونے کا ثبوت

دیں اور جو لوگ یہاں کے تجربہ میں بے اصول ثابت ہوں وہ آخرت میں خدا کا پڑوس حاصل کرنے سے محروم رہیں گے۔

کوئی انسان بااصول ہے یا بے اصول، اس کا پتہ اس کے کردار سے چلتا ہے۔ اول الذکر آدمی کی زندگی معلوم اصولوں کے تحت گزرتی ہے اور ثانی الذکر آدمی کی زندگی اغراض اور مفادات کے تحت۔

بااصول آدمی کی زندگی میں تضاد نہیں ہوتا۔ وہ ایک شخص سے جو معاملہ کرتا ہے وہی معاملہ وہ دوسرے شخص سے بھی کرتا ہے۔ وہ وہاں خوش اخلاق ہوتا ہے جہاں اصولی طور پر اس کو خوش اخلاق ہونا چاہئے۔ وہ ہر حال میں انصاف کرتا ہے خواہ وہ اپنے موافق ہو یا اپنے خلاف۔

مفاد پرست آدمی کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی زندگی میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔

۲۷ جون ۱۹۸۴

ہر آدمی، قرآن کی زبان میں، تکاثر میں مصروف ہے۔ وہ اندھا دھند بس سامان حیات کے اضافہ میں لگا ہوا ہے۔ اس کی کوششوں کا مرکز و محور صرف یہ ہے کہ دنیا کی چیزیں اس کے پاس زیادہ سے زیادہ ہو جائیں۔

یہ آدمی کی زبردست بھول ہے۔ دنیا کی چیزوں میں اضافہ صرف آدمی کی اپنی ذمہ داریوں (liabilities) کو بڑھاتا ہے، مگر آدمی اپنی نادانی سے یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے اثاثہ (assets) کو بڑھا رہا ہے۔

۲۸ جون ۱۹۸۴

لابی (lobby) ایک انگریزی لفظ ہے جس کے معنی ہیں برآمدہ۔ یعنی وہ سائبان جس کی طرف ملحق کمروں کے دروازے کھلتے ہوں۔ مگر موجودہ زمانہ میں یہ لفظ ایک سیاسی اصطلاح بن گیا ہے۔ جس کا مفہوم ہے: پالیسی تبدیل کرانے کے لئے حکومت پر اثر انداز ہونا۔ چوں کہ ابتدائی زمانہ میں اسمبلی کے ارکان سے ملاقات کرنے کے لئے اسمبلی کے برآمدے استعمال ہوتے تھے۔ اسی لئے لابی کا لفظ دھیرے دھیرے اس مفہوم کے لئے سیاسی اصطلاح بن گیا۔

"لابی" کی سیاست کا آغاز ابتداءً انگلینڈ میں ہوا۔ اس کے بعد یہ امریکہ پہنچا۔ امریکہ میں ہر چیز صنعت بن جاتی ہے۔ چنانچہ یہ بھی ایک صنعت بن گیا۔ امریکہ میں باقاعدہ رجسٹرڈ کمپنیاں ہیں جو حکومتوں سے فیس لے کر یہ کام کرتی ہیں۔

لابی کی ضرورت چھوٹے ملکوں کو بھی ہوتی ہے اور بڑے ملکوں کو بھی۔ مثلاً بنگلہ دیش ایک بہت چھوٹا ملک ہے مگر امریکہ میں اس کی لابی کرنے والی دو کمپنیاں موجود ہیں۔ ان کمپنیوں کا خاص مقصد بنگلہ دیش کی چائے کے لئے امریکہ میں اپنا مارکیٹ قائم رکھنا ہے۔

جاپان اپنی برآمدی مصنوعات کا ۳۷ فی صد حصہ امریکہ بھیجتا ہے۔ جنوبی کوریا ۴۰ فی صد اور تائیوان ۵۰ صد۔ اگر امریکہ کی قانون ساز اسمبلی یہ قانون پاس کر دے کہ غیر ملکی مصنوعات امریکہ میں داخل نہیں ہوں گی تو ان ملکوں کی اقتصادیات نہایت گہرے طور پر متاثر ہوں گی۔ اس لئے یہ ممالک اس معاملہ میں بہت حساس رہتے ہیں۔ ان ممالک کے نمائندے امریکہ کے حکومتی حلقوں میں گھوم پھر کر پتہ کرتے رہتے ہیں کہ امریکی حکمراں اپنی درآمدی پالیسی میں کسی تبدیلی کی بات تو نہیں سوچ رہے ہیں اور اگر ان کو اس قسم کا کوئی اشارہ ملتا ہے تو وہ فوراً لابی کا عمل شروع کر دیتے ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق جاپان کے بجٹ میں لابی کے لئے پانچ کروڑ ڈالر رکھا گیا ہے۔ یعنی تقریباً ایک ارب روپیہ۔

موجودہ دنیا میں زندہ رہنے کے لئے آدمی کو کتنا زیادہ چوکنا رہنا پڑتا ہے۔

۲۹ جون ۱۹۸۴

"اسلام سائنس کے مطابق ہے"۔ یہ جملہ صحیح نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ اسلام حقیقت کے مطابق ہے۔

قرآن میں اس طرح کی آیتیں ہیں:

فَاتَّقُوا اللّٰہَ یَا اُولِی الْاَلْبَابِ — اللہ سے ڈرو اے عقل والو

المائدہ ۱۰۰

اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ — نصیحت قبول کرتے ہیں صرف عقل والے۔

الرعد ۱۹

اس سے معلوم ہوا کہ ذکر اور تقویٰ کا سرچشمہ عقل ہے۔ آدمی اپنے عقل و شعور کو کام میں لا کر ہی اس درجہ کو حاصل کرتا ہے جس کو شریعت میں ذکر اور تقویٰ کہا گیا ہے۔ صاحب ذکر اور صاحب تقویٰ بننے

کے لئے ضروری ہے کہ آدمی صاحب عقل بنے۔

۳۰ جون ۱۹۸۴

تحریک خلافت کے ہنگامہ کے زمانہ میں موپلا مسلمانوں نے مظاہرہ کیا۔ اس کے نتیجہ میں ہندستان کی برطانی فوج نے ان پر گولی چلائی۔ چار سو موپلا ہلاک ہوگئے۔ انھوں نے تار دینا چاہا تو ان کا تار قبول نہیں کیا گیا۔ اس پر وہ مزید بپھر گئے۔ انھوں نے تار کاٹ ڈالے۔ ریل کی پٹریاں اکھاڑ دیں۔ افسروں کو قتل کیا۔ وغیرہ، وغیرہ۔ اس کے بعد ان کے اوپر جو سختیاں ہوئیں، ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ گرمی کے موسم میں ایک سو موپلا قیدیوں کو مال گاڑی کے ڈبہ میں بند کرکے بھیجا گیا۔ اس میں ستر آدمی دم گھٹ کر مر گئے۔ (بحوالہ جمعیۃ علما کیا ہے، حصہ دوم، صفحہ ۵۸، ۶۹ – ۱۶۸)

یہ ان بے شمار نقصانات میں سے صرف ایک ہے جو تحریک خلافت کے ہنگاموں کے زمانہ میں ہندستانی مسلمانوں کو پہنچا۔ ہمارے لکھنے اور بولنے والے اس کو انگریزوں کے ظلم کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ میں اس کو خود مسلم لیڈروں کی نادانی کے خانہ میں ڈالتا ہوں۔ میرے لئے ناقابل فہم ہے کہ جس خلافت کا سرا تمام تر " اتاترک " کے ہاتھ میں تھا، اس کے لئے ہمارے لیڈروں نے ہندستان میں کیوں لایعنی ہنگامے کھڑے کئے۔

یکم جولائی ۱۹۸۴

مغل حکمراں جہاں گیر کا واقعہ ہے۔ وہ اپنی بیوی (نور جہاں) سے بہت محبت کرتا تھا۔ ایک بار ملکہ نے بادشاہ سے محبوبانہ شکایت کی۔ یہ معاملہ ایک اسلامی اور دینی معاملہ تھا۔ بادشاہ نے صفائی کے ساتھ کہا:

جاناں، جاں بتو دادم نہ کہ ایمان

(اے محبوب بیوی، میں نے تم کو اپنی جان دی ہے نہ اپنا ایمان) پہلے زمانہ میں یہ دنیا دار بادشاہوں کا حال تھا۔ آج دین دار مسلمانوں کا حال بھی ایسا نہیں۔ آج یہ حال ہے کہ آدمی باہر کی دنیا میں اسلام پر تقریر کرتا ہے۔ اور جب وہ اپنے گھر کے اندر داخل ہوتا ہے تو بیوی بچوں کے تقاضے سے اتنا مغلوب ہوتا ہے کہ گھر کے اندر وہ اس کے برعکس طریقہ پر عمل کرنے لگتا ہے جس کا اعلان اس نے گھر کے باہر کیا تھا۔

۲ جولائی ۱۹۸۴

مولانا شبیر احمد عثمانی نے ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ میں اپنی تفسیر قرآن مکمل کی تو اس کے آخر میں انھوں نے لکھا: "الٰہی۔ تو اس کے نیک ثمرات سے دارین میں مجھ کو متمتع فرما"۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ میں اپنی تفسیر تفہیم القرآن مکمل کی تو اس کے آخر میں لکھا: "میں اللہ کے کرم سے امید رکھتا ہوں کہ وہ .... اس کو میری مغفرت کا ذریعہ بنائے گا"۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے رمضان ۱۴۰۰ھ میں اپنی تفسیر تدبر قرآن مکمل کی تو اس کے آخر میں لکھا: رب کریم، اس ناچیز خدمت کو اپنے اس غلام کی نجات کا ذریعہ بنائیے"۔

اکثر مصنفین نے اپنی تصنیفات کے بارہ میں اس طرح کی باتیں لکھی ہیں۔ مگر مجھ کو اپنے ایمانی ذوق کے اعتبار سے یہ بات پسند نہیں آتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے بارہ میں اب تک مجھے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ وہ اپنے کسی عمل کے بارہ میں یہ کہتے ہوں کہ خدایا، تو میرے اس عمل کے ذریعہ مجھے جنت میں پہنچا دے۔ وہ لوگ اپنی دعاؤں میں ہمیشہ اپنے عجز کا اظہار کرتے تھے نہ کہ اپنے عمل کا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بعد کے دور کی بات ہے۔ جب لوگوں کا ایمانی احساس کمزور ہوگیا تو لوگ اس طرح کی باتیں کرنے لگے۔ اگر یہ کوئی صحیح اور اسلامی بات ہوتی تو ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور دوسرے صحابہ کے یہاں اس قسم کی دعائیں ملنی چاہئے تھیں۔ مگر ایسی دعا کسی کے یہاں نہیں ملتی۔ مجھ کو تو ایسے الفاظ خدا کی خدائی کا کم تر اندازہ معلوم ہوتے ہیں۔

۳ جولائی ۱۹۸۴

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب (لاہور) نے اپریل ۱۹۸۴ میں حیدرآباد (ہندستان) کا دورہ کیا۔ اس کی مفصل روداد ماہنامہ میثاق (لاہور) جون ۱۹۸۴ میں شائع ہوئی ہے۔

اس موقع پر حیدرآباد میں ڈاکٹر صاحب کی بہت سی تقریریں ہوئیں۔ ان میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ انھوں نے اسلام کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی۔ رپورٹ کے مطابق ایک اجتماع میں "قتال فی سبیل اللہ کا بیان بھی بھرپور انداز میں ہوا" صفحہ ۷۶-۷۵،

قیام حیدر آباد کے آخر کی ایک تقریر کے بارہ میں رپورٹ کا ایک حصہ یہ ہے:

" دوران درس منتظمین میں سے ایک صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو چٹ بھیجی کہ لوگوں سے قریب قریب ہونے کی درخواست کی جائے۔ اس لئے کہ سامعین کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کام کے لئے دو تین منٹ کا وقفہ بھی دیا۔ لوگ قریب ہونے میں سستی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے برجستہ کہا: حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے۔ میرے قریب حضرت داغ سے ملتے جلتے پرانے زمانہ کے ایک بزرگ بیٹھے تھے۔ ان کے آگے خالی جگہ موجود تھی۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ حضور، ڈاکٹر صاحب یہ آپ ہی کے بارہ میں ارشاد فرما رہے ہیں۔ انھوں نے خاص نظروں سے راقم کی جانب دیکھا اور سامنے موجود خالی جگہ پر کرلی۔"

میثاق، جون ۱۹۸۴، صفحہ ۸۱

مسلمانوں کے مقرر اور خطیب رہنما جلسوں میں مسلم عوام کی بھیڑ دیکھ کر اکثر اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کی تقریروں نے مسلمانوں کے اندر ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ مگر معمولی سا تجربہ بھی اس تخیل کو غلط ثابت کر دیتا ہے، خواہ وہ شاندار طور پر کامیاب ہونے والے جلسہ میں نظم اور سلیقہ کے ساتھ بیٹھنے کی درخواست ہی کیوں نہ ہو۔

۴ جولائی ۱۹۸۴

آجکل کے انسان کا معاملہ عجیب ہے۔ ایک شخص مجھ سے ملنے آئے گا اور آدھ گھنٹہ تک اپنی بات کہتا رہے گا۔ میں پورے صبر کے ساتھ اس کی بات کو سنوں گا۔ مگر آدھ گھنٹہ تک اس کی بات سننے کے بعد جب میں اپنی بات کہنا چاہوں گا تو وہ پانچ منٹ تک بھی توجہ کے ساتھ میری بات نہیں سنے گا اور بیچ میں بول پڑے گا۔

کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو نہ دوسرے کو جانتے اور نہ اپنے آپ کو۔ اس کے باوجود وہ اس یقین سے سرشار ہیں کہ ان کو جو کچھ جاننا تھا وہ سب انھوں نے جان لیا۔ اب مزید انھیں کچھ جاننے کی ضرورت نہیں۔

لوگ اپنے جاننے کو جانتے ہیں، کاش انھیں معلوم ہوتا کہ اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ وہ اپنے نہ جاننے کو نہ جانیں، وہ اپنی بے خبری کے بارہ میں واقفیت حاصل کریں۔

۵ جولائی ۱۹۸۴

کمیونزم کے داعی مارکس نے کہا تھا کہ مذہب افیون ہے:

Religion is the opiate of the people.

اس کے جواب میں آرتھر اسٹین (Arthur C. Von Stein) نے کہا کہ کمیونزم گدھوں کی افیون ہے:

Communism is the opiate of the asses.

سیسل پالمر نے کہا کہ سوشلزم ایک ایسا نظام ہے جو صرف جنت میں قابل عمل ہے جہاں اس کی ضرورت نہیں۔ یا جہنم میں جہاں وہ پہلے ہی اسے حاصل کر چکے ہیں:

Socialism is a system which is workable only in heaven,
where it isn't needed, and in hell, where they have got it.
Cecil Palmer

۶ جولائی ۱۹۸۴

قال علیؓ کرم اللہ وجہہ:

العلم خیر من المال لان المال یحرسك وانت تحرس المال۔ والمال تنقصہ النفقة والعلم یزکو علی الانفاق۔

علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ علم مال سے بہتر ہے۔ کیوں کہ مال تمہاری حفاظت کرتا ہے، اور مال کی حفاظت تم کو خود کرنی پڑتی ہے۔ مال خرچ کرنے سے کم ہوتا ہے اور علم میں خرچ سے اضافہ ہوتا ہے ——— کیسی عجیب حکمت کی بات ہے جو صحابی رسول نے فرمائی۔

۷ جولائی ۱۹۸۴

ڈاکٹر امبیڈکر کے سامنے کچھ مسلمانوں نے اسلام پیش کیا تھا۔ اس کا جواب جو ڈاکٹر امبیڈکر نے دیا وہ نواب ہوش یار جنگ بہادر (خیرت آباد، حیدر آباد دکن) کی روایت کے مطابق یہ تھا:

"بلاشبہہ اسلام فی نفسہٖ بہترین مذہب ہے۔ لیکن اگر میں اسلام کو اختیار کرنا چاہوں تو

مجھے سب سے پہلے یہ عقدہ حل کرنا ہوگا کہ شیعہ بنوں یا سنی۔ قبروں کو پوجوں یا خدا کو۔ مسلمان مختلف فرقوں میں اس طرح تقسیم ہوگئے ہیں کہ ہر فرقہ دوسرے فرقہ کو کافر کہتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جس جوش سے تعزیوں اور قبروں کو پوجا جاتا ہے، اگر میں وہ جوش ظاہر نہ کرسکا تو مجھے وہابی کہہ کر اسلام سے خارج کر دیا جائے گا۔ دوسروں کو مسلمان بنانے سے پہلے مسلمانوں کو چاہئے کہ خود مسلمان بن جائیں اور اپنی اندرونی تفریق کو دور کریں۔" (ہماری بت پرستیاں، از ہوش بلگرامی، صفحہ ۱۵)

یہ صحیح ہے کہ موجودہ مسلمانوں میں بے شمار بگاڑ پائے جاتے ہیں۔ مگر جہاں تک ڈاکٹر امبیڈکر کا سوال ہے، ان کا مذکورہ تبصرہ سنجیدگی کی مثال نہیں کیونکہ ان کے سامنے اسلام کو اختیار کرنے کا مسئلہ تھا نہ کہ مسلمانوں کی قومی روش کو اختیار کرنے کا۔

۸ جولائی ۱۹۸۴

"محمد علی کلے" کا نام لیجئے تو فوراً باکسر (boxer) کا تصور سامنے آجائے گا۔ اسی کو حیثیت عرفی کہتے ہیں۔ ہر شخص یا ہر قوم کی ایک حیثیت عرفی ہوتی ہے، یعنی اس کی معروف حیثیت، اسی معروف حیثیت کے اعتبار سے وہ شخص یا قوم دنیا میں جانا جاتا ہے۔

آج مسلمانوں کی حیثیت عرفی کیا ہے ——— ایک ایسی قوم جو حقوق کا مطالبہ کر رہی ہے۔ جو بات بات میں لڑ جاتی ہے۔ جو شاعری اور خطابت کی دھوم مچاتی ہے۔ وغیرہ۔

مسلمان کی اصل معروف حیثیت یہ تھی کہ وہ توحید پرست ہے، وہ آخرت کو ماننے والا ہے۔ وہ محفوظ دین کا حامل ہے۔ دوسروں کی نظر میں آج مسلمانوں کی جو معروف حیثیت ہے وہ یہ نہیں۔ وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو باعتبار حقیقت ہونا چاہئے۔

یہ آج کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ انھیں سب سے پہلے اپنی اس تصویر کی تصحیح کرنی چاہئے۔ ہر ممکن قیمت ادا کرکے انھیں اپنی معروف حیثیت وہ بنانا چاہئے۔ جو قرآن و حدیث کے مطابق فی الواقع ان کی معروف حیثیت ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈر اکثر مسلمانوں کے تشخص (identity) کی بات کرتے ہیں۔ مگر تشخص سے ان کی مراد صرف کلچرل تشخص ہوتا ہے حالاں کہ مسلمان کا اصل تشخص وہ ہے جو اس کی مومنانہ اور داعیانہ حیثیت کو بتائے نہ کہ ایک مخصوص کلچرل گروپ ہونے کو۔

۹ جولائی ۱۹۸۴

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے سب سے بڑی نادانی یہ کی ہے کہ پوری قوم کو سطحی فکر (superfluous thinking) کا شکار بنا دیا ہے۔ جو مسئلہ فکری چیلنج کا تھا اس کو کافر اقوام کی سازش بنا کر پیش کیا۔ جو مسئلہ مقابلہ (competition) کا تھا اس کو دوسری قوموں کا تعصب قرار دیا۔ جو مسئلہ خود مسلمانوں کی اپنی کمزوریوں اور غفلتوں کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اس کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرایا۔

ایک حدیث میں مومن کی صفات میں سے ایک صفت بصیراً بزمانہ (اپنے زمانہ کو دیکھنے والا) کہا گیا ہے۔ اس اعتبار سے جانچا جائے تو موجودہ زمانہ کے تقریباً تمام مسلم رہنما اس صفت سے بالکل عاری نظر آتے ہیں۔ ان رہنماؤں نے اپنی بےخبری سے پوری کی پوری قوم کو بے خبر بنا دیا۔ یہی آج مسلمانوں کا مسئلہ نمبر ایک ہے۔

۱۰ جولائی ۱۹۸۴

جب ایک شخص دلیل کی زبان میں کلام کرے، اور اس کے مخالفین اس کے برعکس عیب جوئی کی زبان بول رہے ہوں، تو یہ فرق اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ شخص مذکور سراسر حق پر ہے اور اس کے مخالفین سراسر ناحق پر۔ کیوں کہ قرآن کے مطابق دلیل کی زبان پیغمبروں کی زبان ہے اور عیب جوئی کی زبان اہل کفر کی زبان۔

جس حق کو آپ دلیل سے رد نہ کر سکیں اس کو شبہات کی بنا پر رد کرنا ایسا گناہ ہے جو اللہ کے یہاں کسی طرح قابل معافی نہیں۔

۱۱ جولائی ۱۹۸۴

ابن خلدون (۱۴۰۶ - ۱۳۳۲ء) نے بتایا ہے کہ قوم میں جب عصبیت زائل ہو جائے تو قوم میں زوال آجاتا ہے۔ ٹائن بی (۱۹۷۵ - ۱۸۸۹) نے بتایا کہ اگر معاشرے میں جواب (response) پیدا ہونا ختم ہو جائے تو اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔

یہ دونوں باتیں ایک اعتبار سے درست ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ صحیح الفاظ میں یہ بات یوں کہی جا سکتی ہے کہ کسی قوم کے عروج و زوال کا فیصلہ اس کے افراد کی سطح پر ہوتا ہے نہ کہ کسی

قسم کی اجتماعی حالت کی سطح پر۔ کیوں کہ اجتماعی حالت بذات خود کوئی چیز نہیں۔ اجتماعی حالت دراصل افراد ہی کی حالت کا اجتماعی ظہور ہے۔

کسی قوم کی زندگی کے لئے بنیادی چیز یہ ہے کہ اس کے افراد جاندار ہوں۔ جاندار افراد ہمیشہ فکری انقلاب کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں۔ تاہم فکری انقلاب کا معاملہ بھی فیض بقدر استعداد کے اصول پر قائم ہے۔ افراد کے اندر جتنی استعداد ہوگی اسی کے بقدر ان کا فکری انقلاب نتیجہ خیز ہوگا۔

حضرت مسیح کے "بارہ شاگرد" بھی فکری انقلاب سے بنے تھے۔ مگر وہ آخر میں حضرت مسیح کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور پیغمبر عربی کے صحابہ بھی فکری انقلاب سے بنے تھے۔ مگر حال یہ تھا کہ غزوہ حنین میں جب ہر طرف سے آپ کے اوپر تیروں کی بارش ہونے لگی تو آپ کے صحابہ نے چاروں طرف سے آپ کے گرد زندہ انسانوں کی دیوار بنا دی۔

۱۲ جولائی ۱۹۸۴

ایمرسن (Emerson) کا ایک قول نظر سے گزرا کہ دنیا میں سب سے زیادہ مشکل کام ہے سوچنا:

What is the hardest task in the world? To think.

یہ بات صدفی صد درست ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ کم وہ لوگ ہیں جو سوچ کر کرتے ہیں بیشتر لوگ بغیر سوچے ہوئے کام کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوچنا خود سب سے بڑا عمل ہے۔ سوچنا بہت بڑی قربانی مانگتا ہے۔ آدمی وہ قربانی دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا جو سوچنے کے لئے درکار ہے۔ اس لئے وہ سوچنے کا کام بھی نہیں کرتا۔

۱۳ جولائی ۱۹۸۴

اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ہندستان میں مسلمانوں کی شرح پیدائش ہندو صاحبان سے زیادہ ہے یہ بات صرف ہندستان کی حد تک محدود نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں تقریباً ساری دنیا میں یہ صورت حال ہے کہ مسلمانوں کے یہاں شرح پیدائش دوسری قوموں سے زیادہ ہے۔

اس سلسلہ میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ تعدد ازواج ہے۔ مسلمان چوں کہ کئی بیویاں رکھتے ہیں اس لئے ان کے یہاں پیدائش کی شرح دوسری قوموں سے زیادہ ہے۔ مگر یہ توجیہہ صحیح نہیں۔ تعدد ازواج کی اجازت بلاشبہ اسلام میں ہے۔ مگر چند خاص علاقوں کے سوا عام مقامات پر اس کا عمومی رواج نہیں۔ مثلاً میرے خاندان اور میرے رشتہ داروں کا حلقہ بہت بڑا ہے۔ مگر ان میں کوئی ایک شخص بھی نہیں جس نے ایک سے زیادہ نکاح کر رکھا ہو۔

دوسری بات یہ کہ تعدد ازواج کا کوئی تعلق پیدائش کے مسئلہ سے نہیں۔ ایک عورت اگر مسٹر الف کے نکاح میں نہ ہوتی تو وہ مسٹر ب کے نکاح میں ہوتی۔ وہ بہر حال کسی نہ کسی کی بیوی ہوتی۔ پھر اس کے جو بچے پیدا ہونے تھے وہ پھر بھی پیدا ہوتے۔ اور ظاہر ہے کہ عورتوں کی تعداد لامحدود نہیں۔ اس لئے تعدد ازواج کا عمل بھی لامحدود نہیں ہوسکتا۔

دوسری قوموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے یہاں شرح پیدائش زیادہ ہونے کی اصل وجہ دوسری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری قوموں کے لوگ مخصوص اسباب کی بنا پر بہت بڑے پیمانہ پر خاندانی منصوبہ بندی اور مانع حمل تدابیر پر عمل کرتے ہیں۔ جب کہ مسلمان ان چیزوں کو ناجائز سمجھتے ہیں اور ان کی بہت بڑی اکثریت اس پر عمل نہیں کرتی۔ یہ ہے اصل وجہ جس نے دونوں گروہوں کے درمیان شرح پیدائش میں فرق پیدا کر دیا ہے۔

۱۴ جولائی ۱۹۸۴

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں دو قسم کے سیاسی خیالات تھے۔ ایک وہ لوگ جو تدریج کے قائل تھے، دوسرے وہ لوگ جو انقلاب کی باتیں کرتے تھے۔ تدریج پسند گروہ کا کہنا تھا کہ پہلا کام ہندستانیوں کو تعلیم و ترقی کی راہ پر آگے بڑھانا ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ سیاسی آزادی حاصل کرنا۔ دوسرے گروہ کا کہنا تھا کہ پہلے سیاسی آزادی حاصل کرو، اس کے بعد تعمیر و ترقی کا کام کرو۔

جواہر لال نہرو "انقلاب پسند گروہ" میں تھے۔ آزادی سے پہلے انھوں نے اول الذکر گروہ پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا: لبرل حضرات کے پیش نظر جو چیز ہے وہ "مرکز میں ذمہ داری" کے پراسرار لفظ سے ظاہر کی جاتی ہے۔ ایسے جوشیلے لفظ جیسے کہ طاقت، خود مختاری، حریت، آزادی انھیں نہیں بھاتے۔ ان کی تو آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ خطرناک ہیں۔ قانون دانوں کی زبان اور بحث کا طریقہ

انھیں بہت پسند ہے، اگرچہ اس سے عوام کے دلوں میں گرمی پیدا نہیں ہوتی۔ تاریخ میں ہمیں اس کی بے شمار مثالیں ملیں گی کہ افراد اور جماعتوں نے عقیدہ اور آزادی کے لئے خطروں کا سامنا کیا اور جان کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ مگر اس میں شک ہے کہ "مرکز میں ذمہ داری" یا ایسی کسی قانونی اصطلاح کی خاطر کوئی شخص کبھی بھی جان بوجھ کر ایک وقت کا کھانا چھوڑ دے گا یا کسی کی گہری نیند ہلکی ہو جائے گی۔

(میری کہانی حصہ دوم، مترجمہ ڈاکٹر عابد حسین، صفحہ ۲۴۱)

نہرو جیسے لوگوں کو بہت جلد عوام میں قیادت مل جاتی ہے۔ جب کہ دوسری قسم کے لوگوں کو عوامی مقبولیت حاصل نہیں ہوتی۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ حقیقی نتائج صرف تدریج پسند لوگوں کے ذریعہ ہی نکلتے ہیں۔ نہرو جیسے لوگ ہنگامی تاریخ تو بناتے ہیں، مگر وہ تعمیری تاریخ بنانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

۱۵ جولائی ۱۹۸۴

میرے علم اور میرے تجربہ نے مجھے جو باتیں بتائی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ تمام بنیادی حقیقتیں لوگوں کو پہلے سے معلوم ہیں۔ وہ ہر آدمی کے شعور فطرت میں پیوست ہیں۔ البتہ بیشتر لوگ " سلف " میں اتنا گم رہتے ہیں کہ وہ شعوری طور پر صرف ان حقیقتوں کو پہچان پاتے ہیں، جو ان کے اپنے موافق پڑتی ہوں۔ اور جو حقیقتیں اپنے خلاف پڑ رہی ہوں ان کو وہ صرف دوسروں کی حد تک دریافت کر پاتے ہیں، اپنی ذات کے اعتبار سے وہ ان سے بے خبر رہتے ہیں۔

اسی (obsession) سے اپنے آپ کو اوپر اٹھانے کا نام معرفت ہے۔ جب آدمی کا یہ حال ہو جائے کہ وہ اپنی ذات سے الگ ہو کر حقیقت کو دیکھ سکے تو وہ گویا عارف بن گیا۔ یہ معرفت کا وہ درجہ ہے جب کہ آدمی چیزوں کو ویسا ہی دیکھنے لگتا ہے جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں (اللّٰھم ارنا الاشیاء کما ھی)

۱۶ جولائی ۱۹۸۴

کارڈیل ہل (Cordell Hull) کا قول ہے کہ مگرمچھ کی ہرگز توہین نہ کرو جب تک تم دریا کو پار نہ کر لو:

Never insult an alligator until you have crossed the river.

آدمی اگر ایک مگرمچھ کی پیٹھ پر بیٹھ کر دریا کو پار کر رہا ہو تو اس وقت اس کو کیا کرنا چاہئے۔ ایسے وقت میں اس کی بہترین عقلمندی یہ ہوگی کہ وہ دریا کے درمیان مگرمچھ کو نہ چھیڑے۔ وہ ہر ناخوشگواری کو اس وقت تک برداشت کرے جب تک دریا پار کرکے ساحل پر نہ پہنچ جائے۔ دریا کے بیچ میں مگرمچھ کو چھیڑنا یک طرفہ طور پر اپنی ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔

کوئی مگرمچھ کا سوار ایسا نہیں کرے گا کہ وہ دریا کے بیچ میں مگرمچھ کو چھیڑنے لگے۔ مگر ایسے نادان لوگ دنیا میں بہت ہیں جو دریا کے باہر آکر اس سبق کو بھول جاتے ہیں۔ حالانکہ دریا کے باہر بھی "مگرمچھ" ہیں۔ اور دریا کے باہر والے مگرمچھ سے بچنے کا اصول بھی وہی ہے جو دریا کے اندر والے مگرمچھ سے بچنے کا ہے۔

۱۷ جولائی ۱۹۸۴

ایک تاجر سے بات ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ ایک سچا دکاندار کبھی اپنے گاہک سے جھگڑا نہیں کرتا۔ اگر بالفرض کوئی جھگڑا پیدا ہو جائے تو دکاندار اس کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیتا ہے۔ جھوٹا دکاندار اپنے گاہک سے جھگڑا کر سکتا ہے مگر سچا دکاندار کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔

مذکورہ تاجر نے اس سے اتفاق کیا۔

میں نے کہا کہ ایسا ہی معاملہ داعی کا ہے۔ داعی اپنے مدعو سے کبھی جھگڑا نہیں کرتا۔ اور اگر جھگڑا پیدا ہو جائے تو وہ اس کو یک طرفہ طور پر ختم کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دکاندار کی نظر آدمی کی جیب پر ہوتی ہے اور داعی کی نظر آدمی کے دل پر۔ دکاندار آدمی کی جیب کو جیتنا چاہتا ہے اور داعی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ آدمی کے دل کو جیت لے۔ دونوں کے نشانہ میں ضرور فرق ہے، مگر دونوں کے طریق کار میں کوئی فرق نہیں۔

۱۸ جولائی ۱۹۸۴

میں ہمیشہ یہ کوشش کرتا ہوں کہ خطوط کا جواب اختصار کے ساتھ لکھوں۔ مجھے لمبا خط پڑھنے سے بھی وحشت ہوتی ہے اور لمبا جواب دینے سے بھی۔ احمد آباد کے ایک ڈاکٹر صاحب نے میرا وہ مضمون پڑھا جو ظہور اسلام میں شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے:

حسنین: تاریخ کے دو علامتی کردار۔

ڈاکٹر صاحب کا خط بہت لمبا، کئی صفحات کا تھا۔ انھوں نے مجھ کو بہت برا بھلا لکھا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ آپ نواسۂ رسول پر قلم اٹھائیں۔ میں نے طویل خط کا جواب صرف دو سطر میں لکھا۔ وہ جواب یہ تھا :

" میں نے اس مضمون میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا ہے کہ حسین کے مقابلہ میں حسن کے کردار کو نمایاں کیا ہے، اور وہ بھی بہر حال نواسۂ رسول تھے "

۱۹ جولائی ۱۹۸۴

ارسٹیپس (Aristippus) ایک یونانی فلسفی ہے جو سقراط کے شاگردوں میں سے تھا۔ وہ ۴۳۵ ق م میں پیدا ہوا اور ۳۶۶ ق م میں اس کی وفات ہوئی۔

ارسٹیپس کا مطالبہ تھا کہ فلسفہ کے معلمین کو تنخواہیں دی جائیں۔ اس کے زمانہ کے بادشاہ دایونی سیس (Dionysius) نے اس کے مطالبہ کو نہیں مانا۔ ارسٹیپس بادشاہ کے قدموں میں گر پڑا۔ اس کے بعد بادشاہ نے اس کے مطالبہ کو مان لیا۔

اس واقعہ کے بعد لوگوں نے ارسٹیپس کو برا بھلا کہا کہ تم ایک مالی منفعت کے لئے بادشاہ کے قدموں میں گر گئے۔ تمہارا یہ عمل فلسفہ کو حقیر بنانے (Degrading philosophy) کے ہم معنی ہے۔ ارسٹیپس بہت ذہین آدمی تھا، اس نے فوراً جواب دیا۔ یہ جواب مجھے ایک انگریزی کتاب میں ان الفاظ میں لکھا ہوا ملا کہ یہ میری غلطی نہیں، یہ بادشاہ کی غلطی ہے کہ اس کا کان اس کے پیروں میں ہے :

It was not my fault, but rather Dionysius's that his ears are in his feet

بعض اوقات منطقی انداز کا جواب مفید نہیں ہوتا۔ ارسٹیپس اگر اس کا منطقی جواب دیتا تو بحث جاری رہتی۔ اس نے لطیفہ کے انداز میں جواب دے کر اصل سوال کو بحث کے بجائے تفریح کی طرف موڑ دیا۔ اس کے اس جواب کو سن کر لوگ ہنس پڑے اور بات وہیں ختم ہو گئی۔

۲۰ جولائی ۱۹۸۴

موجودہ زمانہ میں مذہب ایک حقیر چیز بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ خود مذہب کوئی حقیر چیز ہے۔ اس کی ذمہ داری تمام تر مذہب کے نمائندوں پر ہے۔ انھوں نے غیر ضروری طور پر

مذہب کو ایسی چیزوں سے وابستہ کیا جو ازروئے واقعہ اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔ چنانچہ سائنسی دور میں جب یہ چیزیں غیر اہم ثابت ہوئیں تو اسی کے ساتھ مذہب بھی لوگوں کی نظر میں غیر اہم بن گیا۔

اس کی ایک مثال مسیحی حضرات کا کفارہ کا عقیدہ ہے۔ انھوں نے خود ساختہ طور پر یہ نظریہ قائم کیا کہ آدم کے شجر ممنوعہ کا پھل کھانے کے بعد تمام انسانی نسل گنہگار ہو گئی۔ انسانیت کو اس گناہ سے دھونے کے لئے ضروری تھا کہ خدا اپنے اکلوتے بیٹے کو زمین پر بھیجے اور وہ سولی پر چڑھ کر لوگوں کے پیدائشی گناہ کا کفارہ بنے۔ اس بے بنیاد نظریہ کی بنا پر انھوں نے یہ فرض کر لیا کہ زمین پوری کائنات کا مرکز ہے کیوں کہ خداوند اس کے اوپر اترا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ قدیم دور کا سب سے بڑا فلسفی ارسطو زمین کی مرکزیت (Geo-centric theory) کا قائل تھا تو فوراً انھوں نے اس کو اپنا کر اس کو اپنے علم کلام میں داخل کر لیا۔ حتی کہ اس عنوان پر بڑے بڑے معرکے ہوئے۔ جن علماء نے زمینی مرکزیت کے نظریہ کے خلاف نظریہ پیش کیا ان کو قتل کا حکم دے دیا گیا۔

موجودہ زمانہ کی تحقیقات نے بتایا کہ زمینی مرکزیت کا نظریہ بالکل غلط تھا۔ صحیح بات یہ ہے کہ شمسی نظام کا مرکز سورج ہے اور زمین اور دوسرے سیارے اس کے گرد گھومتے ہیں۔ اس دریافت نے براہ راست طور پر مسیحیت اور بالواسطہ طور پر سارے مذاہب کو لوگوں کی نظر میں حقیر بنا دیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کا مقالہ نگار مسیحیت (Christianity) کے ذیل میں لکھتا ہے:

"جدید معلومات کے مطابق زمین وسیع سمندر میں محض ایک آباد گھونگا ہے۔ اس حقیقت کی روشنی میں مسیح کی معنویت نے اپنا کچھ تاثر کھو دیا ہے۔ اور نجات کا خدائی عمل دنیا کی تاریخ میں محض ایک معمولی کہانی سے زیادہ نہیں رہا۔" (EB-4/522)

یہ جدید دور کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ مسیحی حضرات کی نادانی سے اولاً مسیحیت غیر اہم قرار پائی اور اس کے بالواسطہ نتیجہ کے طور پر سارے مذاہب۔

۲۱ جولائی ۱۹۸۴

مولانا ابواللیث اصلاحی (امیر جماعت اسلامی ہند) نے ایک بار جماعت کے افراد کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا:

"رفقائے جماعت کے جو حالات میرے علم میں ہیں، ان کے مطابق میرے احساسات ان کے بارہ میں مجملاً یہ ہیں کہ بحمد اللہ ان کے طرز عمل کے بعض پہلو تو اس درجہ امید افزا ہیں کہ ان کے پیش نظر ہم ہندستان میں تحریک اسلامی کے مستقبل کے بارہ میں کسی مایوسی کے بجائے بہت کچھ توقعات کو اپنے دل میں جگہ دے سکتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی تکلف مانع نہیں ہے بلکہ اس کا اظہار میں ازبس ضروری سمجھتا ہوں کہ بعض دوسرے پہلوؤں سے ان کا طرز عمل انتہائی قابل توجہ اور قابل اصلاح بھی ہے۔ یہاں تک کہ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر ان پہلوؤں کی طرف جلد توجہ نہ کی گئی تو آگے چل کر یہ تحریک کی کامیابی کے لئے سخت رکاوٹ ثابت ہوں گے اور امیدوں کے مقابلہ میں مایوسیوں کا پلڑا یقیناً بھاری ہو جائے گا۔" اشارات، ماہنامہ زندگی، دسمبر ۱۹۵۵

سادہ لوح قسم کے لوگ اس اندازِ کلام کو "متوازن" انداز سمجھتے ہیں۔ مگر یہ سراسر بے فائدہ بلکہ غیر پیغمبرانہ اندازِ کلام ہے۔ مذکورہ مضمون نصیحت کے مقصد سے لکھا گیا ہے، اور نصیحت کے لئے مذکورہ بالا قسم کا دو طرفہ کلام بالکل غیر حکیمانہ ہے۔ نصیحت کے لئے ہمیشہ یک طرفہ کلام درکار ہوتا ہے تاکہ سامع کی ساری توجہ صرف قابل اصلاح پہلو پر پڑے، اس کی توجہ دو طرف بھٹکنے نہ پائے۔

۲۲ جولائی ۱۹۸۴

ہر بستی اور ہر محلہ میں ایسا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو پریشان کرتا ہے۔ مگر اس طرح کے معاملات میں ہمارے لیڈر اور رہنما کبھی نہیں اٹھتے۔ وہ ہمیشہ ان معاملات میں اٹھتے ہیں جہاں معاملہ مسلم اور غیر مسلم کا ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انفرادی واقعات پر کبھی قومی نفسیات نہیں بھڑکتی۔ کسی قوم کی اجتماعی نفسیات صرف اجتماعی واقعات پر بھڑکتی ہے۔ ہمارے لیڈر اگر ایک شخص کے واقعہ کو لے کر اٹھیں تو نہ بھیڑ جمع ہوگی اور نہ انھیں شہرت ملے گی۔ مگر جب وہ ایک اجتماعی واقعہ ــــــ خاص طور پر غیر مسلم کا ظلم ــــــ لے کر اٹھتے ہیں تو تمام مسلمانوں کی اجتماعی نفسیات بھڑک اٹھتی ہے۔ انھیں فوراً لیڈری کا مقام مل جاتا ہے۔

اس قسم کی تمام سرگرمیاں محض لیڈری ہیں۔ ان کا خدمت اسلام یا خدمت ملی سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک لفظ میں سچے رہنما اور جھوٹے رہنما کی پہچان یہ ہے کہ سچا رہنما فرد کے مسئلہ کے لئے تڑپتا ہے اور جھوٹا رہنما صرف اس مسئلہ کے لئے جو قومی نوعیت اختیار کر لے۔

۲۳ جولائی ۱۹۸۴

ایک عرب سفارت خانہ کے ایک صاحب ملنے کے لئے آئے۔ انھوں نے ایک واقعہ بتایا۔

جنتا پارٹی کی حکومت کے زمانہ میں ایک بار مراکو کے سفیر نے ہندستانی مسلمانوں کے معاملہ میں حکومت ہند کی متعصبانہ پالیسی پر سخت بیان دیا اور یہ کہا کہ اکثر مسلم ممالک کے سفراء اس معاملہ میں ان کے ہم خیال ہیں۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ ایک پارٹی کے موقع پر مسلم سفیروں نے مشترک طور پر اس قسم کا اظہار خیال کیا تھا۔ اور اسی کو مراکو کے سفیر نے دہرایا۔

اگلے دن حکومت ہند کے محکمہ خارجہ کی طرف سے اس کا سخت نوٹس لیا گیا تو تمام مسلم سفیروں نے اس سے انکار کر دیا۔ اب معاملہ مراکو کے سفیر کی گردن پر تھا۔ ان کو وزارت خارجہ میں بلا کر کہا گیا کہ آپ کا یہ بیان آداب سفارت کے خلاف ہے اور حکومت آپ کو غیر مطلوب شخصیت (Persona Nongreta) قرار دے کر ملک سے نکال دے گی۔ اب مراکو کا سفیر بہت گھبرا گیا۔

اس وقت اٹل بہاری باجپئی وزیر خارجہ تھے۔ باجپئی کے ایک دوست کے ذریعہ باجپئی کو ۵۰ ہزار روپے کی رشوت دے کر مراکو کے سفیر نے اپنی جان بچائی۔ مراکو کے سفیر کی پریشانی یہ تھی کہ اگر ان کو غیر مطلوب شخصیت قرار دے کر نکال دیا جاتا ہے تو وہ خود اپنے ملک میں سفارتی کام کے لئے نا اہل قرار پائیں گے اور آئندہ کے لئے ان کا کیریر خراب ہو جائے گا۔ یہ واقعہ ۱۹۷۸ کا ہے۔

یہی عام مسلم رہنماؤں کا حال ہے۔ وہ ملت کے معاملہ میں لفظی کریڈٹ لینے کے لئے بہادر ہیں۔ لیکن جب اس کی عملی قیمت دینے کا وقت آئے تو وہ فوراً بزدل بن جاتے ہیں۔

۲۴ جولائی ۱۹۸۴

مجھے انسانوں سے بے حد تکلیفیں پہنچیں۔ یہ "انسان" سب کے سب مسلمان تھے۔ اس بنا پر میں بہت غمگین رہتا تھا کہ یہ لوگ مسلمان ہو کر ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ جب کہ یہ لوگ اصاغر ہی نہیں بلکہ اکابر بھی تھے۔ وقت کے اکثر اکابر مجھے ستانے میں اور تکلیف دینے میں یکساں طور پر شریک رہے ہیں۔

آخر کار ایک احساس نے مجھے مطمئن کر دیا۔ میں اس رائے پر پہنچا کہ ان لوگوں کے یہاں ہر قسم کا اسلام ہے۔ مگر ایک چیز ایسی ہے جو ان کے یہاں سرے سے موجود ہی نہیں۔ اور وہ خدا کا خوف ہے۔

اور جب آدمی خدا کے ڈر سے خالی ہو جائے تو اس سے کوئی بھی چیز بعید نہیں رہتی۔

اللہ کے ڈر سے خالی انسانوں کے درمیان رہنا ایسا ہی ہے جیسے آدمی ایک ایسے زو (چڑیا گھر) میں ہو جہاں تمام درندے اپنے پنجروں سے باہر آگئے ہوں۔ ایسے زو کا تصور کیجئے جہاں ریچھ اور بھیڑیے آزادانہ پھر رہے ہوں۔ جانور پنجرے سے باہر ہو کر بے مہار ہو جاتا ہے اور انسان خدا کے خوف سے خالی ہو کر۔

۲۵ جولائی ۱۹۸۴

ایک صاحب سے میں نے زور دیا کہ وہ الرسالہ کی ایجنسی لیں۔ وہ الرسالہ پڑھتے ہیں۔ الرسالہ کے مضامین سے اتفاق بھی رکھتے ہیں مگر وہ اس کی ایجنسی نہیں چلاتے۔ میں نے اصرار کیا تو انہوں نے ہنس کر کہا:

کیا الرسالہ کی ایجنسی چلانے سے جنت ملے گی۔

میں نے کہا کہ یوں نہ کہئے، بلکہ اپنے سوال کو بدل دیجئے۔ اس طرح کہئے ——— کیا لوگوں کو اللہ والا بنانے کی کوشش سے جنت ملے گی۔ کیا لوگوں کو آخرت پسند بنانے کی کوشش سے جنت ملے گی۔ کیا اس سے جنت ملے گی کہ لوگوں کے اندر دینی مزاج پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

میں نے پوچھا کہ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ الرسالہ اسی قسم کی ایک کوشش ہے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ میں نے کہا کہ پھر آپ اس کو "ایجنسی" چلانا کیوں کہتے ہیں۔ اس کو دینی مہم چلانا کہئے۔ ایجنسی تو ایک عملی تدبیر ہے۔ پریس کے دور نے ایجنسی کی تدبیر پیدا کی ہے۔ یہ شرعی مسئلہ ہے کہ جب مقصود واجب ہو تو اس کی تدبیر بھی واجب ہو جاتی ہے۔ پھر جب الرسالہ کی فکری مہم ایک ضروری مہم ہے تو وہ تدبیر بھی ضروری ہو جائے گی جو اس فکری مہم کو پھیلانے میں مددگار ہو۔

پھر میں نے کہا کہ ایجنسی کا طریقہ ایک مسنون طریقہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے ۲۳ سال میں اترا۔ آجکل کی زبان میں قرآن گویا ایک قسم کا (Periodical) تھا۔ جب قرآن کا کوئی حصہ اترتا تو صحابہ اس کو لے لیتے اور جا کر جگہ جگہ اسے سناتے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن ایک پیریڈیکل تھا اور ہر صحابی اس کی ایجنسی لئے ہوئے تھا۔ اسی طریقہ کو ہم نے موجودہ زمانہ کے اعتبار سے اختیار کیا ہے۔

۲۶ جولائی ۱۹۸۴

دور جدید کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ان کا غلط مزاج ہے اور یہ غلط مزاج تمام تر ان مسلم رہنماؤں کا پیدا کردہ ہے جو اس دور میں اٹھے۔

اس دور کے مسلم رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی شاید خدا کو دریافت نہ کرسکا۔ ہر ایک کی دریافت بس مسلم تاریخ تک محدود رہی۔ کسی نے حال کی تاریخ کو دریافت کیا اور کسی نے ماضی کی تاریخ کو۔ جس رہنما نے حال کی تاریخ کو دریافت کیا اس نے مسلمانوں کو لڑائی کا سبق دیا۔ اور جس رہنما نے ماضی کی تاریخ کو دریافت کیا اس نے مسلمانوں کو فخر کا سبق دیا۔ بس انھیں دو الفاظ میں مسلمانوں کی پوری جدید نسل کا خلاصہ چھپا ہوا ہے۔

یہ رہنما اگر خدا کو دریافت کرتے تو وہ مسلمانوں کو عجز اور تواضع کا سبق دیتے۔ کوئی رہنما مجھے حقیقی معنوں میں عجز اور تواضع کا سبق دیتا ہوا نظر نہیں آیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی نے خدا کو دریافت بھی نہیں کیا۔ ہمارے رہنما سب کے سب قومی تاریخ میں اٹکے رہے۔ ان میں سے کوئی بھی خدا تک نہیں پہنچا۔

۲۷ جولائی ۱۹۸۴

ایک صاحب کا خط آیا۔ انھوں نے اس پر سخت غصہ کا اظہار کیا ہے کہ تم ہمارے بڑوں پر تنقید کیوں کرتے ہو۔ میرا ارادہ ہے کہ میں انھیں جواب دوں کہ آپ نے غلط لفظ استعمال کیا۔ آپ نے لکھا ہے کہ تم ہمارے بڑوں پر تنقید کیوں کرتے ہو۔ آپ کو لکھنا چاہئے کہ تم ہمارے خداؤں پر تنقید کیوں کرتے ہو۔

جن شخصیتوں پر الرسالہ میں تنقید آئی ہے، ان کو اگر آپ محض انسانی شخصیت سمجھتے تو آپ کبھی اس طرح برہم نہ ہوتے۔ اصل یہ ہے کہ آپ ان کو اپنا خدا سمجھتے ہیں۔ آپ ان کو معبود کا درجہ دئے ہوئے ہیں۔ انسان پر تنقید قابل برداشت ہے۔ مگر خدا پر تنقید قابل برداشت نہیں ہے۔ یہ اصل وجہ ہے آپ کی برہمی کی۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننا بے حد مشکل کام ہے۔ بیشتر لوگ جو خدا کو مانتے ہیں وہ خدا کو نہیں مانتے۔ خدا کو ماننا آسان کام نہیں۔ خدا کو ماننا کسی شخص کے لئے اس وقت ممکن ہوتا ہے جبکہ

وہ خود اپنے اندر ایک عظیم الشان فکری انقلاب لا چکا ہو۔ اس کے لئے آدمی کو محسوسات سے اوپر اٹھنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے آدمی کو وہ انسان بننا پڑتا ہے جو نہ دکھائی دینے والی چیز کو دیکھے اور نہ سنائی دینے والی بات کو سنے۔ جو ایک خدا کے سوا ہر دوسری چیز کی نفی کر چکا ہو۔

عام لوگ اپنے آپ کو اس سطح تک اٹھا نہیں پاتے، یہی وجہ ہے کہ وہ خدا کا ادراک کرنے والے بھی نہیں بنتے۔ وہ ایک ایسے انسان ہوتے ہیں جو صرف محسوسات کو جانتا ہے۔ وہ نظر آنے والی ہستیوں کو دیکھ پاتا ہے، نہ دکھائی دینے والی ہستی اسے نظر نہیں آتی۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ صرف بڑے انسانوں کو جانیں گے، وہ بڑے خدا کو جاننے والے نہیں بن سکتے۔

۲۸ جولائی ۱۹۸۴

ہندستان کے مسلمانوں میں جو بدعات رائج ہوئیں ان میں سے ایک "بی بی کی صحنک" تھی جو حضرت فاطمہ کے نام پر کی جاتی تھی۔ مولانا اسماعیل صاحب نے اپنے مواعظ میں اس کے خلاف بولنا شروع کیا۔ ایک روز ایک بڑھیا اپنے گھر سے غصہ کی حالت میں نکلی۔ اس کو ایک مولوی صورت آدمی مل گئے۔ اس نے ان سے کہا: یہ موا اسماعیل کون ہے جو بی بی کی صحنک کو منع کرتا ہے۔

یہ بزرگ خود مولانا اسماعیل شہید تھے۔ انھوں نے برجستہ جواب دیا: اسماعیل نہیں منع کرتا، بی بی جی کے ابا منع کرتے ہیں۔ بڑھیا پر اس جواب کا بہت اثر ہوا۔ اس نے اس قسم کی بدعات سے توبہ کر لی۔ (علماء ہند کی شاندار ماضی، حصہ سوم، صفحہ ۲۷)

بعض اوقات ہلکا پھلکا ایک جواب علمی اور منطقی جواب سے زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔

۲۹ جولائی ۱۹۸۴

راجر آشن (Roger Aschan) نے کہا ہے کہ وہ سمجھ بہت مہنگی ہے جو تجربہ کے ذریعہ خریدی گئی ہو:

It is costly wisdom that is bought by experience

اس میں شک نہیں کہ تجربہ کے بعد جو سمجھ آتی ہے وہ بہت زیادہ مہنگی ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ بہت زیادہ کھو کر حاصل کی جاتی ہے۔ مگر اس دنیا میں بہت کم لوگ ہیں جو اس مہنگی خریداری سے مستثنیٰ ہوں اس دنیا میں بیشتر لوگوں کا حال یہی ہے کہ وہ کھونے کے بعد پاتے ہیں۔ وہ نقصان اٹھانے کے بعد

سمجھدار بنتے ہیں۔ دوسروں کے تجربہ سے اپنے لئے سبق لینا اتنا کمیاب ہے کہ ساری تاریخ میں ایسے لوگ بہت کم ملیں گے جو اس معیار پر پورے اتریں۔

۳۰ جولائی ۱۹۸۴

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۷۹-۱۹۰۳) ترکی کے سلطان عبدالحمید ثانی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اس نے تعمیر کے بہترین زمانہ (۱۹۰۹-۱۸۷۶) کو، جس کی ایک ایک ساعت بیش قیمت تھی، تخریب میں کھو دیا۔ اس نے ترکی قوم کے بہترین دماغوں کو برباد کیا۔ جمال الدین افغانی جیسا بے نظیر آدمی اسے ملا اور اس کو بھی اس شخص نے ضائع کر دیا۔" تنقیحات، صفحہ ۸۷

یہ بات جو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ترکی کے سلطان کے بارہ میں کہی، وہی اپنے دائرہ کے لحاظ سے خود مولانا مودودی پر بھی صادق آتی ہے۔ سلطان ترکی نے "۳۳ سال" ضائع کئے تھے۔ ٹھیک اسی طرح سید ابوالاعلیٰ مودودی کو بھی پاکستان میں "۳۳ سال" ملے اور اس کو انھوں نے تخریبی سرگرمیوں میں کھو دیا۔

پاکستان ۱۹۴۷ میں بنا۔ عین اسی وقت مولانا مودودی پاکستان پہنچ گئے۔ ان کو وہاں کام کرنے کے بہترین مواقع ملے۔ مگر انھوں نے یہ ساری مدت حکمرانوں کے خلاف تحریکیں چلانے میں ضائع کر دیں۔ کبھی لیاقت علی خاں کے خلاف۔ کبھی محمد ایوب خاں کے خلاف۔ کبھی ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف۔ پاکستان کے پورے زمانہ قیام میں وہ حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی منفی سرگرمیوں میں لگے رہے اور کوئی حقیقی مثبت کام نہ کیا۔ مواقع کی یہ بربادی اپنے دائرہ عمل کے لحاظ سے سلطان عبدالحمید ثانی سے کم درجہ کا جرم نہیں ہے۔

جمال الدین افغانی کا معاملہ یہ ہے کہ سلطان عبدالحمید نے اولاً ان کی بہت قدر دانی کی اور انھیں زبردست مواقع کار دئے۔ مگر جمال الدین افغانی انتہائی احمقانہ طور پر خود سلطان کے مخالف ہو گئے۔ یہ صحیح ہے کہ سلطان نے مخالفت کے بعد ان کی قدر دانی نہیں کی۔ مگر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے حالات بتاتے ہیں کہ وہ خود بھی اپنے مخالفین کی قدر دانی نہ کر سکے۔ حتی کہ انھوں نے اپنے ان ساتھیوں کو ذلیل کرنے کی کوشش کی جنھوں نے ان سے اختلاف رائے کیا تھا۔ دوسروں سے اپنے مخالف

کی قدر دانی کا مطالبہ صرف وہ شخص کرسکتا ہے جس نے خود بھی اپنے مخالفوں کی قدر دانی کرنے کا ثبوت دیا ہو۔

۳۱ جولائی ۱۹۸۴

جو سوچ کر نہ سمجھے وہ دیکھ کر بھی نہیں سمجھ سکتا۔ جس شخص کی عقل اس کو نہ بتائے، اس کی آنکھ بھی اس کو نہیں بتا سکتی۔ قرآن کے الفاظ میں ـــــ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں (الحج ۴۶)

یکم اگست ۱۹۸۴

دور اول میں اسلام کو جو فتوحات حاصل ہوئیں وہ ساری انسانی تاریخ کا واحد واقعہ ہے۔ ایسا واقعہ نہ اس سے پہلے کوئی ہوا اور نہ اس کے بعد۔ اس واقعہ کا یہی تفرد یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ انسانی واقعہ نہیں۔ وہ ایک خدائی واقعہ ہے۔

اگر وہ سادہ معنوں میں ایک "انسانی واقعہ" ہوتا تو وہ واحد نہیں ہوسکتا تھا۔ تمام دوسرے انسانی واقعات جو ہم کو معلوم ہیں ان میں تعدد پایا جاتا ہے، پھر یہی ایک واقعہ ایسا کیوں ہے جو استثنائی طور پر تفرد کی خصوصیت رکھتا ہے۔

اسلامی انقلاب کا یہ پہلو اس کی صداقت کے حق میں ایک تاریخی ثبوت ہے۔ وہ اس کو سچا خدائی مذہب ثابت کرتا ہے۔

۲ اگست ۱۹۸۴

فرقہ وارانہ فساد کے سلسلے میں عام طور پر چند خاص فرقہ پرست لیڈروں کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ انھوں نے ایسا کہا، انھوں نے ایسا لکھا، ان کے ایسے اور ایسے خیالات ہیں۔

اس سلسلہ میں بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا یہی چند لیڈر فساد کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے چند لیڈر خود کبھی فساد نہیں کرسکتے۔ انھیں فساد کرنے کے لئے عوام کو ساتھ لینا پڑتا ہے۔ اور عوام کو ان لیڈروں کا ساتھی بنانے کا کام مسلمان کرتے ہیں۔

مسلمان جذباتی قوم ہیں۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی چھوٹے سے واقعہ پر مشتعل ہو کر کوئی حرکت کر ڈالتے ہیں۔ فرقہ پرست لیڈر اس واقعہ کو لے کر عوام کو بھڑکاتا ہے۔ اگر مسلمان چھوٹی چھوٹی

چیزوں کو برداشت کرنا سیکھ جائیں تو لیڈروں کو یہ موقع ہی نہ ملے کہ وہ عوام کو بھڑکا سکیں۔

فرقہ پرست لیڈر مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ مگر یہ بات یقینی طور پر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے کہ وہ ایسا فعل نہ کریں جو انھیں عوام کو بھڑکانے کا موقع دے۔ گویا فرقہ وارانہ فساد کی ڈھیل اگر فرقہ پرست ہندو لیڈروں کے ہاتھ میں ہے تو اس کا بریک مسلمانوں کے قبضہ میں ہے۔ مسلمان اگر اس راز کو جان لیں تو وہ ہر فساد کو روک سکتے ہیں۔ مسلمان اشتعال انگیز حرکت نہ کرکے فرقہ پرست لیڈروں کو ان کے عوام سے کاٹ سکتے ہیں۔

۲ اگست ۱۹۸۴

آدم اور ابلیس کے سلسلہ میں ایک لمبی بحث تفسیر کی کتابوں میں یہ ہے کہ آدم کی جنت آسمان میں تھی اور شیطان آدم کو سجدہ نہ کرنے کے نتیجہ میں پہلے ہی آسمان سے نکال دیا گیا تھا۔ پھر اس کے لئے کیوں کر ممکن ہوا کہ وہ آسمان پر پہنچ کر جنت میں داخل ہوا اور آدم و حوا کو بہکائے۔ اس سوال کے کئی جواب دئے گئے ہیں۔

۱۔ جنت میں شیطان کے لئے باعزت داخلہ منع تھا۔ البتہ چور کی مانند داخل ہونے کا راستہ اس کے لئے پھر بھی کھلا ہوا تھا۔

۲۔ بعض لوگوں کے نزدیک شیطان سانپ کے منھ میں داخل ہوکر جنت کے اندر پہنچا۔

۳۔ ایک رائے یہ ہے کہ وہ جنت کے اندر نہیں گیا۔ بلکہ جنت کے دروازہ پر کھڑے ہو کر اس نے آدم کو بہکایا۔

۴۔ ایک رائے کے مطابق وہ زمین ہی پر تھا۔ اور وسوسہ اندازی کے ذریعہ اس نے آدم کو بہکایا جو آسمان میں تھے (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول صفحہ ۸۱)

اس قسم کی بے فائدہ بحثیں کثرت سے ہماری تفسیروں میں بھری ہوئی ہیں۔ اور ان بحثوں نے تفسیر قرآن کو عملاً قاری کے لئے بے فائدہ بنا دیا ہے۔ وہ غیر ضروری بحثوں اور غیر متعلق معلومات کے ڈھیر میں گم ہو جاتا ہے اور قرآن کے اصل مدعا علیہ تک نہیں پہنچتا۔

۴ اگست ۱۹۸۴

کسی پرچہ میں میں نے ایک مقولہ پڑھا جو مجھے پسند آیا ——— "زندگی کا ہر لمحہ

جو آپ صرف کرتے ہیں، اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ آخری طور پر صرف کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ لمحہ دوبارہ آپ کی طرف واپس آنے والا نہیں"۔ کتنی اہم بات ہے یہ، مگر اسی سب سے زیادہ اہم بات کو انسان سب سے زیادہ بھولا ہوا ہے۔

۵ اگست ۱۹۸۴

ٹیگور (۱۹۴۱ - ۱۸۶۱) کو حکومت برطانیہ نے ۱۹۱۵ میں سر کا خطاب دیا تھا۔ ۱۹۱۹ میں جب انگریزی حکومت نے امرتسر میں نہتے ہندستانیوں پر گولی چلائی تو ٹیگور نے سر کا خطاب واپس کر دیا۔

اقبال (۱۹۳۸ - ۱۸۷۷) کو حکومت برطانیہ نے ۱۹۲۲ میں سر کا خطاب عطا کیا۔ اقبال نے اس کو قبول کر لیا اور کبھی اس کو واپس نہیں کیا۔

میں ذاتی طور پر سر کا خطاب لینے کو غلط نہیں سمجھتا۔ مگر اقبال اپنی شاعری میں جس قسم کی اونچی باتیں کرتے ہیں اس کے لحاظ سے انگریزی حکومت کا دیا ہوا سر کا خطاب ان کے لئے موزوں نہ تھا۔ ایک طرف وہ "قصر سلطانی" کے گنبد پر نشیمن بنانے والوں کا مذاق اڑاتے رہے، اور دوسری طرف خود قصر سلطانی کے گنبد ہی پر اپنا نشیمن بنایا۔

تضاد یا دوعملی کی یہ قسم موجودہ زمانہ کے بیشتر مسلم قائدین کے یہاں نظر آتی ہے۔ اس دوعملی سے خود قائدین کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ مگر مسلمان بحیثیت قوم برباد ہو کر رہ گئے۔

۶ اگست ۱۹۸۴

سر سید احمد خاں نے ۱۸۷۷ میں علی گڑھ میں مسلمانوں کا کالج قائم کیا۔ اس وقت ہندستان میں انگریزوں کا دبدبہ تھا۔ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے انھیں اس کا نام اینگلو محمڈن کالج رکھنا پڑا۔ اس کالج کا سنگ بنیاد اس وقت کے انگریز وائسرائے نے رکھا تھا۔ اس وقت اگر سر سید یہ اصرار کرتے کہ کالج کے نام میں نہ اینگلو کا لفظ ہو گا اور نہ محمڈن کا، بلکہ صرف مسلم کالج ہو گا تو نہ اس کالج کو منظوری ملتی اور نہ انگریز وائسرائے اس کا سنگ بنیاد رکھتا۔

اس کے بعد حالات بدلے۔ خلافت تحریک اور آزادی کی تحریک نے انگریزوں کے دبدبہ میں بہت کمی کر دی۔ ہندستانی عوام بے باکانہ طور پر انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ انگریز

اپنے آپ کو دفاعی پوزیشن میں محسوس کرنے لگا۔ ان حالات میں تقریباً ۴۵ سال بعد ۱۹۲۱ میں اینگلو محمڈن کالج ترقی کرکے یونیورسٹی بنا اور اس کے حق میں حکومت نے ایکٹ پاس کیا۔ مگر اب اس کا نام اینگلو محمڈن یونیورسٹی نہیں تھا، بلکہ صرف مسلم یونیورسٹی تھا۔

۱۸۷۷ میں سرسید اگر نام کے مسئلہ پر اصرار کرتے تو ان کی تعلیمی تحریک پہلے ہی مرحلہ میں ناکام ہو کر رہ جاتی۔ نام کے معاملہ میں انھوں نے مفاہمت کا طریقہ اختیار کیا۔ چنانچہ انھیں انگریزوں کا تعاون ملا۔ اور اسی کی وجہ سے نوابوں اور زمینداروں نے ان کو بڑے بڑے چندے دئے۔ تاہم یہ مفاہمت وقتی مفاہمت تھی۔ چنانچہ بعد کو جب حالات بدلے تو کسی نقصان کا خطرہ مول لئے بغیر اس کا نام مسلم یونیورسٹی ہو گیا ——— جو شخص حال میں کم پر راضی ہو جائے وہی مستقبل میں زیادہ کا مالک بنتا ہے۔

۷ اگست ۱۹۸۴

ہندستان کے مسلمانوں نے ۱۸۵۷ میں انگریزوں سے جنگ کی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو مکمل شکست ہوئی۔ ۱۸۶۰ میں ہندستان کے مسلمانوں نے جان لیا کہ انگریزوں کی سلطنت ہندستان میں ایک مسلمہ امر بن چکی ہے۔ اس وقت ہندستان کے مسلم علماء کا پہلا ردعمل کیا ہوا۔ یہ کہ ہندستان کے مسلمانوں کو انگریزی تہذیب اور انگریزی تعلیم سے بچایا جائے۔ اسی کے تحت ملک میں کثرت سے عربی مدارس قائم کئے گئے۔

یہ ناقص ردعمل کی بڑی عجیب مثال ہے۔ انگریزوں کے مقابلہ میں شکست کا اصل ردعمل یہ ہونا چاہئے تھا کہ مسلم علماء میں یہ ذہن ابھرے کہ انگریزوں کے پاس وہ کون سی طاقت ہے کہ وہ باہر سے آکر ملک میں قابض ہو گئے ہیں۔ اور پھر ان کی طاقت کو جان کر اس کو حاصل کیا جائے اور پھر ان کے خلاف زیادہ مؤثر انداز میں اقدام کیا جائے۔

صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد عیسائیوں میں یہ ذہن ابھرا تھا کہ مسلمانوں کی طاقت کے راز کو جانیں۔ انھوں نے تیزی سے عربی زبان سیکھی اور مسلمانوں کے علوم کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ مگر جب تاریخ بدلی اور دور جدید میں مسلمانوں کو مسیحی اقوام کے مقابلہ میں شکست ہوئی تو مسلمان یہ نہ سوچ سکے کہ وہ مسیحی قوموں کی طاقت کے راز کو جانیں اور اپنے آپ کو اس کے اعتبار سے مسلح کریں۔ وہ صرف "تحفظ"

کی نفسیات میں بند ہو کر رہ گئے۔

۸ اگست ۱۹۸۴

مسلمان ساری دنیا میں تقریباً ۱۰۰ کرور ہیں۔ ان میں تقریباً ۳۰ کروڑ وہ ہیں جو اردو اور عربی زبان بولتے ہیں۔ بقیہ ۷۰ کروڑ مسلمان دوسری زبانیں بولتے ہیں، مثلاً ترکی، فارسی، ہندی، بنگالی، انڈونیشی، ملائی، وغیرہ۔

اسلامی لٹریچر تیار کرنے کا کام جتنا عربی اور اردو میں ہوا ہے، اس کی نسبت سے دوسری زبانوں میں بہت کم ہوا ہے۔ یہ بہت نقصان کی بات ہے۔ یا تو سارے مسلمان عربی بولنے اور سمجھنے والے بن گئے ہوتے۔ یا پھر تمام زبانوں میں طاقت ور اسلامی لٹریچر تیار کیا گیا ہوتا۔ اس غفلت کا نتیجہ یہ ہوا کہ عالمی سطح پر مسلمانوں کی نصف سے زیادہ تعداد تقریباً معطل ہو کر رہ گئی۔

عیسائی لوگ انجیل کا ترجمہ دنیا کی دو سو زبانوں میں کر چکے ہیں جب کہ مسلمانوں نے ابھی تک قرآن کا ترجمہ دو درجن زبان میں بھی نہیں کیا۔ جو ترجمے کئے گئے ہیں ان میں بھی کثرت سے غلطیاں پائی جاتی ہیں۔

۹ اگست ۱۹۸۴

کسی شخص کا قول ہے کہ یقین اور تعصب کا فرق یہ ہے کہ تم یقین کی وضاحت غصہ کے بغیر کر سکتے ہو:

... a conviction and prejudice is that
you explain conviction without getting angry.
The Quotable Quotations Book, Edited by Alec Lewis

جب آدمی سے اس کے نقطہ نظر کے بارہ میں گفتگو کی جائے اور وہ غصہ اور جھنجھلاہٹ کے بغیر تمام باتوں کا جواب دے تو سمجھ لیجئے کہ وہ یقین پر کھڑا ہوا ہے۔ اور اگر ایسا ہو کہ جب اس سے اس کے نقطۂ نظر کے بارہ میں سوال کیا جائے تو وہ بگڑ جائے اور غیر متعلق باتیں کرنے لگے تو سمجھ لیجئے کہ اس کا کیس تعصب کا کیس ہے نہ کہ یقین کا کیس۔

۱۰ اگست ۱۹۸۴

مغل حکمراں جہانگیر بہت زیادہ شراب کا عادی تھا۔ وہ دن بھر میں بیس پیالے شراب پی جاتا تھا۔ یہ شراب بھی دو آتشہ یعنی بہت تیز ہوتی تھی۔ اس مے نوشی کا انجام یہ ہوا کہ آخر عمر میں وہ اتنا

کمزور ہوگیا کہ خود اپنے ہاتھ سے شراب کا پیالہ اپنے منھ تک نہیں لے جا سکتا تھا۔ اس کام کے لئے دوسرے آدمی مقرر تھے جو شراب کے پیالہ کو اس کے منھ سے لگاتے تھے۔ نور جہاں نے ایک بار شراب سے توبہ کرائی مگر وہ اس پر قائم نہ رہ سکا۔

جہاں گیر کا معاملہ عجیب تھا۔ وہ اگرچہ خود شراب پیتا تھا۔ مگر اس نے ملک بھر میں شراب کا استعمال ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اس کے وہ امرا جورات کو اس کے ساتھ بیٹھ کر شراب پیتے تھے وہ دن کے وقت دربار میں شراب کا ذکر تک نہیں کر سکتے تھے۔

جہاں گیر نے تخت پر بیٹھنے کے بعد یہ کیا کہ سونے کی ایک زنجیر دریائے جمنا کے کنارے سے شاہ موج (شاہی محل) تک بندھوا دی تاکہ اگر کسی کو بادشاہ سے فریاد کرنا ہو تو وہ زنجیر کھینچ کر بادشاہ کو مطلع کرے۔ اس زنجیر عدل میں ۶۰ گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ گھنٹیاں زنجیر کھینچتے ہی بجنے لگتی تھیں۔ اس زنجیر کے بنانے پر چار من سونا خرچ ہوا تھا۔ جیسے ہی گھنٹی بجتی بادشاہ فوراً سائل کو شکایت سننے کے لئے طلب کر لیتا تھا اور اسی وقت اس کا انصاف کرتا تھا۔

۱۱ اگست ۱۹۸۴

سیرت النبی از مولانا سید سلیمان ندوی (جلد چہارم، صفحہ ۱۱) میں نبوت و رسالت کے اثبات پر یہ دلیل دی گئی ہے: "انسان کی تمام حرکات ممکن ہیں، اس لئے مرجح کی ضرورت ہے۔ اختیاری ہیں، اس لئے عقل کی ضرورت ہے۔ خیر و شر کی محتمل ہیں، اس لئے رہنما کی ضرورت ہے۔ اسی رہنما کا نام پیغمبر ہے"۔

قدیم متکلمین اسی انداز پر استدلال کرتے تھے۔ اس استدلال کی بنیاد جس چیز پر ہے وہ قیاسی منطق ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کا انسان قیاسی منطق کو اہمیت نہیں دیتا۔ وہ کسی بات کی اہمیت صرف اس وقت مانتا ہے جب کہ وہ سائنٹفک استدلال کے ذریعہ ثابت کر دی گئی ہو۔ اس لئے جدید متکلمین کو صرف اس پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ قدیم استدلالات کو دہرا دیں۔ انھیں اسلامی عقائد کو جدید استدلال میں بیان کرنا چاہئے۔

مولانا قاری طیب صاحب اگرچہ خود اس کام کو نہ کر سکے، مگر وہ اس کی اہمیت تسلیم کرتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ آج کی ضرورت جدید طرز استدلال ہے۔ ان کے الفاظ میں، مسائل قدیم ہوں، دلائل جدید ہوں۔

۱۲ اگست ۱۹۸۴

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے پاس ہمیشہ سے زیادہ پیسہ ہے اور وہ ہمیشہ سے زیادہ خرچ کرنے کے لئے تیار بھی ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان "سمعہ" پسند ہو گئے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص شہرت کا دلدادہ ہے۔ انھیں چیزوں میں خرچ کرنے کے لئے ان کے اندر جذبہ ابھرتا ہے جن میں نیوز ویلو (News value) ہو۔ اور جن چیزوں میں نیوز ویلو نہ ہو ان میں خرچ کرنے کا جذبہ بھی ان کے اندر نہیں بھڑکتا۔

ہندستان میں چند ادارے ایسے ہیں جو خرچ کی اشتہاری مد بن چکے ہیں۔ ان کے حق میں ایسے تاریخی اسباب جمع ہو گئے ہیں کہ ان میں خرچ کیجئے تو آپ کا خوب اشتہار ہوگا۔ مثال کے طور پر دار العلوم دیوبند ایک اشتہاری مد ہے۔ دار العلوم ندوہ ایک اشتہاری مد ہے۔ دہلی کی شاہجہانی مسجد ایک اشتہاری مد ہے۔ جس شخص کے ہاتھ میں یہ ادارے ہوں اس کے ہاتھ میں گویا ایک زبردست اشتہاری مد ہے اور وہ ان کے نام پر جتنا چاہے پیسہ جمع کر سکتا ہے۔

مگر ان اشتہاری مدوں سے باہر کسی مد کے لئے سرمایہ اکٹھا کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا پتھر سے پانی نکالنا۔ مثال کے طور پر غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ ایک اہم ترین دینی فریضہ ہے۔ آپ اگر اس مقصد کے لئے اٹھیں تو خواہ آپ کتنے ہی مخلص ہوں، آپ نے کتنا ہی زیادہ کارکردگی کا ثبوت دیا ہو، کوئی آپ کو پیسہ دینے والا نہیں۔ یقینی ہے کہ آپ کی اسکیم مفلس کا چراغ بنی رہے گی۔

جو ادارہ جتنا زیادہ اشتہاری مد بن جائے اتنا ہی زیادہ کم کام اس میں ہوتا ہے۔ کام حقیقۃً نئے اداروں میں ہوتا ہے، مگر نئے ادارے اشتہاری مد نہیں ہوتے۔ اس لئے کوئی اس میں تعاون بھی نہیں کرتا۔

۱۳ اگست ۱۹۸۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو ایک دعا سکھائی۔ یہ دعا بہت چھوٹی سی ہے مگر نہایت بامعنی ہے:

اللهم أَلْهِمْنِي رُشْدِي وَقِنِي شَرَّ نَفْسِي (خدایا، میری ہدایت مجھ پر القا فرما اور میرے نفس کے شر سے مجھ کو بچا۔

۱۴ اگست ۱۹۸۴

اس دنیا کے لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ جو اپنے آپ کو نفع بخش ثابت کرے وہ دنیا میں سرفرازی حاصل کرے۔ قدیم زمانہ میں مسلمان دنیا والوں کے لئے نفع بخش بن کر سربلند ہوئے تھے۔ آج بھی وہ اسی وقت سربلند ہو سکتے ہیں جب کہ وہ دنیا والوں کے لئے دوبارہ نفع بخش بنیں۔

مسلمانوں کے لئے خدا کا قانون نہیں بدلے گا۔ البتہ مسلمان اگر چاہیں تو وہ خدا کے قانون کو استعمال کرکے اپنے حالات کو بدل سکتے ہیں۔ مسلمانوں کا ایک "مستقل ایڈوانٹج" یہ ہے کہ ان کے پاس خدا کی کتاب محفوظ حالت میں موجود ہے۔ وہ اس کی روشنی میں اٹھیں اور دوبارہ اپنے آپ کو اہل عالم کے لئے نفع بخش بنائیں۔ اس طرح وہ دوبارہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر سکتے ہیں کہ قدرت کا یہ قانون ان کے حق میں پورا ہو ــــــ وأمّا ما ينفع الناس فيمكث في الارض

۱۵ اگست ۱۹۸۴

خدا کو ماننا عجیب ہے۔ مگر خدا کو نہ ماننا اس سے زیادہ عجیب۔ جب ہم خدا کو مانتے ہیں تو ہم زیادہ عجیب کے مقابلہ میں کم عجیب کو اختیار کرتے ہیں۔

۱۶ اگست ۱۹۸۴

ایک زمانہ میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ نجات کے لئے ایمان (لاالٰہ الاّ اللہ کا اقرار) کافی ہے یا عمل بھی ضروری ہے۔ کچھ لوگ صرف ایمان کو کافی سمجھتے تھے، کچھ لوگ کہتے تھے کہ ایمان کے ساتھ عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ اس زمانہ میں کچھ لوگ امام وہب بن منبہ کے پاس گئے۔ ان سے جو گفتگو ہوئی وہ حسب ذیل ہے:

قيل له أليس لا اله الاّ الله مفتاح الجنة۔ قال، بلى ولكن ما من مفتاح الا وله اسنان۔ فان جئت بمفتاح له اسنان فتح لك۔ والاّ لم يفتح لك

امام ابن منبہ سے کہا گیا کہ کیا لاالٰہ الااللہ جنت کی کنجی نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ مگر ہر کنجی کے دانت ہوتے ہیں۔ اگر تم ایسی کنجی لائے جس میں دانت ہوں تو جنت تمہارے لئے کھول دی جائے گی اور اگر نہیں تو وہ نہیں کھولی جائے گی۔

آدمی اگر پائے ہوئے ہو تو وہ چند الفاظ میں وہ بات کہہ دیتا ہے جس کو نہ پایا ہوا آدمی بڑی

بڑی تقریروں اور لمبے لمبے مضامین میں بھی نہیں کہہ سکتا۔

۱۷ اگست ۱۹۸۴

پلیٹ فارم پر کچھ مسلمانوں نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو ایک ہندو مسافر نے ایک مسلمان سے کہا: آپ لوگ نماز میں بار بار اللہ اکبر کہہ رہے۔ کیا آپ اکبر بادشاہ کو یاد کر رہے تھے۔"

ایک اور موقع پر ایک ہندو نے ایک مسلمان سے کہا کہ پگ (pig) جو آپ لوگ نہیں کھاتے تو کیا آپ اس کو سیکرڈ انیمل (sacred animal) سمجھتے ہیں۔

اس قسم کی باتیں جو دوسرے مذہب کے لوگ مسلمانوں سے کہتے ہیں وہ طنزاً بھی ہو سکتی ہیں۔ اور بے خبری کی بنا پر بھی۔ تاہم جو بھی وجہ ہو اس کے اصل ذمہ دار خود مسلمان ہیں۔ کیوں کہ طنز اس چیز پر کیا جاتا ہے جس کی عظمت لوگوں کے دلوں پر قائم نہ ہو۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں اپنی غفلتوں اور نادانیوں سے اسلام کو بے عظمت کر دیا اس لئے لوگوں کو ہمت ہو رہی ہے کہ وہ اس پر طنز کریں۔

اور اگر یہ باتیں بے خبری کی بنا پر ہیں تو مسلمانوں کا جرم اور بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے لوگوں کو مسلمانوں نے اسلام سے آگاہ نہیں کیا۔

۱۸ اگست ۱۹۸۴

جو لوگ شراب کو جائز سمجھتے ہیں وہ اپنے حق میں ایک دلیل یہ دیتے ہیں کہ اگر انگور کھایا جا سکتا ہے تو اس کے عرق میں کیا خرابی ہے کہ اس کو حرام سمجھا جائے۔ یہ دلیل نہیں بلکہ دھاندلی ہے۔ کیوں کہ کوئی شخص بھی انگور کے عرق (جوس) کو حرام نہیں بتاتا بلکہ وہ اس رس کو حرام بتاتا ہے جس میں تبدیلی کے ذریعہ نشہ پیدا ہو گیا ہو۔

یہ استدلال ایسا ہی جیسے کوئی شخص کہے کہ مختلف غذاؤں میں کیمیائی تبدیلی کے بعد جو تیزاب اور سمیات بنتے ہیں، انھیں بھی غذا کے طور پر کھانا چاہئے، کیوں کہ اپنی ابتدا میں وہ غذا ہی تھے۔

۱۹ اگست ۱۹۸۴

ذوالنون مصری سے پوچھا گیا کہ آپ نے اپنے رب کو کیسے پہچانا۔ انھوں نے کہا: میں نے اپنے

رب کو اپنے رب سے پہچانا اور اگر رب کی مہربانی نہ ہوتی تو میں اپنے رب کو نہ پہچانتا:
(سئل ذو النون المصری بماذا عرفت ربك. فقال عرفت ربی بربی و لولا ربی ما عرفت ربی)

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز اللہ کی توفیق سے ملتی ہے، حتی کہ خود اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی۔

۲۰ اگست ۱۹۸۴

سورہ کہف میں حضرت موسیٰ اور ایک بندۂ خدا (حضرت خضر) کی ملاقات کا ذکر ہے۔ حضرت خضر نے تین واقعات کئے، تینوں کا ظاہر اچھا نہیں تھا۔ انھوں نے ایک کشتی کی لکڑی توڑ دی۔ انھوں نے ایک لڑکے کو ہلاک کر دیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ وعدہ کے باوجود بول پڑے۔ تاہم حضرت خضر نے جو کچھ کیا وہ اللہ کے حکم سے کیا۔ یہ کام ظاہری طور پر برے دکھائی دے رہے تھے، مگر حقیقت میں وہ نہایت مفید اور بامعنی کام تھے۔

اس میں یہ سبق ہے کہ کسی چیز کے ظاہر کو دیکھ کر اس پر حکم نہیں لگانا چاہئے۔ ایک چیز دیکھنے میں بظاہر بری ہوسکتی ہے۔ مگر عین ممکن ہے کہ وہ اپنی باطنی حقیقت کے اعتبار سے نہایت اچھی ہو۔

ان واقعات کی صورت میں یہ بتایا گیا ہے کہ چیزوں کو ان کی (face value) پر نہ لو، بلکہ ان کی اصل حقیقت کو سمجھو، اور اصل حقیقت کے اعتبار سے رائے قائم کرو۔

۲۱ اگست ۱۹۸۴

اسلام کی تاریخ کا ایک واقعہ وہ ہے جس کو ہجرت حبشہ کہا جاتا ہے۔ مکہ کے کچھ کمزور مسلمان دشمنوں کی ایذارسانیوں سے تنگ آکر قریب کے ملک حبش چلے گئے۔ اس وقت حبش کا بادشاہ نجاشی تھا۔ اس نے مسلمانوں کو پناہ دی اور کفار مکہ کی کوششوں کے باوجود ان کو نہ ستایا اور نہ اپنے ملک سے باہر نکالا۔

یہ ایک احسان کا معاملہ تھا۔ مسلمانوں نے اس احسان کا بدلہ اس طرح ادا کیا کہ انھوں نے افریقہ میں مصر سے لے کر مراکش تک حملے کئے اور ملکوں کو زیروزبر کر ڈالا۔ مگر حبش کی طرف رخ نہیں کیا، جبکہ حبش محض ایک کمزور ملک تھا۔ آٹھ سو سالہ اقتدار کے زمانہ میں بھی حبش میں کوئی مسلم فوج نہیں بھیجی گئی۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں احسان کی کتنی زیادہ اہمیت ہے۔ کوئی شخص یا کوئی قوم کسی کے ساتھ احسان کرے تو اس کا احسان ہر حال میں ماننا چاہئے۔

۲۲ اگست ۱۹۸۴

سورہ انفال (آیت ۱۱) میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بدر کی لڑائی کے موقع پر آسمان سے پانی برسایا تاکہ اس کے ذریعہ سے تمہیں پاک کرے (لیطھرکم بہ ویذھب عنکم رجز الشیطان)

ایک مفسر قرآن لکھتے ہیں کہ کفار نے چونکہ پہلے وہاں پہنچ کر پانی کے چشمہ پر قبضہ کر لیا تھا اس لئے مسلمانوں کو تشویش تھی کہ وضو کیسے ہوگا، طہارت کے لئے کیا ہے گا، غسل کی ضرورت پیش آئی تو کیا صورت ہوگی۔ صحابہ نے اس موقع پر پانی کے مسئلہ پر غور کیا ہوگا تو ان کے سامنے یہ باتیں آئی ہوں گی۔" اللہ تعالیٰ نے بارش برسا کر اس مسئلہ کو حل کر دیا۔

مگر میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ صحیح جواب یہ ہے کہ اس غیر متوقع بارش سے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ازدیاد ایمان کا سامان کیا۔ دشمنوں نے یہ ہوشیاری کی تھی کہ بدر کے مقام پر پہلے پہنچ کر وہاں کے بعض چشموں پر قبضہ کر لیا۔ پانی کی اہمیت کی بنا پر قدرتی طور پر مسلمانوں کو اس کی تشویش ہوئی ہوگی۔ اس وقت اللہ نے خصوصی تائید فرمائی۔ دشمنوں نے ان کو زمین کے پانی سے محروم کرنے کی تدبیر کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے آسمان سے پانی بھیجنے کا انتظام کر دیا۔

اس طرح مسلمانوں کا یہ یقین مزید پختہ ہو گیا کہ اللہ ان لوگوں کا مددگار ہے جو اس کے دین کے لئے اٹھیں۔ وہ کسی حال میں ان کو بے سہارا نہیں چھوڑتا۔

۲۳ اگست ۱۹۸۴

بدر کی جنگ میں قریش کے جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لئے نکلے تھے ان میں سے ایک تعداد وہ تھی جو رسول اللہ سے لڑنے کے لئے پرجوش نہ تھی۔ یہ لوگ ابوجہل کی غیرت دلانے والی باتوں کے زیر اثر نکل پڑے تھے۔ مگر ان کا ضمیر اندر سے انھیں ملامت کر رہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح درمیان راہ سے واپسی ہو جائے اور جنگ کی نوبت نہ آئے۔

انھیں میں سے ایک عتبہ بن ربیعہ تھا۔ وہ کبیر السن تھا اور قریش کے مدبرین میں سے تھا۔ عتبہ

کی رائے جنگ کی موافقت میں نہ تھی۔ عتبہ نے اپنی رائے کا اظہار حکیم بن حزام سے کیا۔ حکیم بن حزام وہ ہیں جو بعد کو اسلام لائے۔

حکیم بن حزام ابو جہل کے پاس آئے اور کہا کہ عتبہ نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ اور عتبہ کی پوری گفتگو ابو جہل کے سامنے نقل کرتے ہوئے کہا کہ بہتر یہ ہے کہ ہم لوگ جنگ سے باز آجائیں۔ یہ جنگ ہمارے لئے مفید نہ ہوگی۔ ابو جہل نے سختی سے انکار کر دیا اور کہا کہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ ہم ضرور محمد سے لڑنے کے لئے جائیں گے۔ پھر ابو جہل نے کہا کہ عتبہ تو ڈرپوک ہے۔ وہ بزدلی کی وجہ سے ایسی باتیں کر رہا ہے۔ ابو جہل نے کہا کہ محمد کے ساتھیوں میں عتبہ کا بیٹا (ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ) بھی ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا بیٹا قتل ہو، اس لئے وہ تم کو ڈرا رہا ہے: وفيهم ابنه فقد تخوفكم عليه۔

ابن ہشام، دوم، ۲۶۳

ابو جہل نے دلیل کا جواب الزام سے دیا۔ اس طرح ایک صحیح بات کو قبول نہ کرنا اور نیت پر حملہ کرتے ہوئے اسے رد کر دینا ابو جہل کی سنت ہے، جو لوگ ایسا کریں وہ اپنے آپ کو ابو جہل کا ساتھی بنا رہے ہیں۔

۲۴ اگست ۱۹۸۴

ایک صاحب نے ایک وعدہ کیا اور پھر انھوں نے اس کو پورا نہیں کیا۔ بعد کو ملاقات ہوئی تو وہ عذر بیان کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ جس چیز کو آپ عذر بنا رہے ہیں اس کو عذر نہ بنائیے۔ حقیقت یہ ہے کہ عذر کو عذر نہ بنانے ہی کا نام زندگی ہے۔ اس دنیا میں کبھی ایسا ممکن نہیں کہ آدمی کے پاس عذرات نہ ہوں۔ یہاں جو شخص عذر کو عذر بنائے وہ کبھی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ اسی حقیقت کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

الرجل مغبون باثنين الصحة والفراغ۔

آدمی ہمیشہ دو چیزوں سے دھوکے میں رہتا ہے: صحت اور فرصت۔ اس دنیا میں کامل صحت اور کامل فرصت ممکن نہیں۔ اس لئے کامل صحت اور فرصت کا انتظار کرنے والا کبھی کوئی کام بھی نہیں کر سکتا۔ زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس ایک بہترین عذر ہو تب بھی اس کو استعمال نہ کیجئے:

If you have a good excuse don't use it.

۲۵ اگست ۱۹۸۴

ہالی وڈ (امریکہ) کے ایک دولت مند فلم پروڈیوسر کی لڑکی کسی ابتدائی اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس کی استانی نے لڑکی کو کہانی لکھنے کے لئے ایک عنوان دیا۔ عنوان تھا: "مفلس گھرانا" لڑکی نے اپنی کہانی میں لکھا: ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کہیں کوئی مفلس گھرانا تھا۔ اس کی ماں مفلس تھی۔ اس کا باپ مفلس تھا۔ اس کے بچے مفلس تھے۔ اس کا بیرا مفلس تھا، اس کا شوفر مفلس تھا۔ اس کی ماما مفلس تھی۔ اس کا مالی مفلس تھا۔ غرض اس گھرانے کا ہر شخص مفلس تھا۔۔۔

یہ ایک دلچسپ مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی کی معلومات اگر ناقص ہوں تو اس کی رائے بھی کس قدر ناقص ہو کر رہ جاتی ہے۔

۲۶ اگست ۱۹۸۴

We promise according to our hopes, and perform according to our fears.
La Rochefoucauld

(ہم اپنی امیدوں کے مطابق وعدہ کرتے ہیں اور اپنے اندیشوں کے مطابق تعمیل کرتے ہیں) اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ جب وعدہ کرنا ہوتا ہے تو آدمی بڑے بڑے وعدے کر لیتا ہے۔ اور جب اس کی تعمیل کا وقت آتا ہے تو وہ بس اتنی ہی تعمیل کرتا ہے جتنی تعمیل کے لئے وہ مجبور کر دیا گیا ہو۔

یہ انسان کی کمزوری ہے اور موجودہ زمانہ کے مسلمان سب سے زیادہ اس کمزوری کا شکار ہیں۔

۲۷ اگست ۱۹۸۴

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں نیشنلزم کا آرٹیکل پڑھ کر ایک تاثر ہوا جس کو یہاں لکھتا ہوں۔

جدید نیشنلزم کی تحریک اٹھارویں صدی میں یورپ میں پیدا ہوئی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں وہ ایشیا اور افریقہ میں پہنچی۔ اس وقت یہ ممالک بیرونی طاقتوں کے سیاسی محکوم تھے، ان کے درمیان ان کی اپنی حکومتیں قائم نہ تھیں۔ اس بنا پر نیشنلزم کا نظریہ ان میں بہت مقبول ہوا۔ کیوں کہ اس میں انھیں اپنے سیاسی حوصلے کے حق میں نظریاتی دلیل مل رہی تھی کہ ان کے ملک میں خود اپنی ملکی اور قومی حکومت قائم ہونا چاہئے۔ چنانچہ ان ملکوں میں نیشنلزم کی تحریکیں بہت مقبول ہوئیں۔ یہاں تک کہ نیشنلزم کے زور پر

بیسویں صدی میں ایشیا اور افریقہ کے تقریباً تمام ممالک آزاد ہو گئے۔

مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ ایشیا اور افریقہ کے یہ ممالک آپس میں لڑ گئے۔ ایشیا اور افریقہ کے ان آزاد ممالک کا مفاد آپس میں ٹکرا گیا۔ وہ ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ اب معلوم ہوا کہ نیشنلزم کا نظریہ جو محکوم قوم کی حیثیت سے ان کے لئے نہایت مفید تھا، وہ آزاد قوم کی حیثیت سے ان کے لئے مفید نہیں۔

انیسویں صدی کی دنیا میں جدید نیشنلزم کو کامل سچائی سمجھ لیا گیا تھا۔ مگر تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ وہ صرف آدھی سچائی ہے، وہ پوری سچائی نہیں۔

۲۸ اگست ۱۹۸۴

What we call progress is the exchange of one nuisance for another.
Havelock Ellis

(جس چیز کو ہم ترقی کہتے ہیں وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ایک اذیت سے دوسری اذیت کا تبادلہ ہے)

قرآن میں ہے کہ لقد خلقنا الانسان فی کبد (ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے)۔ یہی بات بائبل میں ان لفظوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو زمین پر بھیجا تو کہا کہ مشقت کے ساتھ تو اپنی عمر بھر زمین کی پیداوار کھائے گا۔ اور وہ تیرے لئے کانٹے اور اونٹ کٹارے اگائے گی۔ تو اپنے منہ کے پسینہ کی روٹی کمائے گا۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں آدمی اپنی آرزوؤں کی دنیا نہیں بنا سکتا۔ یہاں پر ترقی اور کامیابی کے ساتھ ایک کانٹا لگا دیا گیا ہے تاکہ آدمی موجودہ دنیا پر قانع نہ ہو سکے۔ وہ موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کی دنیا کو یاد رکھے۔

۲۹ اگست ۱۹۸۴

موجودہ زمانہ میں اسلام پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان سب کا مشترک عنوان تجویز کرنا ہو تو وہ صرف دو ہو گا ـــــــ فضائل اسلام اور مسائل اسلام۔ ان کتابوں کا خواہ جو بھی نام ہو اور وہ خواہ جس موضوع پر بھی ہوں، لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو وہ یا تو اسلام کے فضائل دکھانے کے لئے لکھی گئی ہوں گی یا اسلام کے مسائل بتانے کے لئے۔

عصر حاضر میں سب سے زیادہ جس موضوع پر کتابیں لکھنے کی ضرورت تھی وہ ہے: اظہار اسلام۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے سامنے نہ تو اظہار اسلام کا مقصد تھا اور نہ انھوں نے اظہار اسلام پر کتابیں لکھیں۔ اظہار اسلام سے میری مراد ہے اسلام کی تعلیم کو عصری اسلوب میں پیش کرنا تاکہ وہ آج کے انسان کے لئے قابل قبول ہو سکے۔

۳۰ اگست ۱۹۸۴

کل بنی آدم خطاء وخیر الخطائین التوابون (ترمذی)

ہر انسان خطاکار ہے اور بہترین خطاکار وہ ہیں جو خطا کے بعد توبہ کریں۔

خطا کے بعد توبہ کرنا دوسرے لفظوں میں غلطی کر کے اپنی غلطی کا اعتراف کرنا ہے اور یہ بلاشبہ سب سے بڑی نیکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سب سے زیادہ غلطی کرنے والا بنایا، تاکہ وہ سب سے زیادہ نیکی کرنے والا بنے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ غلطی کے بعد آدمی اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ خدا کے سامنے وہ توبہ کے الفاظ بول دے گا مگر اپنے جیسے آدمی کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کرنا ہو تو وہ کسی حال میں اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اعتراف کرنے کے بعد میں اس کے سامنے بے عزت ہو جاؤں گا۔

غلطی حقیقتِ واقعہ سے انحراف کا دوسرا نام ہے۔ آدمی کو جاننا چاہئے کہ وہ حقیقت واقعہ کو بدل نہیں سکتا۔ اپنے آپ کو بدلنا ممکن ہے، مگر حقیقت واقعہ کو بدلنا ممکن نہیں۔ کیسا عجیب ہے وہ انسان جو غیر ممکن کو کرے اور جو ممکن ہو اس کو چھوڑ دے۔

۳۱ اگست ۱۹۸۴

ایک شخص حضرت سعید بن جبیر کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ فلاں حدیث کو ماننے میں مجھے تردد ہے، کیوں کہ وہ مجھے قرآن کے خلاف نظر آتی ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعلم بکتاب اللہ منک

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سے زیادہ اللہ کی کتاب کو جاننے والے تھے۔

ایک حدیث کے متعلق اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے تو پھر اس میں عقل کو استعمال کرنا جائز نہیں۔ کیوں کہ عقل نہایت محدود ہے۔ صرف یہی نہیں کہ عقل ہر بات

کی تہہ تک پہنچ نہیں سکتی ، بلکہ انسان کی عقل بعض اوقات کسی چیز کو صحیح زاویہ سے دیکھ نہیں پاتی۔ زاویہ نگاہ کی غلطی کو وہ اصل بات کی غلطی سمجھ لیتی ہے۔ بار بار کا تجربہ ہے کہ ایک بات کو ایک رخ سے دیکھا جائے تو وہ غلط نظر آتی ہے، حالاں کہ اسی بات کو دوسرے رخ سے دیکھا جائے تو وہ عین درست نظر آنے لگے گی۔

آدمی اپنے قیاس سے رائے قائم کرتا ہے۔ حالانکہ تجربہ بتاتا ہے کہ قیاس صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ آدمی اگر قیاس صحیح اور قیاس فاسد کا فرق جان لے تو وہ ایسی باتوں پر اصرار کرنا چھوڑ دے۔

یکم ستمبر ۱۹۸۴

بمبئی کے قریب ٹرامبے کے مقام پر ۱۰ کروڑ روپئے کی لاگت اور کناڈا کے تعاون سے ہندستان کا پہلا ایٹمی ری ایکٹر قائم ہوا۔ سابق وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے اس کا افتتاح ۱۶ جنوری ۱۹۶۱ کو کیا تھا۔ واپس آکر دہلی میں انھوں نے ۱۷ جنوری کو ایک تقریر کے دوران اس کا ذکر کیا اور کہا:

" ہمارا یہ ایٹمی ری ایکٹر اجنتا کے غاروں کے سامنے ہے۔ ان میں سے ایک ایٹمی طاقت کا مظہر ہے، اور دوسرا روحانی طاقت کا مظہر، اور دنیا کا دارومدار انھیں دو چیزوں کی ترقی پر ہے۔ ہم سائنس اور روحانیت دونوں کو ساتھ لئے بغیر ترقی کی دوڑ میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔"

اس طرح کی باتیں ہمارے لیڈر اکثر کسی نہ کسی شکل میں دہراتے رہتے ہیں۔ مگر وہ محض تقریر برائے تقریر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لمبی مدت گزرنے کے باوجود اب تک اس کی طرف کوئی حقیقی پیش رفت نہ ہو سکی۔

۲ ستمبر ۱۹۸۴

امام مالک مدینہ کی مسجد نبوی میں حدیث کا درس دیتے تھے۔ آپ اکثر یہ کہتے کہ ہر آدمی کی کوئی بات لینے کی ہوتی ہے اور کوئی بات رد کر دینے کی، سوائے اس قبر والے کے۔ یہ کہتے ہوئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی طرف اشارہ کرتے (کل احد یوخذ عنه ویرد علیه الا صاحب هٰذا القبر، ویشیر الی قبر النبی صلی اللہ علیه وسلم)

اسلام میں علم کا اصل ماخذ اللہ تعالیٰ ہے اور اللہ کے مستند نمائندہ کی حیثیت سے پیغمبر۔ یہ تعلیم کس قدر آفاقی ہے اور اس سے ذہن میں کتنی زیادہ وسعت پیدا ہوتی ہے۔ مگر بعد کے زمانہ میں اسلام میں جو بگاڑ آیا اس میں سے ایک یہ تعلیم بھی تھی جس کو مسلمان بھول گئے۔ آج مسلمانوں کے

اندر بہت بڑے پیمانہ پر وہی شخصیت پرستی آگئی ہے جو دوسرے ادیان میں تحریف کے نتیجہ میں آئی تھی۔

آج مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ مبغوض چیز یہ ہے کہ ان کی محبوب شخصیتوں پر تنقید کی جائے۔ حالاں کہ یہ سراسر غیر اسلامی ہے۔ مسلمانوں کے اندر سے جب تک شخصیت پرستی کو ختم نہ کیا جائے، دوبارہ اسلام کا احیاء نہیں ہو سکتا۔

۳ ستمبر ۱۹۸۴

اسلامی دعوت کا اصل نشانہ فکر انسانی میں انقلاب ہے۔ انسان ہمیشہ کسی تفکیر پر جیتا ہے اس کے سوچنے کا کوئی بنیادی طریقہ ہوتا ہے جس پر اس کے تمام اعمال کی تشکیل ہوتی ہے۔

قدیم زمانہ میں انسانی تفکیر کی بنیاد شرک تھی۔ انسان کی فکر مشرکانہ فکر تھی۔ اسی کے مطابق اس کے تمام اعمال بنتے تھے۔ پیغمبروں نے اس مشرکانہ فکر کو بدلنے کی کوشش کی۔ معلوم تاریخ کے مطابق پچھلے پیغمبروں کے زمانہ میں افراد کے اندر فکری انقلاب آیا مگر عالم انسانی میں عمومی فکری انقلاب نہ آسکا۔ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے ذریعہ جو کام ہوا اس میں یہ ہوا کہ نہ صرف افراد کے اندر فکری انقلاب آیا۔ بلکہ وہ اتنا پھیلا کہ عمومی فکری انقلاب بن گیا۔

اب تاریخ دوبارہ پیچھے کی طرف لوٹ گئی ہے۔ جدید دور میں دوبارہ انسانی فکر بدل گیا ہے۔ ماضی میں مشرکانہ فکر غالب تھا، آج ملحدانہ فکر غالب ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کا کام یہ ہے کہ اعلیٰ سطح پر جدوجہد کر کے نیا فکری انقلاب لایا جائے۔ انسان کی فکر جو الحاد کے راستہ پر چل پڑی ہے اس کو دوبارہ توحید کے راستہ پر گامزن کیا جائے۔

۴ ستمبر ۱۹۸۴

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: المومن مرآۃ المومن اذا رأی فیہ عیبا اصلحہ یعنی مومن مومن کا آئینہ ہے۔ جب وہ اس کے اندر کوئی عیب دیکھتا ہے تو وہ اس کی اصلاح کر دیتا ہے۔ (صحیح بخاری)

کسی کا عیب بتانا گویا اس کے اوپر تنقید کرنا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس قسم کی تنقید کو انتہائی برا سمجھا جاتا ہے۔ حالاں کہ مذکورہ حدیث میں اس کو ایمان کی علامت اور ایک مومن کا دوسرے مومن

پرحق بتایا گیا ہے۔

تنقید دراصل خیرخواہانہ نصیحت کا دوسرا نام ہے۔ سچی تنقید سے زیادہ قیمتی کوئی چیز نہیں۔ مگر قومیں جب زوال کا شکار ہوتی ہیں تو وہ تنقید کے لئے الرجک ہو جاتی ہیں۔ دورِ زوال میں قوموں کو صرف جھوٹی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ ایسے لوگ خوش نما جھوٹ پر جیتے ہیں، وہ سچائی کا مقابلہ کرنے سے گھبرانے لگتے ہیں۔

۵ ستمبر ۱۹۸۴

حضرت امیر معاویہ نے حضرت علی کے ساتھ جو لڑائیاں کیں، اگرچہ ان سے اسلام کو نقصان پہنچا۔ تاہم حضرت معاویہ سیاست دانی کے ماہر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ حکومت کس طرح کی جاتی ہے اور لوگوں سے کس طرح نپٹا جاتا ہے۔ ان کا ایک قول یہ ہے:

قال معاوية رضى الله عنه : انى لا اضع سيفى حيث يكفينى سوطى، ولا اضع سوطى حيث يكفينى لسانى. ولو ان بينى وبين الناس شعرة ما انقطعت ابدا۔

جہاں میرا کوڑا کافی ہو وہاں میں اپنی تلوار استعمال نہیں کرتا۔ اور جہاں میری زبان کافی ہو وہاں میں اپنا کوڑا استعمال نہیں کرتا۔ اور اگر میرے اور لوگوں کے درمیان ایک بال بھی ہو تو میں کبھی اس کو نہیں کاٹتا۔

بہترین حکمراں وہ ہے جو طاقت کا کم سے کم استعمال کرے اور صرف اتنا ہی استعمال کرے جتنا بالکل ناگزیر ہو۔

۶ ستمبر ۱۹۸۴

فوج آدمیوں کی ایک جماعت ہے جو اس لئے اکٹھا کی جاتی ہے کہ وہ سیاست دانوں کی غلطی کو درست کرے:

Army is a body of men assembled to rectify the mistakes of the diplomats.
Josephus Daniels

یہ ایک نہایت بامعنی قول ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ لڑائیاں اگرچہ فوجیں لڑتی ہیں مگر وہ

سیاست دانوں کی نااہلی کی قیمت ادا کرتی ہیں۔ ہند و پاک کی ۱۹۶۵ کی جنگ پاکستانی وزیر خارجہ بھٹو کی حماقت کی وجہ سے لڑی گئی۔ عراق اور ایران کی موجودہ جنگ عراقی حکمراں صدام حسین کی حماقت سے شروع ہوئی اور ایرانی حکمراں آیات اللہ خمینی کی حماقت سے جاری ہے۔ وغیرہ

یہی بات نچلی سطح کے جھگڑوں اور لڑائیوں کے بارہ میں بھی صحیح ہے۔ ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات سب کے سب ہندو اور مسلم لیڈروں کی حماقت سے پیش آتے ہیں۔ ہندو قیادت اور مسلم قیادت اگر دانش مندی کا ثبوت دیتی تو یہاں کبھی فرقہ وارانہ فسادات نہ ہوتے جنہوں نے دونوں فرقوں کی ترقی کو روک رکھا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام لڑائیاں رہنماؤں کی نادانی کے نتیجہ میں پیش آتی ہیں، خواہ وہ حکومتی رہنما ہوں یا غیر حکومتی رہنما۔ اور خواہ یہ لڑائی مسلح افواج کی سطح پر ہو یا غیر مسلح عوام کی سطح پر۔

۷ ستمبر ۱۹۸۴

موجودہ زمانہ میں جن اسلامی مفکرین نے اسلام پر کتابیں لکھی ہیں، ان کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ اسلام اور مغربی تہذیب کا تقابل کرتے ہیں۔ مگر یہ تقابل ہمیشہ غیر علمی ہوتا ہے۔

اس تقابل میں واضح طور پر دو غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ آئیڈیل کا تقابل پریکٹس سے کرتے ہیں۔ یعنی اسلام کا نظریہ لے لیتے ہیں اور مغرب کا عمل، اور پھر دونوں کا تقابل کرتے ہیں۔ حالاں کہ صحیح تقابل یہ ہے کہ آئیڈیل کا تقابل آئیڈیل سے اور پریکٹس کا تقابل پریکٹس سے کیا جائے۔

دوسری عام غلطی تعمیم (generalisation) کی ہے۔ اس میں بھی وہ علمی انصاف نہیں کرتے وہ ایسا کرتے ہیں کہ اسلامی تاریخ کا ایک اچھا واقعہ لے کر وہاں اس کی تعمیم کر دیں گے۔ اور مغربی ممالک کا کوئی برا واقعہ لے لیں گے اور وہاں اس کی تعمیم کر دیں گے۔

حالاں کہ یہی کام جب ایک یہودی مصنف برعکس صورت میں کرتا ہے تو وہ ان کو بہت برا لگتا ہے۔ یعنی وہ اسلامی تاریخ کا ایک ناپسندیدہ واقعہ لے گا اور اسی کو اسلامی سماج کی عمومی حالت بتائے گا۔

اگر ہمیں اپنے بارے میں اس قسم کی تعمیم پسند نہیں تو دوسروں کے بارہ میں بھی ہمیں اس قسم کی تعمیم نہیں کرنا چاہئے۔

۸ ستمبر ۱۹۸۴

سورہ نساء (آیت ۱۴۹) میں ہے ...... فان اللہ کان عفواً قدیراً۔ یہاں کلام کا رخ بظاہر اللہ کی طرف ہے۔ مگر حقیقی معنی کے اعتبار سے اس کا رخ انسانوں کی طرف ہے۔ یہاں دراصل تخلقوا باخلاق اللہ (اللہ کا اخلاق اختیار کرو) کی تعلیم دی گئی ہے۔ یعنی جس طرح خدا قادر ہے مگر وہ عفو و درگزر کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح اے اہل ایمان، تم بھی سزا دینے کی قدرت رکھتے ہوئے عفو کا طریقہ اختیار کرو۔

۹ ستمبر ۱۹۸۴

ٹالی رینڈ (Tally Rand) نے کہا ہے کہ ایک شخص تلوار کے ذریعہ سب کچھ کر سکتا ہے، سوا اس کے کہ وہ تلوار کے اوپر بیٹھ نہیں سکتا:

A man can do everything with a sword except sit on it.

اس کا مطلب یہ ہے کہ "تلوار" تخریب کا کام ضرور کر سکتی ہے مگر وہ تعمیر کے کام کے لئے سراسر بے فائدہ ہے۔ جن لوگوں نے بھی تلوار (بالفاظ دیگر تشدد) کو اپنا وسیلہ بنایا انھوں نے اپنے پیچھے بربادی کی تاریخ تو ضرور چھوڑی، مگر وہ اپنے پیچھے کوئی مثبت کارنامہ نہ چھوڑ سکے۔

۱۰ ستمبر ۱۹۸۴

He that wrestles with us, strengthens our nerves, and sharpens our skills. Our antagonist is our helper.

(Edmund Berke)

جو شخص ہم سے لڑتا ہے وہ ہمارے اعصاب کو مضبوط کرتا ہے اور ہماری استعداد کو تیز تر بناتا ہے ہمارا مخالف ہمارا مددگار ہے۔

سوچنے کے دو انداز ہیں۔ ایک یہ کہ جو شخص آپ پر تنقید کرے یا آپ کی مخالفت کرے آپ اس کو فوراً اپنا دشمن سمجھ لیں اور اس سے نفرت کرنے لگیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تنقید اور مخالفت پیش آنے کے بعد آپ اپنے اوپر نظر ثانی کریں۔ آپ جھنجھلاہٹ کے بغیر اصل معاملہ پر ٹھنڈے طریقے سے غور

کریں۔

پہلی صورت میں تنقید اور مخالفت آپ کے لئے زہر ہے، دوسری صورت میں وہ آپ کے لئے آپ کی خوراک بن جاتی ہے۔

۱۱ستمبر ۱۹۸۴

Difficulty is an excuse history never accepts. Samuel Grafton

سموئل گریفٹن نے کہا ہے کہ مشکل ایک ایسا عذر ہے جس کو تاریخ کبھی قبول نہیں کرتی۔ مشکلات اس لئے ہیں کہ انھیں عبور کیا جائے۔ نہ یہ کہ انھیں عذر بنایا جائے۔ اگر آپ مشکلات کا مقابلہ کرنا نہ جانیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ناکام رہیں گے۔ اس کے بعد کوئی نہیں ہوگا جو آپ کے اعذار اور شکایات کو سنے۔

ایک والد اپنے بیٹے کو کسی حد تک عذر کی رعایت دے سکتا ہے، مگر یہ جزئی رعایت بھی صرف گھر کے اندر کی زندگی میں ممکن ہے۔ گھر کے باہر کی دنیا جس ڈکشنری پر قائم ہے اس میں عذر کا لفظ سرے سے موجود ہی نہیں۔

۱۲ستمبر ۱۹۸۴

ایک شخص نے اپنے احوال بتاتے ہوئے کہا: ارجوالله واخاف ذنوبی۔ یعنی میں اللہ سے امید رکھتا ہوں اور اپنے گناہوں سے ڈرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا:

ما اجتمعا فی قلب عبد فی مثل هذا الموطن الا اعطاه الله ما یرجوه وآمنه مما یخاف۔

کسی بندہ کے دل میں جب بھی یہ چیزیں جمع ہوتی ہیں تو وہ اس کو وہ چیز دے دیتا ہے جس کا وہ امیدوار تھا اور اس سے محفوظ کر دیتا ہے جس کا وہ اندیشہ رکھتا تھا۔

سچے مومن کے اندر بیک وقت دو کیفیتیں جمع ہوتی ہیں۔ ایک امید اور دوسرے خوف۔ اس کو یقین ہوتا ہے کہ دینے والا صرف خدا ہے، اس لئے اس کی امیدیں تمام تر ایک خدا سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح اس کو یقین ہوتا ہے کہ چھیننے والا بھی صرف وہی ایک ہے۔ اس لئے وہ

اندیشہ ناک رہتا ہے کہ اگر خدا کی رحمت و مغفرت اسے حاصل نہ ہوئی تو وہ تباہی سے بچ نہیں سکتا۔

جس شخص کے اندر یہ دونوں کیفیتیں جمع ہو جائیں تو وہ عین وہی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ اس لئے ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی عنایات کا مستحق بن جاتا ہے۔ سچا اندیشہ ہی اس دنیا میں بھی یافت کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

۱۳ ستمبر ۱۹۸۴

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انما اخاف علی امتی الائمة المضلین (میں اپنی امت پر صرف گمراہ رہنماؤں سے ڈرتا ہوں)

زیاد بن حدیر کہتے ہیں: قال لی عمر بن الخطاب هل تعرف ما یهدم الاسلام قلت لا، قال یهدمه زلة العالم (خلیفہ ثانی عمر بن الخطاب نے مجھ سے کہا۔ کیا تم جانتے ہو کہ کیا چیز اسلام کو ڈھا دیتی ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا کہ عالم کی لغزش اسلام کو ڈھا دیتی ہے۔

وفی کلام معاذ بن جبل: واحذروا زیغة الحکیم فان الشیطان قد یقول با الضلالة علی لسان الحکیم۔

حضرت معاذ بن جبل کا قول ہے کہ حکیم کی گمراہی سے بچو۔ کیوں کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شیطان حکیم کی زبان سے گمراہی کی بات بولتا ہے۔

اس کو دوسرے انداز سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ سب سے بڑا فتنہ الفاظ کا فتنہ ہے۔ الفاظ میں اتنی زیادہ گنجائش ہوتی ہے کہ باطل کو حق کے روپ میں پیش کیا جاسکے۔ ایک خود ساختہ بات کو قرآن و حدیث کی بات بنا کر دکھایا جائے۔ یہ کام عام لوگ نہیں کرسکتے۔ یہ کام عالم اور حکیم لوگ کرتے ہیں۔ عوام چونکہ خود تجزیہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس لئے وہ عالموں اور حکیموں کی بات سے متاثر ہو کر اس کو اختیار کر لیتے ہیں۔

اس دنیا میں ہدایت یاب وہی ہے جو الفاظ کے فتنہ سے بچ جائے۔

۱۴ ستمبر ۱۹۸۴

تعصب ایک تدبیر ہے جو تم کو اس قابل بناتی ہے کہ تم حقائق کے بغیر رائیں بنا سکو:

Prejudice is a device that enables you to form opinions without the facts.
(Robert Quillen)

مثلاً الرسالہ کے مشن کو لیجئے۔ الرسالہ کی مخالفت کی ایک صورت یہ ہے کہ کوئی شخص قرآن و سنت کی بنیاد پر اس کی تردید کرے۔ ایسا کرنے کے لئے دلائل و حقائق پیش کرنے کی ضرورت ہوگی۔ ہمارے مخالفین جانتے ہیں کہ اس میدان میں وہ الرسالہ کو رد کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ الرسالہ کے فکر کو دلائل سے رد کرنا ان کے بس سے باہر ہے۔

چنانچہ وہ دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی لوگوں کے اندر تعصب اور بدظنی کے جذبات ابھار کر انھیں الرسالہ کا مخالف بنا دینا ——— الرسالہ بزرگوں پر تنقید کرتا ہے۔ الرسالہ اسلام دشمنوں کا ایجنٹ ہے۔ الرسالہ (slow-poisoning) کر رہا ہے۔ الرسالہ جہاد کی اسپرٹ کو مسلمانوں سے ختم کر رہا ہے۔ وغیرہ۔ سب اسی قسم کی باتیں ہیں۔ یہ گویا لوگوں کی وہ تدبیر ہے جس کے ذریعہ وہ چاہتے ہیں کہ دلائل و حقائق پیش کئے بغیر لوگوں کو الرسالہ کا مخالف بنا دیں۔ مگر خدا کا فیصلہ ہے کہ اس قسم کی جھوٹی تدبیریں صرف وقتی طور پر کامیاب ہوں۔ وہ ابدی طور پر کبھی کامیاب نہ ہو سکیں۔

۱۵ ستمبر ۱۹۸۴

جاڑے کا موسم ہے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ ایسی حالت میں دو آدمی باہر ٹہلنے کے لئے نکلتے ہیں۔ دونوں واپس لوٹتے ہیں تو ان میں سے ایک شخص زکام لے کر واپس آتا ہے۔ اس کو ٹمپریچر ہو جاتا ہے، وہ بیمار ہو کر بستر پر پڑ جاتا ہے۔ دوسرا آدمی بھی اسی کے ساتھ ٹھنڈے موسم میں چل کر آتا ہے۔ مگر اس پر موسم کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ وہ نشاط سے بھرا ہوا واپس آتا ہے۔ باہر نکلنا اس کے لئے مزید صحت بخش ثابت ہوتا ہے۔ پہلا آدمی اگر کھو کر لوٹا تھا، تو دوسرا آدمی پا کر لوٹتا ہے۔

ہم ایسا نہیں کرتے کہ جو شخص بیمار ہو گیا ہے اس کی بیماری کی ذمہ داری موسم پر ڈال دیں بلکہ ہم یقین کرتے ہیں کہ اس کا سبب خود آدمی کے اپنے اندر ہے۔ ایک شخص کے اندر داخلی قوت تھی، اس لئے وہ موسم سے متاثر نہیں ہوا، بلکہ موسم کو اپنی غذا بنا لیا۔ دوسرا شخص داخلی طور پر کمزور تھا، اس لئے وہ موسم کی شدت سے متاثر ہوا۔ موسم نے اس کو اپنا شکار بنا لیا۔ یہی تشخیص ہے جس کی بنا پر

ہم بیمار آدمی کا علاج کرتے ہیں اور اس کو طاقتور بنانے کی کوشش کرتے ہیں ، نہ یہ کہ موسم کے خلاف احتجاج اور مطالبہ کی مہم شروع کر دیں۔

موجودہ دنیا کا نظام اسی اصول پر قائم ہے۔ یہاں ہر شخص یا ہر گروہ اپنی کمزوری کو بھگتتا ہے۔ اس لئے جب کوئی مسئلہ پیدا ہو تو خود اپنی داخلی کمزوری کی اصلاح میں لگ جانا چاہئے، نہ کہ دوسروں کے خلاف چیخ و پکار میں۔

۱۶ ستمبر ۱۹۸۴

فرانس میں جون ۱۹۸۲ء میں مضمون نگاری کا مقابلہ (essay contest) ہوا۔ مقابلہ میں شرکت کرنے والوں کو کتاب دیکھے بغیر محدود وقت میں ایک مضمون لکھنا تھا۔ اس مقابلہ میں جو شخص اول آیا اس کا نام جوسیلن بنوئی (Jocelyn Benoist) تھا۔ بوقت مقابلہ اس کی عمر صرف ۱۴ سال تھی۔

نتیجہ سامنے آنے کے بعد اخبار کے نمائندے ان سے ملے۔ ایک اخبار نویس نے پوچھا کہ آپ کی کامیابی کا راز کیا ہے۔ کہ آپ غیر معمولی ذہین ہیں یا پر اسرار صلاحیت کے مالک ہیں۔ نوجوان نے جواب دیا : دونوں میں سے کوئی بھی نہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ میں بہت زیادہ پڑھتا ہوں :

I just read a lot

"پڑھنا" بڑی عجیب و غریب چیز ہے۔ یہ ایک انوکھی صلاحیت ہے جو انسان کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں۔ آدمی اپنے کمرہ میں یا لائبریری میں بیٹھ کر ساری دنیا کی چیزیں پڑھ سکتا ہے۔ وہ مطالعہ کے ذریعہ انسائیکلوپیڈیائی معلومات اپنے ذہن میں جمع کر سکتا ہے۔

۱۷ ستمبر ۱۹۸۴

عن واثلة بن الاسقع قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تظهر الشماتة لاخيك فيرحمه الله ويبتليك (رواه الترمذی)

اپنے بھائی کی مصیبت پر خوش نہ ہو ، پس اللہ اس پر رحم فرمائے اور تم کو مصیبت میں مبتلا کر دے۔

موجودہ زمانہ میں ۹۹ فی صد مسلمان اس مرض میں مبتلا ہیں۔ مگر جو لوگ دوسرے کی مصیبت

پر خوش ہوں انہیں جاننا چاہئے کہ یہ خوشی ان سے بہت مہنگی قیمت وصول کرنے والی ہے۔ وہ یہ کہ وہ خود عین اسی مصیبت میں مبتلا کر دئے جائیں جس کو وہ اپنے مفروضہ حریف کے خانہ میں ڈال کر خوش ہو رہے تھے۔

۱۸ ستمبر ۱۹۸۴

علامہ شعرانی نے عہد محمودیہ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:

اجمع اهل الطريق على وجوب اتخاذ الانسان له شيخاً (اہل تصوف کا اس پر اتفاق ہے کہ آدمی کے لئے واجب ہے کہ وہ اپنی اصلاح کے لئے اپنا ایک شیخ بنائے)

اس "وجوب" کی دلیل کیا ہے۔ اس کی دلیل ان کے نزدیک یہ ہے کہ فقہ کا متفقہ اصول ہے کہ جس چیز کے بغیر واجب پوری طرح ادا نہ ہو سکے وہ بھی واجب ہو جاتا ہے (مالا يتم الواجب الا به فهو واجب)، چوں کہ امراض باطنی کا علاج واجب ہے اور اس واجب کا حصول شیخ کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا، اس لئے شیخ کا اتخاذ بھی واجب ہے۔

اس دلیل کے صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ ثابت ہو کہ امراض باطنی کی اصلاح کے لئے اتخاذ شیخ ضروری ہے۔ یہ کیوں کر ثابت ہوگا۔ اس کے ثابت ہونے کی شکل یہ ہے کہ قرآن یا حدیث میں اس کی تائید میں واضح نص موجود ہو۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن و حدیث میں ایسی کوئی نص موجود نہیں، جو اتخاذ شیخ کی اہمیت اس اعتبار سے ثابت کرے۔

اس کا جواب علامہ شعرانی نے یہ دیا ہے کہ حضرات سلف صالحین اور ائمہ مجتہدین کو اللہ تعالیٰ نے امراض باطنی سے سلامتی عطا فرمائی تھی۔ اس لئے ان کو شیخ کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر سوال یہ ہے کہ خود اس کا کیا ثبوت ہے کہ "السلف الصالح والائمة المجتهدين" کو امراض باطنی سے سلامت حاصل تھی اس لئے وہ شیخ کے ضرورت مند نہ تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد کے زمانہ کے لئے بہت سی چیزوں کی ہدایت فرمائی تھی۔ مثلاً آپ نے فرمایا کہ میرے بعد فتنے پیدا ہوں گے تو تم اپنے حکمراں کی اطاعت کرنا، خواہ وہ تمہارے خیال میں برا کیوں نہ ہو۔ اسی طرح ایسا کیوں نہ ہوا کہ آپ فرماتے کہ میرے بعد تم ہر زمانہ میں اپنا ایک شیخ بناتے رہنا۔

۱۹ ستمبر ۱۹۸۴

ہندستان کے مسلمانوں کی تاریخ جھگڑوں کی تاریخ ہے۔ ہر لیڈر اور ہر رہنما کسی نہ کسی جھگڑے کو لے کر کھڑا ہوا۔

انگریز کا جھگڑا

حنفی اور اہل حدیث کا جھگڑا

شیعہ اور سنی کا جھگڑا

قادیانی اور غیر قادیانی کا جھگڑا

ہندو مسلم جھگڑا

ایوب اور بھٹو کا جھگڑا

اس پوری مدت میں کوئی ایسا رہنما نظر نہیں آیا جو کسی مثبت پیغام کو لے کر اٹھے اور اس کے اوپر قوم کو کھڑا کرے ۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام کوششیں حبط اعمال کا شکار ہو کر رہ گئیں ۔ بے شمار جانی اور مالی قربانیوں کے باوجود ان کے حصہ میں کچھ نہ آیا۔

۲۰ ستمبر ۱۹۸۴

قرآن میں مومن کی صفات میں سے ایک صفت یہ بتائی گئی ہے :

والذین صبروا ابتغاء وجہ ربہم

اور جو لوگ صبر کرتے ہیں اللہ کی رضا چاہنے کے لئے

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اصولی بنیاد پر صبر کرتے ہیں۔ جب آدمی کو ٹھیس لگے اور وہ اللہ کی رضا کی خاطر صبر کرلے تو گویا اس نے اصولی بنیاد پر صبر کیا۔ مجبوری کے تحت تو ہر آدمی صبر کر لیتا ہے، مگر مومن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سوچے سمجھے فیصلہ کے تحت اس لئے صبر کرتا ہے کہ یہی اس کے اصول کا تقاضا ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

الصبر عند الصدمة الاولیٰ

صبر وہ ہے جو ابتداء صدمہ کے وقت کیا جائے۔

اس حدیث کو ہندستان کے موجودہ حالات کی روشنی میں بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ ہندستان کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے کوئی واقعہ ہو (مثلاً مسجد کے سامنے سے ہندوؤں کا جلوس نکلے) تو اس وقت وہ اس کو برداشت نہیں کریں گے۔ وہ فوراً نکل کر اس کو روکنے کے لئے کھڑے ہو جائیں گے۔ ہندو کا جلوس نکلتے ہی اسلام خطرہ میں پڑ جائے گا۔ اس کے بعد ضد بڑھے گی اور فساد ہوگا۔ اور مسلمان مارے جائیں گے۔ ان کے گھر اور دکان لوٹے جائیں گے اور جلا دیے جائیں گے۔ جب یہ ہو چکا ہوگا تو اس کے بعد مسلمان مکمل صبر کی تصویر بن کر اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ رہیں گے۔

یہی ایک واقعہ ہے جو ہندستان میں نصف صدی سے ہو رہا ہے۔ ابتدار صدمہ کے وقت بے صبری، اور پھر اس کے بعد صبر۔ مسلمان ہمیشہ آخر میں صبر کرتے ہیں۔ مگر یہ صبر وہ ہے جس پر انھیں حدیث کے مطابق، صبر کا کریڈٹ ملنے والا نہیں۔

۲۱ ستمبر ۱۹۸۴

جب آدمی لایعنی بحثیں نکالے تو وہ بھول جاتا ہے کہ کیا چیز دلیل ہے اور کیا چیز دلیل نہیں۔ مثلاً بریلوی حضرات کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ موجود ہیں اور ہر چیز دیکھتے ہیں۔

اس عقیدہ کے دلائل میں سے ایک دلیل ان کے نزدیک یہ ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں یہ روایت ہے کہ آدمی جب مرکر قبر میں جاتا ہے تو فرشتے آتے ہیں اور اس سے کچھ سوالات کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک سوال یہ ہے:

ما کنت تقول فی ھٰذا الرجل

تم اس آدمی (رسول اللہ ؐ) کے بارہ میں کیا کہتے تھے۔

بریلوی حضرات کہتے ہیں کہ عربی میں ھٰذا کا لفظ قریب کے اشارہ کے لئے آتا ہے۔ فرشتوں کے سوال میں اشارۂ قریب کا لفظ استعمال کیا جانا بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر میت کے پاس حاضر و ناظر ہوتے ہیں۔

یہ دلیل نہیں دلیل بازی ہے۔ محض ھٰذا کے استعمال سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔

حدیث و سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ وفد عبد القیس ۸ ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے پاس مدینہ میں آیا۔ گفت گو کے دوران اس نے یہ جملہ کہا:

..... بیننا وبینک ھٰذا الحی من کفار مضر

ہمارے اور آپ کے درمیان یہ کفار مضر کا قبیلہ ہے۔

ظاہر ہے کہ مضر کا قبیلہ اس وقت مدینہ میں موجود نہ تھا۔ یہ صرف کہنے کا ایک انداز تھا جو وفد عبد القیس نے استعمال کیا۔

۲۲ ستمبر ۱۹۸۴

خوش نصیب ہے وہ شخص جس کی موت اس کے لئے جنت میں داخلہ کا دروازہ بن جائے۔ جو موجودہ دنیا سے اس حال میں جائے کہ اگلے مرحلہ میں خدا کے فرشتے اس کو مبارک باد دینے کے لئے کھڑے ہوئے ہوں۔ جو ان نعمتوں کو قریب سے پالے جن کو موت سے پہلے کی دنیا میں اسے صرف دور سے دکھایا گیا تھا۔ جو چیزیں آج کی زندگی میں اس کو نمونہ کے طور پر دکھائی گئی تھیں وہاں وہ ان کو پورے طور پر مل جائیں۔ جو چیزیں یہاں تعارف کے درجہ میں سامنے آئی تھیں۔ وہاں وہ چیزیں مکمل کر کے اسے ہمیشہ کے لئے دے دی جائیں۔

۲۳ ستمبر ۱۹۸۴

بریلوی فرقہ کا عقیدہ ہے کہ عارف کامل تمام امور غیب سے مطلع ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ کمال نبوت وولایت کی شرط ہے۔ ایک بریلوی عالم نے لکھا ہے:

(لا تستقر نطفة فی فرج انثیٰ الا ینظر الیها الرجل (الکامل) الیها

کسی عورت کی شرمگاہ میں کوئی نطفہ بھی ٹھہرتا ہے تو وہ کامل انسان (ولی) اسے ضرور دیکھ لیتا ہے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان کس قسم کی لایعنی بحثوں میں مبتلا ہیں۔ یہ جھوٹی بحثیں صرف بریلوی حضرات کے یہاں نہیں ہیں بلکہ دوسرے حلقوں میں بھی وہ موجود ہیں، بس فرق یہ ہے کہ ان کی شکلیں بدلی ہوئی ہیں۔

کاش لوگ جانتے کہ اصل مسائل کچھ اور ہیں نہ کہ وہ جن میں یہ لوگ اپنی قابلیت کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ ایسی باتیں ثابت ہونے کے بعد بھی اتنی ہی غیر ثابت شدہ رہتی ہیں جتنا کہ ثابت ہونے سے پہلے۔

۲۴ ستمبر ۱۹۸۴

فی الصحیحین عن ابی هریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال،
ان للہ تسعۃ وتسعین اسماً، مأۃ الا واحدا۔ من احصاھا دخل الجنۃ

صحیحین (بخاری ومسلم) میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے ۹۹ نام ہیں، سو میں ایک کم۔ جس شخص نے ان کا شمار کیا وہ جنت میں داخل ہوگا۔

اس حدیث میں احصاء سے مراد احصاء شعوری ہے نہ کہ احصاء لسانی۔ اللہ کے یہ نام دراصل اللہ کی صفات کے مختلف پہلو ہیں۔ آدمی خدا پر اور اس کی تخلیقات پر غور کرتا ہے تو خدا کی خدائی کے مختلف پہلو اس کے سامنے آتے ہیں۔ انھیں پہلوؤں کا شعوری ادراک ہونا ان کا احصاء کرنا ہے۔ اور جو لوگ اس اعتبار سے خدا کی معرفت حاصل کریں وہ بلاشبہ جنت میں جائیں گے۔ کیوں کہ جنت دراصل معرفت خداوندی کی قیمت ہے۔

حدیث میں ۹۹ کا لفظ محض اعتباری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے بے شمار نام ہیں۔ امام رازی نے اپنی تفسیر میں بعض بزرگوں سے نقل کیا ہے کہ: إنّ لِلّٰہ خمسۃ آلاف اسم اللہ کے پانچ ہزار نام ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۱۹)

مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بے شمار نام ہیں۔

میں بفضلہ تعالیٰ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اللہ کے کئی ایسے "نام" دریافت کئے ہیں جو کتابوں میں لکھے ہوئے نہیں۔ اور میری یہ دریافت جاری ہے ——— فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

۲۵ ستمبر ۱۹۸۴

ٹیرنس (Terence) کا قول ہے کہ لوگ اپنے معاملہ کے مقابلہ میں دوسروں کے معاملات کو زیادہ اچھی طرح دیکھتے ہیں اور زیادہ اچھا فیصلہ کرتے ہیں:

Men see and judge affairs of other men better than their own.

یہ بات صد فی صد درست ہے۔ مگر دوسروں پر رائے زنی صرف اس وقت کارآمد ہے جب کہ مقصد گفتگو برائے گفتگو ہو۔ اگر بحث وگفتگو کا مقصد کسی نتیجہ تک پہنچنا ہو تو ایسا کلام بالکل بے فائدہ

ہے۔ کیوں کہ اپنے اوپر جج بننے سے اپنی اصلاح ہوتی ہے جب کہ دوسروں کے اوپر جج بننے سے بے فائدہ تکرار۔

۲۶ ستمبر ۱۹۸۴

آج محرم کے مہینہ کی دس تاریخ تھی۔ نظام الدین میں ہمارے مکان کے سامنے سے محرم کا جلوس نکلا۔ تعزیہ، باجا، کھیل، ہنگامہ اور بہت ساری خرافات اسلام کے نام پر ہو رہی تھی۔ یہ لوگ سیکڑوں سال سے یہی دیکھتے آئے ہیں اس لئے اب وہ اس سے الگ ہو کر سوچ نہیں سکتے۔

اس منظر کو دیکھ کر میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ میں نے سوچا کہ اب امت کی اصلاح کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ ایک ایسی نسل بنائی جائے جو ان تمام روایات سے منقطع ہو کر پرورش پائے۔

کچھ افراد مسلمانوں میں سے بھی نکلیں گے مگر زیادہ کی امید نہیں۔ کیوں کہ ہر مسلمان انھیں روایات کے درمیان پرورش پا رہا ہے۔ ہر مسلمان اسلام کو ایک "تعزیہ" بنائے ہوئے ہے۔ قرآن والا مومن بننے کے لئے تمام تاریخی روایات سے اپنے آپ کو کاٹنا پڑے گا۔ اور ایسے افراد شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔

آج کا مسلمان بعد کے زمانہ میں بننے والی روایات میں جی رہا ہے۔ وہ قرآن و سنت میں نہیں جی رہا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ ایک ایسی نسل بنائی جائے جو قرآن میں جئے، جو ابتدائی اسلام میں پرورش پا کر تیار ہو۔ ہمیں وہ اعلیٰ افراد درکار ہیں جو درمیانی وقفہ کو حذف کر کے آغاز اسلام سے اپنا ذہنی رشتہ جوڑ سکیں۔ یہ شعوری سفر بلاشبہہ مشکل ترین کام ہے۔ مگر اسی مشکل سفر میں ہماری تمام سعادتوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

۲۷ ستمبر ۱۹۸۴

ایک شخص جل جائے تو اس کے جلے ہوئے حصہ پر چمڑے کی پیوند کاری کی جاتی ہے۔ جس کو (skin grafting) کہا جاتا ہے۔ اس کا یہ فائدہ ہے کہ جلا ہوا حصہ دوبارہ پہلے کی طرح ہو جاتا ہے۔

پیوند کاری دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ دوسرے آدمی کی کھال لے کر جلے ہوئے آدمی

کے جسم پر لگائی جائے۔ اس کو (homograft) کہا جاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جلے ہوئے آدمی کی اپنی کھال لگائی جائے۔ یعنی غیر متاثر حصہ کی کھال لے کر متاثر حصہ پر لگائی جائے۔ اس کو autograft کہا جاتا ہے۔

اس قسم کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اردو زبان میں اس طرح کے سادہ الفاظ بنانا انتہائی دشوار ہے۔ اردو کا نشو و نما شعر و شاعری اور خطابت اور مناظرہ بازی جیسی چیزوں کے ماحول میں ہوا۔ چنانچہ ان چیزوں کے لئے اردو میں خوب الفاظ موجود ہیں۔ شاعرانہ اور خطیبانہ مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اردو میں ترکیبیں وضع کرنا بہت آسان ہے۔ مگر سائنٹفک خیالات کو سادہ ترکیب میں بیان کرنا اردو میں سخت دشوار ہے۔ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دور جدید کے لحاظ سے اردو کس قدر پس ماندہ زبان ہے۔

۲۸ ستمبر ۱۹۸۴

قرآن میں ہے کہ آدم کو جب زمین پر بھیجا گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جاؤ تم لوگ زمین پر آباد ہو، وہاں تم لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہوگے (قلنا اھبطوا بعضکم لبعض عدو)

یہاں یہ سوال ہے کہ ایک دوسرے کا دشمن ہونے سے کون دو گروہ مراد ہیں۔ انسان اور انسان یا انسان اور شیطان۔ اہل تاویل کی ایک جماعت نے اس سے مراد انسان اور انسان کو لیا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے اس کی پرزور تردید کی ہے اور لمبی بحث کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس سے مراد انسان اور شیطان ہے۔

مگر یہ بحث سراسر غیر ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان اور شیطان کی دشمنی کی عملی صورت کیا ہے۔ کیا شیطان مجسم ہو کر میدان مقابلہ میں آتا ہے اور انسان اس سے اس طرح لڑائی لڑتے ہیں جیسے انسانوں سے باہمی لڑائی لڑی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ شیطان وسوسہ کے راستے سے انسان کے پاس آتا ہے اور وسوسہ کی سطح پر ہی انسان کو اس کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

پھر یہ وسوسہ کیا ہوتا ہے۔ یہ وسوسہ ہوتا ہے ـــــ حسد، کبر، خیانت، ظلم اور اس طرح کی دوسری برائیوں پر انسان کو آمادہ کرنا۔ ان تمام برے جذبات کا نشانہ انسان ہی بنتے ہیں نہ کہ شیطان۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ شیطان ایک انسان کو دوسرے انسان سے ٹکراتا ہے،

اور اسی مقام پر انسان کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے نہ ٹکرائے۔

اگر عداوت کو شیطان اور انسان کی عداوت کے معنی میں لیا جائے تب بھی عملی طور پر وہ انسان اور انسان ہی کی عداوت ہے۔ نتیجہ کے اعتبار سے دونوں تفسیروں میں کوئی فرق نہیں۔

۲۹ ستمبر ۱۹۸۴

کون سا انڈا اچھا ہے اور کون سا خراب، اس کا اندازہ اوپر سے نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اوپر سے دیکھنے میں سب انڈے ٹھیک ہی معلوم ہوتے ہیں۔ انڈے کا اچھا یا خراب ہونا اس وقت معلوم ہوتا ہے جب کہ اس کو توڑا جائے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ انسانوں کا بھی ہے۔ کوئی انسان کیسا ہے، اس کا اندازہ معمول کے حالات میں نہیں ہوتا بلکہ غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے۔ اور وہی انسان انسان ہے جو غیر معمولی حالات میں انسان ثابت ہو۔ جو ٹوٹنے کے بعد بھی ویسا ہی رہے جیسا کہ وہ ٹوٹنے سے پہلے دکھائی دے رہا تھا۔

۳۰ ستمبر ۱۹۸۴

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں قرآن (Qur'an) پر مفصل مقالہ ہے۔ اس کے آخر میں قرآنی تراجم کی تفصیل ہے۔ عجیب بات ہے کہ فارسی، ترکی اور اردو میں تو مسلمانوں نے قرآن کے ترجمے کئے۔ یہ زبانیں مسلمانوں کی زبانیں تھیں۔ مگر دوسری قوموں کی زبان میں ترجمے ایک عرصہ دراز تک صرف غیر مسلم کرتے رہے۔

لاطینی زبان میں پہلا ترجمہ ۱۱۴۳ میں کیا گیا۔ یہ ترجمہ ایک عیسائی پادری نے کیا۔ اسی طرح اطالوی، جرمن، ڈچ، فرانسیسی وغیرہ زبان میں بھی ابتدائی ترجمے عیسائیوں اور یہودیوں نے کئے۔ انگریزی میں بھی پہلا ترجمہ الکزینڈر راس نے کیا، وغیرہ۔ عیسائیوں کے بعد انگریزی میں جس شخص نے پہلا ترجمہ کیا وہ ایک قادیانی تھا۔ بعد کو دوسرے کچھ مسلمانوں کے ترجمے شائع ہوئے۔ زیادہ تر اس جذبہ کے تحت کہ دوسروں نے غلط ترجمہ کیا ہے، اس کو صحیح کیا جائے۔

اس کی وجہ مسلمانوں میں دعوتی ذہن نہ ہونا ہے۔ ہمارے علما و مفکرین زیادہ سے زیادہ یہ سوچ سکے کہ غیر عربی داں مسلمانوں کے لئے قرآن کا ترجمہ تیار کریں۔ یہ

بات ان کے ذہنی دائرہ سے باہر رہی کہ غیر مسلم اقوام کے لئے ان کی اپنی زبانوں میں قرآن کے ترجمے تیار کرکے شائع کئے جائیں۔ تاکہ وہ اسلام سے واقف ہوں۔

مسلمانوں میں اگر دعوتی ذہن ہوتا تو دور پریس آنے کے بعد وہ نہایت جوش اور وسعت کے ساتھ یہ کام کرتے۔ مگر دعوتی ذہن نہ ہونے کی وجہ سے وہ یہ انتہائی ضروری کام نہ کرسکے۔ غیر مسلموں میں بطور خود تجسس پیدا ہوا۔ انھوں نے قرآن کو پڑھا اور اپنی زبانوں میں اس کے ترجمے کئے۔ مگر مسلمانوں میں کبھی یہ جذبہ ہی نہیں ابھرا کہ قرآن کا ترجمہ دنیا کی دوسری زبانوں میں کریں تاکہ غیر مسلم حضرات قرآن کی تعلیمات سے واقف ہوسکیں۔

یکم اکتوبر ۱۹۸۴

۱۹۴۷ سے پہلے جب ہندستان میں آزادی اور غلامی کی کش مکش چل رہی تھی، انگریزوں نے کہا کہ ہم نے ہندستان کو بہترین گورنمنٹ دی ہے، اس سے زیادہ آپ لوگ اور کیا چاہتے ہیں۔ مہاتما گاندھی نے سختی کے ساتھ اس کی تردید کی۔ انھوں نے کہا کہ اچھی حکومت، حکومت خود اختیاری کا بدل نہیں ہے:

Good government is no substitute for self-government.

مگر یہ صرف ایک جذباتی بات ہے جو کہنے میں بہت اچھی لگتی ہے، مگر وہ برتنے میں اچھی نہیں۔ ہندستان ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو آزاد ہوا، اس کے بعد ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو گاندھی جی کے ایک سیاسی مخالف نے انھیں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ بندوق کی گولی جب گاندھی جی کے جسم میں پیوست ہو چکی تھی اور وہ موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا تھے، اس وقت کوئی شخص ان سے پوچھتا کہ غلام ہندستان کا مخالف آپ کو آغا خاں پیلس میں نظر بند کرتا تھا اور آزاد ہندستان کا مخالف آپ کو گولی مار رہا ہے۔ اب بتائیے کہ دونوں میں سے کون اچھا ہے تو شاید ان کا جواب پہلے جواب سے مختلف ہوتا۔

آج اگر ایک عام ہندستانی سے پوچھا جائے کہ انگریزی دور تمہارے لئے اچھا تھا جب کہ تمہاری جان ومال محفوظ تھی، دفتروں میں رشوت کے بغیر کام ہوتا تھا، یا موجودہ دور اچھا ہے جب کہ کسی شخص کی جان ومال محفوظ نہیں، رشوت کے بغیر کسی دفتر میں کوئی کام نہیں ہوتا، تو

شاید اس کا جواب اس سے مختلف ہوگا جس کی نمائندگی مہاتما گاندھی نے اپنے مذکورہ فقرہ میں کی تھی۔

۲ اکتوبر ۱۹۸۴

بعض مرتبہ آدمی ایسے الفاظ بولتا ہے جو گریمر کے لحاظ سے صحیح مگر حقیقت کے اعتبار سے غلط ہوتے ہیں۔ ۱۹۷۷ کا واقعہ ہے۔ امریکہ نے ایک خلائی جہاز (space-craft) خلا میں بھیجا۔ اس کے دو مسافر تھے ایک مرد اور ایک عورت۔ مرد کا نام بورمن (Frank Borman) تھا۔ واپسی کے بعد مسٹر بورمن نے ایک بیان میں کہا: عورت کو خلائی جہاز میں بٹھانا اچھا ہے۔ مگر ایک مرد اور ایک عورت کو دیر تک اس طرح قریب رکھنا ابتری (upsetting) کا باعث ہوگا۔

مسٹر بورمن کے اس بیان سے موجودہ نظریۂ مساوات مرد و زن پر زد پڑتی تھی۔ چنانچہ آزادی نسواں کی ایک پرجوش حامی خاتون نے کہا: "مسٹر فرینک بورمن کا وجود کہاں ہوتا اگر ان کے ماں اور باپ اکٹھا نہ ہوئے ہوتے۔"

یہ جملہ گریمر کے لحاظ سے صحیح مگر حقیقت کے اعتبار سے غلط ہے۔ فرینک بورمن کے والدین بذریعہ نکاح شوہر اور بیوی کی حیثیت سے اکٹھا ہوئے تھے۔ جب کہ مذکورہ خلائی جہاز میں جس مرد اور عورت کو ایک ساتھ بھیجا گیا تھا وہ ایک دوسرے کے لئے غیر کی حیثیت رکھتے تھے۔

انسان جب ایک بات کو نہ ماننا چاہے اور اس کو رد کرنے کے لئے اس کے پاس دلیل بھی نہ ہو تو اس وقت وہ دھاندلی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ یہ دھاندلی نہ صرف انتہائی غیر علمی حرکت ہے بلکہ وہ بدترین جرم بھی ہے۔ سچائی کے مقابلہ میں انسان کا رویہ اعتراف کا ہونا چاہئے نہ کہ انکار اور دھاندلی کا۔

۳ اکتوبر ۱۹۸۴

الفتنة نائمة ولعن الله من ايقظها (فتنہ سویا ہوا ہے، اور اس شخص پر اللہ کی لعنت ہو جو اس کو جگائے)

اس کا مطالعہ ہندستان کے حالات میں کیجئے۔ اس ملک میں ہندو اکثریتی فرقہ کی حیثیت

رکھتے ہیں۔ وہ ہر اعتبار سے مسلمانوں سے آگے ہیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ہندوؤں کے ذہن میں بہت سی تلخ یادیں چھپی ہوئی ہیں ــــــــ مسلمانوں نے باہر سے آکر آٹھ سو سال تک ہمارے اوپر حکومت کی۔ مسلم حکمرانوں نے مندروں کو توڑ کر مسجد میں تبدیل کیا۔ مسلمانوں نے بھارت ماتا کے دو ٹکڑے کروائے۔ ملک بٹوانے کے باوجود وہ ہمارے حصہ دار بنے ہوئے ہیں۔ وغیرہ

اس قسم کی بہت سی تلخ یادیں ہیں جو ہندوؤں کے دماغ میں بسی ہوئی ہیں۔ تاہم روزمرہ کی زندگی کے تقاضے ان یادوں کو دبائے رہتے ہیں۔ مزید یہ کہ ہندو قوم ایک زرپرست قوم ہے زر کو حاصل کرنا اس کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ چنانچہ ہندوؤں کا حال یہ ہے کہ دولت کمانے کی دھن میں وہ دوسری تمام باتوں کو بھولے ہوئے رہتے ہیں۔ گویا ہندو قوم کے ذہن میں ایک "فتنہ" ہے مگر عام حالات میں وہ سویا ہوا رہتا ہے۔ لیکن مسلمان یہ کرتے ہیں کہ اپنی جذباتیت اور اپنے جھوٹے فخر کی وجہ سے وہ اس خفتہ فتنہ کو جگا دیتے ہیں۔

مثلاً ہندوؤں کا ایک مذہبی یا قومی جلوس سڑک پر جا رہا ہے۔ راستہ میں ایک مسجد ہے۔ یہاں مسلمان نکل کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنا جلوس دوسرے راستہ سے لے جاؤ، ہم اپنی مسجد کی طرف سے مشرکانہ جلوس کو نہیں جانے دیں گے۔ اس قسم کے تمام افعال جو مسلمان اس ملک میں ۵۰ برس سے کر رہے ہیں وہ سب فتنہ کو جگانے والے ہیں۔ فتنہ جب جاگتا ہے تو ہندو مسلم فساد ہوتا ہے جس میں ہمیشہ مسلمان ہی یکطرفہ طور پر مارے جاتے ہیں۔ وہ یکطرفہ طور پر برباد ہوتے ہیں۔

جو فتنہ سویا ہوا ہے اس کو سویا رہنے دیجئے۔ وہ شخص لعنت زدہ ہے جو سوئے ہوئے فتنہ کو جگا دے۔

۴ اکتوبر ۱۹۸۴

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ایک آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" اسلام کی تلوار ایسے لوگوں کی گردنیں کاٹنے کے لئے توضرور تیز ہے جو اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں یا اللہ کی زمین میں فتنہ و فساد پھیلاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ ظالم نہیں ہیں ....." (الجہاد فی الاسلام، صفحہ ۱۰۵)

اسی طرح موصوف اپنی کتاب "پردہ" میں پردہ اور نقاب سے بحث کرتے ہوئے کتاب

کے آخر میں لکھتے ہیں: "پردہ میں تخفیف کرنے سے پہلے آپ کو کم از کم اتنی قوت پیدا کرنی چاہئے کہ اگر کوئی مسلمان عورت بے نقاب ہو تو جہاں اس کو گھورنے کے لئے دو آنکھیں موجود ہوں، وہیں ان آنکھوں کو نکال لینے کے لئے پچاس ہاتھ بھی موجود ہوں" (پردہ، صفحہ ۲۷۲)

یہ زبان میرے ذوق کے سراسر خلاف ہے۔ اس زبان میں جو بے دردی اور قساوت ہے اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی داعی کا کلام نہیں ہے بلکہ کسی جلاد کا کلام ہے۔ داعی کا کلام درد اور شفقت سے بھرا ہوا کلام ہوتا ہے۔ مگر مجھے اس کے اندر درد اور شفقت کی بو محسوس نہیں ہوتی۔ ان الفاظ میں جلاد کی بے دردی ہے نہ کہ داعی کی دردمندی۔

۵ اکتوبر ۱۹۸۴

جون ۱۹۶۷ میں عرب۔ اسرائیل جنگ ہوئی۔ اس چھ روزہ جنگ میں اسرائیل کو زبردست کامیابی ہوئی۔ اس نے عربوں کے بڑے حصہ پر قبضہ کرکے اپنا رقبہ بہت بڑھا لیا۔ اس جنگ میں اسرائیل کی کامیابی کا ایک راز یہ تھا ——— "اختلاف کے باوجود متحد ہونا"۔ اس وقت اسرائیل میں ایشکول (Levi Eshkol) کی حکومت تھی۔ ایشکول کی حکومت ۱۹۶۳ سے ۱۹۶۹ تک رہی۔

ایشکول اور موشے دایان کے درمیان زبردست اختلاف تھا۔ اسی اختلاف کی بنا پر موشے دایان نے ۱۹۶۴ میں کابینہ سے استعفا دے دیا تھا۔ مگر ۱۹۶۷ میں جمال عبدالناصر کی پالیسی کے نتیجہ میں جب محسوس ہوا کہ اسرائیل اور عربوں کے درمیان جنگ ہو کر رہے گی تو اس وقت کے اسرائیلی وزیر اعظم لیوی ایشکول نے اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا۔ اس کو محسوس ہوا کہ جنگ کو جیتنے کے لئے جنرل موشے دایان کی خدمات کو حاصل کرنا بہت ضروری ہے جس کو جنگی معاملات میں غیر معمولی مہارت حاصل ہے۔

چنانچہ یکم جون ۱۹۶۷ کو جنرل موشے دایان کو کیبنٹ میں لے لیا گیا اور اس کو اسرائیل کا وزیر جنگ بنا دیا گیا۔ اس کے جلد ہی بعد ۵ جون کو جنگ چھڑ گئی جو ۱۰ جون ۱۹۶۷ کو اسرائیل کی فتح پر ختم ہوئی۔

جنرل موشے دایان اس سے پہلے لیوی ایشکول پر سخت تنقیدیں کیا کرتا تھا۔ دونوں ایک

دوسرے کے سیاسی رقیب بنے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود ایشکول نے اس کی فوجی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس کو دفاع کی وزارت سونپ دی۔ یہی اختلاف کے باوجود متحد ہونا اسرائیل کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔

۶ اکتوبر ۱۹۸۴

عن ابی موسیٰ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احبّ دنیاہ اضرّ بآخرتہ و من احبّ آخرتہ اضرّ بدنیاہ فاٰثروا ما یبقیٰ علیٰ ما یفنیٰ (مسند احمد، بیہقی)

حضرت ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص دنیا کی محبت کرے گا وہ اپنی آخرت کا نقصان کرے گا۔ اور جو شخص آخرت کی محبت کرے گا وہ اپنی دنیا کا نقصان کرے گا۔ پس جو باقی رہنے والا ہے اس کو تم ترجیح دو اس پر جو فنا ہونے والا ہے۔

آدمی بیک وقت دو چیزوں سے محبت نہیں کرسکتا۔ ایک چیز سے محبت کی سطح پر تعلق ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ دوسری چیزوں سے اس کا تعلق محض رسمی ہو کر رہ جائے۔

۷ اکتوبر ۱۹۸۴

اسلامی شریعت کے مطابق یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تین طلاق دے دے تو وہ طلاق بائن ہو جاتی ہے۔ اب بعض لوگ اس طرح کہتے تھے کہ "میں تم کو تین طلاق دیتا ہوں"۔ اگرچہ یہ بھی غلط تھا۔ کیوں کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینا درست نہیں۔ کچھ لوگ اس سے بھی آگے اس طرح کے الفاظ بولنے لگے کہ ——— تجھ کو تین ہزار طلاقیں۔ یا اتنی طلاقیں جتنے آسمان میں تارے ہیں۔ وغیرہ

اس طرح اعداد طلاق میں اسراف کا ایک معاملہ رسول اللہ صلی اللہ کے سامنے آیا۔ آپ نے فرمایا:

"تیری بیوی کے تجھ سے جدا ہونے کے لئے تو صرف تین طلاق کافی تھی۔ بقیہ طلاقیں جو تو نے دی ہیں وہ تیرے حساب میں لکھی جائیں گی۔ یہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ انھیں معاف کرے یا اس کے سبب سے تجھے سزا دے"۔

طلاق کا تعلق عورت سے ہے نہ کہ مرد سے۔ پھر وہ مرد کے حساب میں کیوں لکھی جائیں گی، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کا کلام سرکشی کا کلام ہے۔ نکاح و طلاق کے احکام خدا کے احکام ہیں۔ آدمی جب ایک عورت سے نکاح کرتا ہے تو وہ خدا کے حکم کے تحت اس سے نکاح کرتا ہے۔ اسی طرح

جب وہ اس کو طلاق دیتا ہے تو خدا کے حکم تحت اس کو طلاق دیتا ہے۔ ایسی حالت میں متکلم کے اندر سنجیدگی کا انداز ہونا ضروری ہے۔

آدمی اگر کہے کہ "میں تم کو ایک طلاق دیتا ہوں" تو اس نے خدا کے بتائے ہوتے الفاظ کو دہرایا۔ اگر وہ کہے کہ "میں تم کو تین طلاق دیتا ہوں" تو اس نے خدا کے حکم کے ساتھ کھیل کیا۔ اور اگر وہ کہتا ہے کہ "تم کو اتنی طلاقیں جتنے آسمان میں تارے ہیں" تو وہ خدا کے آگے سرکشی کر رہا ہے۔ اس کو وہی سزا ملے گی جو سرکش کے لئے مقرر ہے، الّا یہ کہ وہ توبہ کرے اور اللہ اس کی توبہ قبول کرلے۔

۸ اکتوبر ۱۹۸۴

قال مطرف العابد : لان ابیت نائما واصبح نادما خیر من ان ابیت قائما واصبح معجبا۔

میں رات کو سوتا رہوں اور صبح کو ندامت کے ساتھ اٹھوں یہ مجھ کو اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں رات کو عبادت میں کھڑا رہوں اور عُجب کے ساتھ صبح کروں۔

اس قول میں اصل زور سونے پر نہیں ہے بلکہ عجب کے ساتھ صبح کرنے پر ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رات بھر سوتے رہو بلکہ اصل مطلب یہ ہے کہ عمل خیر پر نازاں نہ ہو۔

دین کی اصل حقیقت تواضع ہے۔ عجب اس کا ضد ہے۔ جو دینی عمل آدمی کے اندر تواضع پیدا کرے وہ سچا عمل ہے، اور جو دینی عمل آدمی کے اندر عجب اور کبر پیدا کرے وہ جھوٹا عمل۔ ہر دینی عمل کا مقصد یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کے قریب ہو۔ اور جو شخص خداوند عالم کے قریب ہوگا وہ عجز وتواضع کا نمونہ بنے گا نہ کہ کبر و ناز کا نمونہ۔

۹ اکتوبر ۱۹۸۴

ایک صاحب پاکستان سے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ پاکستان میں ایک دیوبندی عالم ہیں۔ وہ رد بدعت پر نہایت زبردست تقریر کرتے ہیں۔ چنانچہ لوگوں میں وہ "مولانا بجلی گھر" کے نام سے مشہور ہیں۔

میں نے سوچا کہ کیسی عجیب ہے وہ قوم جو ایک طرف "رحمۃ للعالمین" کا امتی ہونے پر

فخر کرتی ہے۔ دوسری طرف اس کے پاس جھگڑے اور فساد والی تقریروں کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔

مسلمانوں نے مولانا "بجلی گھر" تو پیدا کئے۔ مگر مولانا رحمت عالم، اور مولانا دردِ شفقت پیدا نہیں کیا۔ مسلمانوں میں کوئی عالم نہیں جو غیر مسلموں کو سوز و ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبہ کے تحت خدا کے دین کا پیغام پہنچائے۔ البتہ آپس کے جھگڑوں میں ہر آدمی آندھی اور طوفان بنا ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان باہمی جھگڑوں کا پاور ہاؤس بنے ہوئے ہیں مگر وہ پیغام حق کا چشمۂ شیریں نہ بن سکے۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۸۴

مولانا عبد العزیز قاسمی مدرسہ بیت العلوم (سُربا پیٹ، ضلع نل گنڈہ) میں استاد ہیں انھوں نے ۱۹۸۳ کا ایک واقعہ بتایا۔

کرپا (آندھرا پردیش) میں سیرت النبی کا جلسہ تھا۔ مولانا عبد العزیز قاسمی بھی اس جلسہ میں مقرر کی حیثیت سے بلائے گئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ جلسہ سڑک پر ٹینٹ لگا کر کیا جارہا تھا۔ شامیانہ کے نیچے فرش اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ عین اس وقت ہندوؤں کا ایک جلوس نکلا۔ یہ کسی دیوی کا جلوس تھا۔ وہ گزرتا ہوا جلسہ گاہ کے قریب پہنچ گیا۔ جلسہ کے منتظمین نے جب یہ دیکھا تو ان کے چند افراد آگے بڑھ کر جلوس کے قائدین سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو یہ معلوم نہ تھا کہ آج اس سڑک سے آپ کا جلوس نکلنے والا ہے، ورنہ ہم یہاں آج اپنا جلسہ نہ رکھتے بہر حال آپ ہمیں تھوڑا سا وقت دیں، ہم اپنا جلسہ تھوڑی دیر کے لئے روک کر ٹینٹ اور کرسیاں وغیرہ ہٹا دیتے ہیں۔ آپ کا جلوس جب گزر جائے گا تو اس کے بعد دوبارہ اس کو لگالیں گے۔

جلسہ سیرت النبی کے لوگوں نے جب اس قسم کی پیشکش کی تو جلوس والوں کے دل نرم پڑ گئے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ جیسے ہمارا جلوس ہے ویسے ہی آپ کا جلسہ بھی ہے۔ آپ اپنے جلسہ کو گڑبڑ نہ کریں۔ ہم لوگ بازو کی گلی سے نکل کر پھر سڑک پر آجائیں گے۔ آپ کا جلسہ بھی جاری رہے گا۔ اور ہمارا جلوس بھی نکل جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ لوگ راستہ بدل کر آگے چلے گئے۔

مسلمان اگر جلوس کو روکتے تو بات بڑھتی اور فساد ہوتا، مگر جب مسلمانوں نے جلوس کو نہیں روکا تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم اگر نرمی اختیار کریں تو وہ لوگ اور زیادہ دلیر ہو جائیں گے، انھیں اس واقعہ سے سبق لینا چاہئے۔

۱۱ اکتوبر ۱۹۸۴

یہ ۲۹ اپریل ۱۹۶۸ کا واقعہ ہے۔ اس وقت میں جمعیۃ علماء ہند کے دفتر مسجد عبد النبی (نئی دہلی) میں تھا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت تھا۔ دستر خوان پر مرکز کے لوگ اور کئی مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ شفیق چپراسی کھانا لا لا کر دستر خوان پر رکھ رہا تھا۔ وہ دال کا پیالہ لایا تو اتفاق سے اس کا ہاتھ ہل گیا اور دال چھلک کر مولانا اسعد مدنی کی پیٹھ پر گر پڑی۔ سفید دھلا ہوا کرتا گندا ہو گیا۔ دستر خوان پر بیٹھے ہوئے لوگ شفیق کو بری نظروں سے دیکھنے۔ خود شفیق کو بھی شدید احساس ہوا۔ مگر مولانا اسعد مدنی نے شفیق کو کچھ نہیں کہا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے:

چھوڑو اس کو، اپنا کام کرو۔

مولانا اسعد مدنی سے مجھے سخت اختلاف ہے۔ میرا یہ اختلاف اسی زمانہ میں ظاہر ہو گیا تھا جب کہ میں الجمعیۃ ویکلی سے وابستہ تھا۔ میری ڈائری میں درج ہے کہ:

۲۹ دسمبر ۱۹۷۰ کو جب کہ میں جمعیۃ بلڈنگ میں اپنے دفتر کے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا، الجمعیۃ کے منیجر جناب الطاف الرحمٰن کانپوری آئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ مولانا اسعد مدنی نے ان سے کہا ہے کہ وہ روزنامہ الجمعیۃ اور ہفت روزہ الجمعیۃ دونوں کے نہ صرف شاکی ہیں، بلکہ دونوں سے انھیں دکھ پہنچا ہے۔

مولانا اسعد مدنی سے اختلاف کے باوجود میں نے دیکھا ہے کہ ان کے اندر کچھ خاص صلاحیتیں ہیں جو دوسروں میں نہیں۔ مثلاً وسعت ظرف جس کا ایک نمونہ اوپر کی مثال میں نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ڈاکو بننا ہو تب بھی کچھ صلاحیتیں درکار ہیں۔ بے صلاحیت آدمی اس دنیا میں کچھ نہیں بن سکتا۔

تاہم مولانا اسعد مدنی اور اس قسم کے دوسرے حضرات کا وسعت ظرف بہت محدود دائرہ میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے موافقین کے لئے وسیع الظرف ہوتے ہیں مگر اپنے مخالفین کے لئے اتنا ہی

تنگ ظرف بن جاتے ہیں۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۸۴

موجودہ دنیا میں انسان کا امتحان بڑا عجیب ہے۔ اس کا امتحان یہ ہے کہ ——— وہ بظاہر بے مقصد عالم کے اندر چھپی ہوئی مقصدیت کو دریافت کرے۔ وہ نہ دکھائی دینے والے خدا کو دیکھے۔ کوئی مجبوری نہ ہو تب بھی وہ اطاعت کرے۔ مکمل طور پر دنیا میں رہتے ہوئے مکمل طور پر آخرت والا بنے۔ وہ حق کا اعتراف کرے جب کہ وہ اس کا انکار کرنے کے لئے پوری طرح آزاد ہو۔ خلاصہ یہ کہ وہ قیامت کے آنے سے پہلے قیامت کو اپنے اوپر طاری کرلے۔ بظاہر وہ اپنے آپ کو خدا کی مانند پائے مگر وہ خود اپنے ارادہ سے اپنے آپ کو بندہ بنالے۔

یہ ایک بے حد آسان مگر بے حد سخت امتحان ہے۔ آسان اس لئے کہ یہ سب کچھ اندرونی نفسیات کی سطح پر پیش آتا ہے۔ آدمی کو اس کے سوا اور کچھ نہیں کرنا پڑتا کہ وہ ایک ڈھنگ سے سوچنے کے بجائے دوسرے ڈھنگ سے سوچنے لگے۔ وہ اپنی زبان سے ایک لفظ نکالنے کے بجائے دوسرا لفظ نکالے۔

مگر یہ آسان ترین چیز آدمی کے لئے مشکل ترین چیز بن جاتی ہے۔ کیوں کہ ایسا کرنے کے لئے آدمی کو اپنی انا کو توڑنا پڑتا ہے، اور بلاشبہ انا کو توڑنے سے زیادہ مشکل کوئی کام انسان کے لئے نہیں۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۸۴

سابق شاہ ایران محمد رضا پہلوی نے اپنی جلاوطنی کے آخری دنوں میں اپنے حالات قلم بند کئے تھے جواب شائع ہو گئے ہیں۔ اس کا ایک پیراگراف یہ ہے: "اکتوبر ۱۹۷۹ تک میکسکو میں میری حالت زیادہ بگڑنے لگی اور مجھے اپنے ماتحتوں کا یہ مشورہ قبول کرنا پڑا کہ اب علاج کے لئے امریکہ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ۲۲ اکتوبر کی شام کو میکسکو کے ہوائی اڈہ پر ہوائی جہاز میرے لئے تیار کھڑا تھا اور امریکی قونصل جنرل وہاں موجود تھا جو میرے کاغذات کو آخری شکل دینے آیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور مجھے اس کے چہرہ پر حیرت کے آثار نظر آئے۔ شاید اسے مجھ میں وہ شہنشاہ دکھائی نہ دیا بقول اخبارات "بنیادی انسانی حقوق کا دشمن" اور "عوام

کے لئے تشدد" کی علامت تھا۔ قونصل جنرل نے اس کے برعکس اپنے سامنے ایک ایسا کمزور اور بیمار انسان دیکھا جو مشکل ہی سے چل رہا تھا"

۱۴ اکتوبر ۱۹۸۴

۴۰ھ تک احادیث وضع سے پاک رہیں۔ علی و معاویہ کی جنگ کے بعد جو سیاسی اختلافات پیدا ہوئے اس سے وضع حدیث کا دروازہ کھلا۔ ہر فرقہ اپنے کو برسرِ حق ثابت کرنے کے لئے حدیثیں گھڑنے لگا۔ اس کے نتیجہ میں علم حدیث وجود میں آیا۔ اور جرح و تنقید کے ذریعہ معلوم کیا جانے لگا کہ کون حدیث صحیح ہے اور کون غلط۔

تاہم لاکھوں کی تعداد میں موضوع حدیثیں امت کے اندر پھیل گئیں۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے موضوع احادیث پر مستقل کتابیں لکھیں۔ انھیں میں سے ایک حافظ ابوالفرج بن جوزی (م ۵۹۷ھ) ہیں۔ ابن جوزی نے اپنی کتاب میں صحاح تک میں موضوع احادیث کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں بخاری کی ایک، مسلم کی ۲، مسند احمد کی ۳۸، سنن ابی داؤد کی ۹، ترمذی کی ۳۰، نسائی کی ۱۰، ابن ماجہ کی ۳۰، مستدرک حاکم کی ۶۰ حدیثیں درج ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سی احادیث کو موضوع بتایا ہے۔

اگرچہ علماء نے بعض روایتوں کے سلسلہ میں ابن جوزی کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ تاہم اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ احادیث کو جانچنے کے سلسلہ میں ہمارے علما کس قدر شدید تھے۔ اور کس طرح بلا رورعایت ہر روایت کو جانچتے تھے تاکہ ایسا نہ ہو کہ جو چیز قول رسول نہیں ہے اس کو قول رسول کہہ دیا جائے۔

مگر ہمارے علما میں یہی ذہن وسیع تر حقیقتوں کے لئے نہیں بنا۔ یعنی ایسا نہیں ہوا کہ وہ دوسری تمام چیزوں کو حقیقت واقعہ سے جانچیں اور جو چیز حقیقت نہ ہو اسے رد کر دیں۔

یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں اور شخصیات کے تذکروں میں بے شمار غیر واقعی باتیں بھر گئیں۔ یہاں ہر بات کتابوں میں درج کر دی گئی خواہ وہ بالکل بے اصل کیوں نہ ہو۔ مسلمانوں کا علمی ذہن صرف حدیث تک رہا، اس کے بعد ان کا علمی ذہن ختم ہو گیا۔ اس کمی کے زبردست نقصانات پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کو پہنچے ہیں۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۸۴

خلیفہ ثانی عمر فاروق رض کا ایک واقعہ ہے۔ ان کے سامنے زنا سے حمل کا ایک کیس آیا۔ تحقیق کے بعد آپ نے حاملہ زانیہ کو رجم کرنے کا حکم دے دیا۔ حضرت علی نے فوراً اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا:

لان جعل اللہ لک علیہا سبیلا فانہ لم یجعل لک علی ما فی بطنہا سبیلا

اللہ نے آپ کو اس عورت کے اوپر حد جاری کرنے کا اختیار دیا ہے مگر اس کے پیٹ میں جو بچہ ہے اس پر اختیار نہیں دیا۔

عمر فاروق نے یہ سنتے ہی فوراً اپنا فیصلہ منسوخ کر دیا اور کہا:

لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ

اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام میں اعتراف کا جذبہ کتنا زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ کوئی شخص اگر ان کی غلطی کو بتاتا تو اس کو محسوس کرنے میں ان کو ایک لمحہ کی دیر نہ لگتی۔ وہ بلا تاخیر اس کا اعتراف کر لیتے۔ ان کی روح کو اس کے بغیر تسکین نہ ملتی کہ اعتراف کا آخری لفظ جو ان کے پاس ہے اسے استعمال کر ڈالیں۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۸۴

غزوۂ احزاب (شوال ۵ ھ) بڑے سخت حالات میں ہوا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ کھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ چنانچہ اکثر اوقات فاقے میں گزر رہے تھے۔ دشمنوں نے مدینہ کو اس طرح گھیر رکھا تھا کہ کہیں نکلنے تک کی گنجائش نہ تھی۔ ان حالات میں مہاجرین و انصار نے خندق کھودی۔ وہ کھدائی کر رہے تھے اور مٹی اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے اور یہ شعر پڑھتے جا رہے تھے:

نحن الذین بایعوا محمدا علی الجہاد ما بقینا ابدا

ہم وہ لوگ ہیں جنھوں نے محمد کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ ہم نے جہاد پر بیعت کی ہے جب تک بھی ہم اس دنیا میں باقی رہیں۔

"جہاد" کے معنی ہیں اپنی آخری کوشش صرف کر دینا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم "محمد" کے ساتھ ہیں، ہم کبھی ان کو چھوڑنے والے نہیں، خواہ اس کی قیمت ہمیں یہ دینی پڑے کہ ہم پر فاقے

پڑیں، ہماری معاشیات تباہ ہوں۔ ہمارے گھر اجڑ جائیں۔ ہم کو پتھر توڑنا اور مٹی ڈھونا پڑے۔ ہم کو تلوار کے مقابلہ میں کھڑا ہونا پڑے جب کہ ہمارے پاس تلوار بھی نہ ہو۔ غرض جو بھی قیمت دینی ہو وہ قیمت ہم دیں گے۔ مگر ہم نے جس شخص کے ہاتھ پر حق کی بیعت کی ہے اس کو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔

اپنے قول پر پورا اترنے کا یہ کردار ہی اس دنیا میں سب سے بڑی چیز ہے۔ ایسے لوگ جب قابل لحاظ تعداد میں اکٹھا ہو جائیں تو وہی وہ لوگ ہیں جو حقیقی انقلاب لاتے ہیں، وہ تاریخ کا رخ موڑ دیتے ہیں۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۸۴

عربی کا ایک مقولہ ہے: الوقت کالسیف۔ اذا لم تقطعہ قطعک۔ (وقت تلوار کی مانند ہے۔ اگر تم اس کو نہ کاٹو تو وہ تم کو کاٹ ڈالے گا)

یہ ایک نہایت سچی بات ہے۔ وقت کوئی ٹھہری ہوئی چیز نہیں۔ وہ ہر لمحہ گزر رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو وقت استعمال نہیں ہوا وہ کھو گیا۔ اگر آپ نے وقت کو استعمال کر لیا تو آپ وقت کے فاتح ہیں۔ اور اگر آپ وقت کو استعمال نہ کر سکے تو وقت آپ کے اوپر فاتح۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۸۴

اردو زبان میں عربی زبان کے الفاظ کثرت سے موجود ہیں۔ مگر بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو استعمال کے اعتبار سے عربی میں کچھ مفہوم رکھتے ہیں اور اردو میں کچھ۔

ایک عرب ملک میں کچھ ہندستانی لوگ شریک تھے۔ ایک موقع پر اسٹیج کی طرف سے اعلان کیا گیا: التقریر سوف یوزع الیکم ہندستانی بزرگ نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ اسپیچ پر آپ کے درمیان تقسیم کی جائے گی۔ حالاں کہ تقریر سے مراد رپورٹ تھا۔ اور اس کا مطلب یہ تھا کہ رپورٹ آپ کے درمیان تقسیم کی جائے گی۔

اس طرح کے لطیفے ہندستانیوں اور عربوں کی ملاقات کے دوران اکثر پیش آتے ہیں۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۸۴

ہمارے فقہاء نماز کے جزئی مسائل کی حد درجہ تفصیل اور تحقیق کرتے ہیں۔ مگر خشوع کے بارے میں وہ اتنا کہنا کافی سمجھتے ہیں:

ان الخشوع ادبٌ من آداب الصلوٰة

خشوع نماز کے آداب میں سے ایک ادب ہے۔

یہ خشوع کی نہایت ناقص تشریح ہے۔ کیوں کہ خشوع نماز کی اصل حقیقت ہے۔ نہ کہ وہ نماز کے آداب میں سے ایک ادب ہے۔ قرآن میں واضح طور پر موجود ہے:

قد افلح المومنون الذین ہم فی صلاتہم خاشعون (وہ اہل ایمان کامیاب ہوگئے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔

فقہاء ان بحثوں میں پڑے جو بحثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کی تھیں۔ اور نہ آپ کے بعد آپ کے اصحاب نے کیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صراط مستقیم سے ہٹ گئے۔ فقہاء کی نوایجاد بحثوں میں نماز مسائل کی ایک چیز بن گئی، حالاں کہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے وہ خشوع کی ایک چیز تھی۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۸۴

دنیا کے تمام حکمراں امن امن پکار رہے ہیں مگر دنیا میں کہیں بھی امن قائم نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امن کا لفظ ان حکمرانوں کے لئے محض ایک قیادتی نعرہ ہے نہ کہ کوئی سنجیدہ فیصلہ۔ ایسا ہی کچھ معاملہ آج اسلام کا بھی ہو رہا ہے۔ آج ہر طرف اسلام کا غلغلہ بلند ہے۔ مگر خدا کی زمین پر چند گز زمین بھی ایسی نہیں جہاں حقیقی معنوں میں اسلام قائم ہو۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اسلام کے اوپر اپنی بڑائی قائم کرنا چاہتے ہیں۔ بھرے ہوئے مجمع میں کوئی بھی نہیں جو اپنی ذات کے اوپر اسلام کی بڑائی قائم کرنے کے لئے بے قرار ہو۔

۲۱ اکتوبر ۱۹۸۴

بدیع الزماں سعید النورسی ۱۸۷۳ء میں ترکی میں پیدا ہوئے۔ ۲۰ سال کی عمر میں وہ ملکی سیاست میں داخل ہوگئے۔ بالآخر مایوس ہو کر ۱۹۲۱ میں سیاست سے علٰحدہ ہوگئے:

بدأ بدیع الزمان الفصل الثانی من حیاتہ بقولہ (اعوذ باللّٰہ من الشیطان والسیاسۃ)، ثم راح یتخذ من ہٰذہ الکلمۃ دستوراً لجمیع صفحات ہٰذا الفصل الجدید من عمرہ۔ فقد غادر انقرہ الی مکان مافی

بلدة وان، منزويا عن الحكام والنواب، مبتعدا عن جميع مشاكل السياسة واصحابها

الدكتور محمد سعید رمضان البوطی، من الفکر الی القلب، دمشق ۱۹۷۳، صفحہ ۳۲۰

بدیع الزماں نے اپنی زندگی کا دوسرا دور اس قول سے شروع کیا: میں شیطان اور سیاست سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ پھر یہی کلمہ ان کی عمر کے نئے دور کا دستور بنا رہا۔ انھوں نے انقرہ چھوڑ دیا اور وان کے ایک مقام پر آکر بس گئے۔ وہ امراء اور حکام سے الگ رہتے اور سیاسی مسائل اور اس کے لوگوں سے دور۔

یہی موجودہ زمانہ کے اکثر مسلم رہنماؤں کا حال ہوا ہے۔ انھوں نے اپنی جوانی کی عمر سیاسی ہنگاموں میں گزاری۔ اور آخر میں وہ سیاست سے الگ ہو کر دوسرے انداز کی باتیں کرنے لگے۔ مگر ان میں سے کسی رہنما کی بعد کی زندگی یہ ثابت نہیں کرتی کہ انھوں نے شعوری طور پر کسی نئی چیز کو دریافت کیا تھا۔ ان کی زندگی کا یہ دوسرا دور زیادہ تر ان کی مایوسی کا نتیجہ تھا نہ کہ ان کی کسی نئی دریافت کا نتیجہ۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۸۴

آدمی جب سرکشی کا ایک فعل کرتا ہے تو گویا وہ اپنے آپ کو دلدل میں ڈال دیتا ہے۔ اس دلدل سے نکلنے کی واحد تدبیر توبہ ہے۔ آدمی اگر سرکشی کرنے کے بعد اللہ کی طرف پلٹ آئے اور دل سے توبہ و استغفار کرے تو یہ چیز اس کو دلدل سے نکالنے کا ذریعہ بن جائے گی۔

اس کے برعکس اگر وہ یہ کرے کہ اپنی سرکشی پر قائم رہے اور اپنے آپ کو برسر حق ثابت کرنے کے لئے جھوٹ اور فریب کی مہم چلائے تو وہ مزید دلدل میں پھنستا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ اس میں ہمیشہ کے لئے غرق ہو جائے گا۔

۲۳ اکتوبر ۱۹۸۴

ہوائی جہاز کے اغوا (hijacking) کا واقعہ غالباً پہلی بار ۱۹۳۱ میں پیش آیا۔ یہ ہوائی جہاز پیرو میں اغوا کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۱ سے اب تک مجموعی طور پر ہوائی جہازوں کے اغوا کے ۷۷۵ واقعات پیش آئے ہیں جن میں ۲۳۰ مسافر ہلاک ہوئے ہیں۔

ایشیا میں ہوائی جہاز کو اغوا کرنے کا پہلا واقعہ غالباً ۱۹۴۸ میں پیش آیا۔ اس جہاز

کو مکاؤ سے ہانگ کانگ جاتے ہوئے چار چینی باشندوں نے اغوا کیا تھا۔ انھوں نے دوران پرواز جہاز کے پائلٹ اور اس کے شریک پائلٹ دونوں کو غصہ میں آکر ھلاک کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاز بے قابو ہو کر سمندر میں گر گیا۔ اغوا کرنے والوں سمیت اس کے تمام مسافر مر گئے۔

ستمبر ۴۷، ۱۹ میں ویتنام کا ایک جہاز اغوا کیا گیا تھا۔ اغوا کرنے والا صرف ایک شخص تھا۔ اس نے بھی غصہ میں آکر دوران پرواز جہاز میں دستی بم چھوڑ دیا جس کے نتیجے میں جہاز تباہ ہو گیا اور اغوا کرنے والے شخص کو لے کر اس کے تمام ۰ ۷ مسافر ہلاک ہو گئے۔

دوسروں کو ختم کرنے کی یہ تدبیر بڑی عجیب ہے جس میں دوسروں کو ختم کرنے والا شخص خود اپنا بھی خاتمہ کر لے۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۸۴

دکتور محمد البہی مصری کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے:

الاسلام فی حیاۃ المسلم

۵۰۰ صفحات کی اس کتاب کا ایک باب ہے: الاسلام اکبر عدو للاستعمار۔ یعنی اسلام استعمار کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام دین حریت ہے، اور استعمار حریت کا دشمن ہے۔ اس لئے اسلام استعمار کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلم اہل قلم نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ زیادہ تر وقتی حالات سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کتابوں میں اکثر اسلام کے ساتھ غیر اسلام کی آمیزش ہو گئی ہے اس آمیزش نے ان کتابوں کی افادیت بہت گھٹا دی ہے۔

اس طرح کی کتابیں جو لوگ پڑھتے ہیں وہ ان سے متاثر ہو کر "استعمار" جیسی مفروضہ چیزوں سے لڑنے لگتے ہیں۔ اور آخر کار صرف اپنی قوتوں کو ضائع کرتے ہیں۔ ان مصنفین کے متعلق مجھے شبہ ہے کہ انھوں نے گہرائی کے ساتھ نہ "اسلام" کو سمجھا ہے اور نہ "استعمار" کو۔ وہ دونوں ہی کی حقیقت جاننے سے بے خبر رہے۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۸۴

مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم کے صاحبزادے مولانا محمد تقی عثمانی اپنے والد کا ایک واقعہ ان الفاظ

میں لکھتے ہیں :

والد صاحب کا معمول تھا کہ عام طور پر جو سائل آتا، آپ اس کو کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے۔ ایک بار میں گاڑی میں آپ کے ساتھ تھا۔ کسی جگہ گاڑی رکی۔ اور ایک سائل مانگنے کے لئے آگیا۔ آپ نے اپنی جیب سے کچھ نکال کر اسے دے دیا۔ میں نے والد صاحب سے کہا کہ اس قسم کے سائل عام طور پر مستحق نہیں ہوتے، پھر ان کو دینا چاہئے یا نہیں۔ اس کا جو جواب والد صاحب نے دیا وہ یہ تھا :

"ہاں میاں، بات تو ٹھیک ہے، لیکن یہ سوچو کہ اگر ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے استحقاق کی بنیاد پر ملنے لگے تو ہمارا کیا بنے گا۔" (البلاغ مفتی اعظم نمبر)

۲۶ اکتوبر ۱۹۸۴

تقسیم سے پہلے بنگال کے ایک مشہور سیاست داں تھے۔ ان کا نام عبدالرحمٰن صدیقی تھا۔ ان سے ایک ہندو نے کہا کہ مسلمان ہندستان کا حصہ نہیں بن سکتے۔ عبدالرحمٰن صدیقی نے جواب دیا کہ یہ بات مسلمانوں سے زیادہ آپ لوگوں پر چسپاں ہوتی ہے۔ آپ لوگ اپنے مردے کو جلاتے ہیں اس کے بعد ان کی راکھ دریاؤں میں بہتی ہوئی سمندروں میں پہنچ جاتی ہے اور اس طرح ملک کے باہر چلی جاتی ہے۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے مردہ کو زمین کھود کر مادر وطن کی آغوش میں ڈال دیتے ہیں۔ مسلمان مرنے کے بعد بھی مادر وطن ہی میں رہتے ہیں۔

یہ جواب کوئی علمی اور منطقی جواب نہیں۔ مگر سوال کرنے والے کے لئے صحیح ترین جواب یہی تھا۔ جو لوگ سنجیدہ ذہن کے ہوں ان کو سنجیدہ انداز میں بات سمجھائی جاتی ہے۔ مگر جو لوگ بے معنی سوال کریں، جیسا کہ مذکورہ سوال ہے، ایسے لوگوں کو اسی قسم کا جواب دینا مناسب ہے۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۸۴

ایک امتحان میں طلبہ کو یہ سوال دیا گیا کہ ایک عورت کا شوہر ایک چھوٹا بچہ چھوڑ کر مرگیا۔ عورت کو اپنے شوہر سے بے حد محبت تھی۔ اور یہی اس کے گھر کے لئے آمدنی کا واحد ذریعہ بھی تھا۔ ایسے محبوب شوہر کو کھونے کے بعد عورت کا کیا حال ہوگا۔ وہ زندہ رہنا پسند کرے گی یا یہ چاہے گی کہ خود بھی مر جائے۔ اکثر طلبہ نے یہ لکھا کہ عورت خود بھی مر جانا پسند کرے گی۔ مگر ایک طالب علم نے لکھا کہ وہ زندہ

رہنا چاہے گی تاکہ اپنے بچہ کی پرورش کر سکے۔ بچہ کی زندگی اور اس کے مستقبل کا سوال اس کو مجبور کرے گا کہ وہ ایک ایسی زندگی کو قبول کرے جس کو عام حالات میں قبول کرنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔

اسی کا نام بامقصد زندگی ہے۔ مقصد وہ چیز ہے جو آدمی کو جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔ جو آدمی مقصد کو کھودے، وہ جینے کا حوصلہ بھی کھودے گا۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۸۴

کانپور کے ایک قصبہ کی مسجد میں ایک روز رام چندر جی پرگٹ ہوگئے۔ مسلمانوں نے کہا کہ یہ مسجد ہے اسے خالی کرو۔ ہندوؤں نے کہا کہ یہاں رام چندر جی نے جنم لیا ہے اس لئے یہاں ان کی پوجا ہوگی۔ چنانچہ ہندو مسلم فساد کا اندیشہ پیدا ہوگیا۔ اس وقت کانپور کا کلکٹر ایک ہندو تھا مگر وہ نہایت منصف اور معقول تھا۔ اس نے ہندوؤں کو بلایا اور پوچھا کہ کیا تم لوگ رام چندر جی کی پوجا کرتے ہو۔ سب نے کہا کہ ہاں۔ کلکٹر نے پوچھا کہ پھر تم نے پوجا میں کیا گستاخی کی ہے کہ رام چندر جی تمہارے مندر سے خفا ہوکر مسجد میں چلے گئے۔ ہندو حضرات کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

کلکٹر نے اس کے بعد محلہ کے مسلمانوں کو بلایا۔ اس نے مسلمانوں سے پوچھا کہ تم میں سے جو لوگ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں وہ ہاتھ اٹھائیں۔ چند آدمیوں نے ہاتھ اٹھائے اور بقیہ تمام لوگ سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔

کلکٹر نے مسلمانوں سے کہا کہ جب تمہاری اکثریت نماز نہیں پڑھتی تو تم کو مسجد کی کیا ضرورت ہے۔ اگر ایک خالی جگہ کو کچھ دوسرے لوگ بھگوان کی پوجا کے لئے پسند کرلیں تو تم کو اس پر کیوں اعتراض ہے۔ دوبارہ مسلمانوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

ہندستان میں سو برس سے جو ہندو مسلم جھگڑے ہو رہے ہیں ان کی حقیقت بس یہی ہے۔ یہ دراصل ضد کے جھگڑے ہیں نہ کہ حقیقت کے جھگڑے۔ اس جھگڑے کے دونوں فریقوں میں سے کسی کو بھی نہ مذہب سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے اور نہ سچائی سے۔ وہ صرف قومی منافرت کے تحت ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں اور نام مذہب کا لیتے ہیں۔

دو گروہوں میں جب تناؤ کی کیفیت پیدا ہو جائے تو دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانا چاہیں گے۔ دونوں یہ چاہیں گے کہ کوئی ایسا موقع ملے جس کے ذریعہ وہ فریق ثانی کے خلاف اپنے

دل کی بھڑاس نکال سکیں۔ بس یہی اس مسئلہ کی کل حقیقت ہے جس کو ہندو مسلم مسئلہ کہا جاتا ہے۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۸۴

خلیفہ منصور عباسی نے حج کیا تو دیکھا کہ لوگ طرح طرح سے مراسم حج ادا کر رہے ہیں۔ اس نے چاہا کہ امام مالک کی کتاب کی بہت سی نقلیں تیار کرکے تمام بلاد و امصار میں روانہ کرے اور لوگوں کو ہدایت کر دے کہ وہ اسی کتاب (موطا) کے مطابق حج کے مراسم ادا کریں۔ خلیفہ نے جب اپنے اس ارادہ کا ذکر امام مالک سے کیا تو انھوں نے کہا:

یا امیر المومنین لا تفعل هٰکذا

اے امیر المومنین ایسا نہ کیجئے۔

اس کے بعد خلیفہ ہارون الرشید کا زمانہ آیا۔ اس نے بھی سفر حج میں مذکورہ منظر دیکھا تو مدینہ پہنچ کر دوبارہ امام مالک سے وہی بات کہی جو خلیفہ منصور نے کہی تھی۔ امام مالک نے دوبارہ جواب دیا:

یا امیر المومنین لا تفعل۔ فان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اختلفوا فی الفروع وتفرقوا فی البلدان وکل مصیب (شعرانی، میزان الکبریٰ)

اے امیر المومنین ایسا مت کیجئے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب فروعی امور میں مختلف تھے اور وہ شہروں میں پھیل گئے اور ان میں سے ہر ایک درست ہے۔

یہ محدثین کا نقطہ نظر تھا۔ وہ صحابہ کے اختلاف کو توسع پر محمول کرتے تھے۔ امام سفیان ثوری کا قول ہے:

لا تقولوا اختلف العلماء فی کذا بل قولوا قد وسع العلماء علی الامۃ

یہ نہ کہو کہ علما نے اس میں اختلاف کیا بلکہ یہ کہو کہ اس میں علما نے امت پر توسع کیا ہے۔

فروعی امور میں صحابہ کے اختلافات جن کو محدثین نے توسع قرار دیا تھا، انھیں اختلافات پر فقہا نے اپنی اپنی فقہ کی بنیاد رکھ دی۔ فقہا نے ان اختلافات کو لے کر یہ بحث شروع کر دی کہ کون صحیح ہے اور کون غیر صحیح۔ کون اولیٰ ہے اور کون غیر اولیٰ۔ کون افضل ہے اور کون غیر افضل۔ یہ بحثیں یقینی طور پر بدعت تھیں۔ انھیں بحثوں کے نتیجہ میں امت کے اندر وہ اختلافات وانتشار پیدا ہوا جو پھر کبھی ختم نہ ہوا۔ فقہا اگر ان فروعی اختلافات کو محدثین کی طرح توسع کے خانہ میں رکھتے تو

امت بے شمار لایعنی جھگڑوں سے بچ جاتی۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۸۴

کیوبا امریکہ کے قریب ایک جزیرہ ہے۔ یہاں کیونسٹ نواز حکومت قائم ہے۔ ۱۹۶۲ میں سابق روسی وزیر اعظم خروشچوف کے زمانہ میں روس نے خاموشی کے ساتھ یہ منصوبہ بنایا کہ وہ کیوبا میں اپنا فوجی اڈہ قائم کرے۔ اور اس طرح اپنی فوجی طاقت کو امریکہ کی سرحد تک پہنچا دے۔

پانی کے جہازوں پر لد کر بہت سے مزائل اور فوجی سازوسامان کیوبا کے ساحل پر پہنچ گئے۔ کام شروع ہوگیا۔ سابق امریکی صدر جان کینڈی کو اکتوبر ۱۹۶۲ میں اس کی خبر ہوگئی۔ انھوں نے روس کو سخت دھمکی دی اور ساتھ ہی کیوبا کی بحری اور فضائی ناکہ بندی کا حکم دے دیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ اگر روس کے فوجی جہاز کیوبا سے واپس نہ گئے تو کیوبا پر بمباری کرکے اس کو تباہ کر دیا جائے گا۔ ۱۳ دن بڑے (suspense) میں گذرے۔ اس کے بعد خروشچوف نے حکم دیدیا کہ تمام روسی جہاز مع فوجی سامان کیوبا سے واپس روس چلے آئیں۔

دانش مند آدمی مظاہرہ طاقت سے وہ فائدہ حاصل کر لیتا ہے جو فائدہ نادان آدمی استعمال طاقت سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ استعمال طاقت ایک ایسا طریقہ ہے جو یا تو ناکام ہوتا ہے یا کامیاب بھی ہوتا ہے تو دو طرفہ نقصان کے بعد۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴

ہندستان کے اندر اور ہندستان کے باہر اب تک میں نے جتنے بھی مسلم قائدین کا تجربہ کیا ہے، وہ سب "خوف" کی نفسیات کے تحت قوم کو اٹھانے اور ابھارنے میں مصروف ہیں۔ خوف کی نفسیات بلاشبہ سب سے زیادہ طاقتور نفسیات ہے۔ مگر ہمارے قائدین امت مسلمہ کو جس احساس خوف پر کھڑا کر رہے ہیں وہ انسان کا خوف ہے نہ کہ خدا کا خوف۔

ہندستان میں فرقہ وارانہ تشدد کا خوف، عرب دنیا میں صہیونیت کا خوف، دوسرے ممالک میں صلیبی طاقتوں کا خوف۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے خوف کی حالت ختم ہو جائے تو لوگوں کے پاس قیادت کرنے کا کوئی عنوان ہی باقی نہ رہے گا۔

مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب سے زیادہ غلط خوراک ہے جو موجودہ مسلم قیادت مسلم قوموں کو دے رہی

ہے۔ مسلمانوں کی کامیابی کا واحد راز یہ ہے کہ انھیں خوف خدا کی بنیاد پر کھڑا کیا جائے۔ ان کو خوف انسان کی بنیاد پر کھڑا کرنا کوئی رہنمائی نہیں۔ بلکہ وہ ایک ایسی چیز ہے جس کو جرم بتانا زیادہ صحیح ہوگا۔ کیوں کہ قرآن میں مومن کی خاص صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتا (.... ولم یخش الا اللہ)

یکم نومبر ۱۹۸۴

جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ چڑیاں اور مچھلی وغیرہ موسمی حالات کا پیشگی اندازہ کر لیتی ہیں۔ ان کے اندر پیدائشی طور پر ایک نظام ہوتا ہے جس کو موجودہ زمانہ کے سائنداں حیاتیاتی گھڑی (Biological Clock) کہتے ہیں۔ جب بھی کوئی موسمی تبدیلی ہونے والی ہوتی ہے تو چڑیوں اور مچھلیوں کو ان کا پیشگی اندازہ ہو جاتا ہے اور وہ اس سے بچاؤ کا انتظام کر لیتی ہیں۔

نپولین کی فوجیں ۱۸۱۲ء میں روس کی سرحد پر برف باری سے تباہ ہوگئیں۔ یہی حال ہٹلر کی فوجوں کا ہوا جب کہ وہ ۱۹۴۱ میں اسٹالن گراڈ تک پہنچ گئی تھیں مگر شدید برف باری کے نتیجہ میں ہلاک ہو کر رہ گئیں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ نپولین اور ہٹلر کی فوجوں کو روس کی برفباری کا پیشگی اندازہ نہ ہو سکا۔ اور اسی روس میں سائبریا کی چڑیوں کا یہ حال ہے کہ وہ برف کے موسم کا پیشگی اندازہ کر کے وقت سے پہلے سائبریا سے روانہ ہو جاتی ہیں اور لمبی اڑان کے بعد گرم علاقوں (ہندستان، افریقہ وغیرہ) چلی جاتی ہیں۔

کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ یہاں "نپولین" اور "ہٹلر" سے بھی زیادہ بڑا ایک جاننے والا ہے جو اپنے علم محیط کے تحت چڑیوں کو وہ باتیں بتا دیتا ہے جو چڑیاں خود نہیں جان سکتیں۔

۲ نومبر ۱۹۸۴

کمپیوٹر ایک برقی مشین (Electric Device) ہے۔ کمپیوٹر اپنے دائرہ میں اسی کام کو مشینی انداز میں کرتا ہے جس کو انسانی دماغ ذاتی فہم کے تحت کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ کمپیوٹر کی

رفتار بہت زیادہ تیز ہوتی ہے۔ کمپیوٹر کے اندر مختلف معلومات "مشینی زبان" کی صورت میں ذخیرہ کر دی جاتی ہیں۔ ان کو پروگرامنگ لینگویج یا مشین لینگویج کہا جاسکتا ہے۔

کمپیوٹر ان کا تجزیہ کرکے نتیجہ بتا دیتا ہے۔ اس عمل کو پروگرامنگ کہا جاتا ہے۔ جیسے کسی چوکیدار کو بتایا جائے کہ کوئی آدمی آئے، وہ اجنبی ہو اور بے وقت آیا ہو، اس کے پاس ہتھیار ہو، وہ دروازہ کا تالا توڑنے لگے تو سمجھنا کہ وہ ڈاکو ہے اور فوراً الارم بجا دینا۔ اس قسم کی باتوں کو کمپیوٹر کے اندر اعداد یا کوڈ کی صورت میں بھر دیا جاتا ہے۔ کمپیوٹر کے اندر اس قسم کی باتیں کروروں کی تعداد میں بھری جاسکتی ہیں۔ اور وہ سکنڈوں میں ان کا تجزیہ کرکے اس کے نتیجے کو اسکرین پر ظاہر کر دیتا ہے۔

کمپیوٹر کے مشینی دماغ کو وجود میں لانے کے لئے ایک انسانی دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر وہ کون ہے جو انسانی دماغ جیسی پیچیدہ ترمشین کو وجود میں لایا ہے۔

۳ نومبر ۱۹۸۴

امام ابوحنیفہ نے فرمایا تھا کہ میرے قول کے مقابلہ میں جب کوئی حدیث مل جائے تو میرے قول کو دیوار پر مار دو۔ اس کے بعد وہی حدیث میرا قول ہے۔ مگر ہر مصلح بعد کو اپنے پیروؤں کی نظر میں مقدس بن جاتا ہے اور پھر لوگوں کے لئے یہ سوچنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس نے کوئی غلطی بھی کی ہے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ کے پیرو بعد کو اس قدر غلو میں پڑ گئے کہ ایک شاعر نے کہا:

فلعنۃ ربنا اعداد رمل   علی من ردّ قول ابی حنیفۃ

یعنی اس شخص پر ریت کے ذروں کے برابر خدا کی لعنت ہو جو ابوحنیفہ کے قول کا انکار کرے۔

۴ نومبر ۱۹۸۴

قرآن میں دور اول کے مسلمانوں (صحابہ) کو یہ تعلیم دی گئی کہ تم یہود و نصاریٰ سے کہو کہ ہم سب پیغمبروں کو مانتے ہیں، ہم پیغمبروں کے درمیان فرق نہیں کرتے جیسا کہ تم کر رہے ہو (لا نفرق بین احد من رسلہ)

اس آیت کو وقت نزول کی عملی صورت حال میں رکھ کر دیکھئے۔ اس وقت ایک طرف

حضرت مسیح اور حضرت موسیٰ جیسے پیغمبر تھے جن کو عیسائی اور یہودی مان رہے تھے اور مسلمان بھی ان پر ایمان لائے ہوئے تھے۔ دوسری طرف پیغمبر اسلام (محمد بن عبد اللہ) تھے جن کو مسلمانوں نے مانا تھا۔ مگر یہودیوں اور عیسائیوں نے ان کا انکار کر دیا تھا۔

ان دونوں پیغمبروں میں کیا فرق تھا جس کی وجہ سے یہ فرق واقع ہوا۔ وہ یہ تھا کہ مسیح اور موسیٰ ماضی کے پیغمبر تھے اور محمد حال کے پیغمبر۔ مسیح اور موسیٰ کی پیغمبرانہ حیثیت لمبی تاریخ کے ذریعہ مسلّم ہو چکی تھی۔ اس کے برعکس محمد بن عبد اللہ اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں تھے۔ اور ان کے ساتھ وہ اسباب و واقعات جمع نہیں ہوئے تھے جو کسی شخصیت کو مسلّم شخصیت بنا دیتے ہیں

اس فرق کو سامنے رکھ کر مذکورہ آیت: لا نفرق بین احد من رسلہ (ہم پیغمبروں کے درمیان فرق نہیں کرتے)، پر غور کیجئے تو اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوگا کہ اس وقت کے مسلمان یہود و نصاریٰ سے کہہ رہے تھے کہ ——— ہم مسلّمہ پیغمبروں کو بھی مانتے ہیں اور اس پیغمبر کو بھی جس کو ماننے کے لئے جوہر شناسی کی صلاحیت درکار ہے جب کہ تم اول الذکر کو مانتے ہو اور ثانی الذکر کا انکار کر رہے ہو۔

یہود و نصاریٰ پر جب قرآن نے یہ الزام لگایا کہ تم سب پیغمبروں کو نہیں مانتے تو اس کا مطلب صرف گنتی سے نہیں تھا بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ تم اپنے قومی پیغمبروں کو مانتے ہو جو تاریخی طور پر تمہاری قومی روایات کا جزء بن چکے ہیں۔ مگر وہ پیغمبر جس کو پہچاننے کے لئے قومیت اور تاریخی روایات سے اوپر اٹھنا پڑتا ہے اس کو پہچاننے میں تم ناکام ثابت ہوئے ہو۔

۵ نومبر ۱۹۸۴

ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں جب اسلام مکہ سے نکالا جا رہا تھا، عین اسی وقت وہ یثرب (مدینہ) میں اپنی جگہ بنا رہا تھا۔ ۱۳ ویں صدی عیسوی (۱۲۵۸ء) میں مغل قبائل نے بغداد کو تباہ کر کے عباسی سلطنت کو خون میں غرق کر دیا مگر اسی زمانہ میں اسلام جزیرہ ساترا اور جزائر ملایا میں اپنا فاتحانہ سفر (بذریعہ دعوت) شروع کر رہا تھا۔

اسلام کی دعوتی قوت کا یہ حیرت انگیز کرشمہ ہے۔ تاریخ نے بار بار ثابت کیا ہے کہ اسلام کے پاس جب مادی قوت باقی نہ ہو اس وقت بھی دعوت کی ناقابل تسخیر قوت اس کے پاس موجود ہوتی

ہے۔ وہ تلوار کو کھو کر دعوت و تبلیغ کے ذریعہ اپنا سفر شروع کر دیتا ہے ــــــــ یثرب سے لے کر ملیشیا تک کی تاریخ یہی سبق دے رہی ہے۔

۶ نومبر ۱۹۸۴

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اب میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر دیا۔ تو تم دوسروں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو (فلا تخشوھم واخشون) یہ خدا کا اٹل وعدہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب اہل ایمان کے لئے اندیشہ کی چیز کا فر اقوام نہیں ہیں بلکہ صرف ذات خداوندی ہے جس سے مسلمانوں کو اندیشہ کرنا چاہئے۔ اب "خشیت الٰہی" مسلمانوں کی کامیابی کی ضمانت ہے نہ کہ خشیت اغیار۔

اس حقیقت کی روشنی میں دیکھئے تو وہ تمام تحریکیں غیر قرآنی قرار پاتی ہیں جنھوں نے کسی "غیر خدا" کو مسلم مسئلہ کا سبب قرار دے کر اس کے خلاف ہنگامہ آرائی کی۔ تکمیل دین کی مذکورہ آیت سے مسلمانوں نے فخر کی غذا تو لی مگر انھوں نے اس سے سبق کی غذا نہیں لی۔ ایک طرف مسلمان اس آیت کی بنیاد پر یہ کہتے ہیں کہ ہمارا دین دین کامل ہے۔ اور عین اسی وقت وہ دوسری قوموں کو اپنی بربادی کا سبب قرار دے کر ان کے خلاف چیخ پکار کی مہم چلاتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

۷ نومبر ۱۹۸۴

تقریباً بیس برس پہلے کی بات ہے۔ میں ڈاکٹر محمد ایوب (بلریا گنج) کے مطب میں بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک مریض آیا جو ڈاکٹر صاحب کے زیر علاج تھا۔ میں نے دیکھا تو اس کا چہرہ اور اس کا جسم سوکھ کر بھوسہ کی طرح ہو رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کو کوئی عارضہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے اس کا جسم پانی کو قبول نہیں کرتا۔ وہ پانی پینا چاہتا ہے تو پانی اس کے حلق کے نیچے نہیں اترتا۔ اس کی یہ کیفیت عرصہ دراز سے ہے یہاں تک کہ اس کا جسم سوکھ کر ایسا ہو گیا جیسے بھوسہ۔

تربیت کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ تربیت کی افادیت اسی وقت ہے جب کہ زیر تربیت شخص میں اس کی قبولیت کا مادہ ہو۔ تربیت داخل کرنے کا نام نہیں، بلکہ قبول کرنے کا نام ہے۔

تربیت میں ایک شخص لینے والا ہوتا ہے اور ایک شخص دینے والا۔ تربیت کے عمل میں پچاس فی صد اگر دینے والے کا حصہ ہے، تو پچاس فیصد لینے والے کا حصہ۔ تربیت اس شخص کے لئے ہے جو آدھا سفر طے کر چکا ہو۔ جو شخص اپنی جگہ پر کھڑا رہے اس کے لئے کوئی تربیت کارگر نہیں ہو سکتی۔

بدن پانی کو قبول کرے تبھی پانی جسم کے اندر داخل ہو کر صحت و توانائی کا باعث ہوتا ہے اسی طرح آدمی کے اندر اصلاح کو قبول کرنے کا مادہ موجود ہو تبھی یہ ممکن ہوتا ہے کہ اس کو نصیحت کی جائے اور وہ اس کو قبول کر کے اس کو اپنی اصلاح کا ذریعہ بنالے۔

۸ نومبر ۱۹۸۴

ڈاکٹر حمید اللہ ندوی بھوپالی اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: آج ٹی ٹی نگر والے نوریاں صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے ایک صاحب کے بارے میں ایک جملہ کہا جو مجھ کو بہت اچھا لگا۔ انھوں نے کہا:

ہمارے ساتھ وہ آئے جو گھر کو آگ لگائے ....“

اسی حقیقت کو کبیر داس نے ان الفاظ میں کہا ہے:

کبرا کھڑا ابجار میں لئے لوا ٹھا ہاتھ
جو گھر جارے آپنا چلے ہمارے ساتھ

یہ ایک حقیقت ہے کہ اپنی ذات کی قربانی ہی پر قوم کی تعمیر ہوتی ہے۔ دنیا کے مفاد کو خطرہ میں ڈالنے کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی کے لئے آخرت کے مفادات محفوظ ہو جائیں۔

۹ نومبر ۱۹۸۴

غلطی کرنا غلطی نہیں، غلطی کو نہ ماننا غلطی ہے۔ اچھا کام کرنا اچھا نہیں۔ اچھا یہ ہے کہ آپ اچھا کام کریں اور پھر بھی یہ سمجھیں کہ آپ نے کچھ نہیں کیا۔

۱۰ نومبر ۱۹۸۴

آج یہ حال ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے بارہ میں غیر جانبدار بنے رہتے ہیں۔ کوئی شخص خالص حق و انصاف کی خاطر کسی کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

کوئی آدمی کسی کا ساتھ دینے کے لئے اگر کھڑا ہوتا ہے تو صرف وہاں کھڑا ہوتا ہے جہاں ایسا کرنے

سے اس کی قیادت چمکتی ہو۔ جہاں دوسرے کا ساتھ دینے میں خود اپنا کوئی مفاد وابستہ ہو۔ جہاں آدمی کی قومی حمیت بھڑک اٹھی ہو اور قومی جذبہ کے تحت وہ کسی معاملہ میں کود پڑے۔ کسی شخص کی حقیقی مدد کے لئے کوئی متحرک نہیں ہوتا۔

لوگ احتساب عالم کے نعرے لگاتے ہیں۔ مگر احتساب فرد ان کی فہرست سے خارج ہے۔ اس قسم کا احتساب صرف لفظوں سے کھیلنا ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں خدائی حکم پر عمل کرنا۔

۱۱ نومبر ۱۹۸۴

قرآن میں پیغمبر اور اصحاب پیغمبر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے: ان یمسسکم قرح فقد مس القوم قرح مثلہ (اگر تم لوگوں کو زخم لگا ہے تو دوسرے لوگوں کو بھی ایسا ہی زخم لگا ہے)

یہ دنیا مسائل و مشکلات کی دنیا ہے۔ یہاں نیک لوگوں کو بھی مسائل پیش آتے ہیں، وہ بھی مشکلات میں پھنستے ہیں۔ اسی طرح اس دنیا میں برے لوگوں کو بھی مسائل پیش آتے ہیں اور وہ بھی مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔ مگر دونوں فریقوں میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ فریق اوّل کے مسائل جن اسباب سے پیدا ہوتے ہیں وہ اس سے بالکل مختلف ہوتے ہیں جو فریق ثانی کے لئے مسائل پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔

فریق اول کے مسائل اس کی اصول پسندی، اظہار حق اور غیر مصالحانہ رویہ کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس فریق ثانی کے مسائل پیدا کرنے کا سبب ہوتا ہے ــــــ حسد، کبر، خود غرضی، سرکشی، عدم اعتراف۔ اول الذکر کا سرچشمہ خدا کا خوف ہوتا ہے اور ثانی الذکر کا سرچشمہ خدا سے بے خوفی۔

۱۲ نومبر ۱۹۸۴

سورہ عنکبوت، ہجرت حبشہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی۔ اس میں کہا گیا کہ میری زمین وسیع ہے اس لئے تم میری عبادت کے لئے کوئی دوسرا گوشہ تلاش کر لو (۵۶-۶۰) اس کے مخاطب مکہ کے اہل ایمان تھے۔ ان سے کہا گیا کہ مکہ کے لوگ اگر تم کو ستاتے ہیں تو تم مکہ کو چھوڑ کر دوسرے علاقہ میں چلے جاؤ اور وہاں اللہ کی عبادت گزاری کرو۔ اس کے مطابق مکہ کے مسلمانوں کی ایک

جماعت مکہ کو چھوڑ کر حبش کے شہر اکسوم (Axum) چلی گئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ صبر اور توکل کا مطلب عبادت پر جمنا ہے نہ کہ دشمن سے ٹکراؤ پر جمنا۔ اگر مطلوب یہ ہو کہ ہر حال میں دشمن سے مقابلہ جاری رکھا جائے تو ان حالات میں مکہ کے مسلمانوں سے کہا جاتا کہ تم لوگ مخالفین سے لڑتے رہو، اور کسی حال میں وہاں سے نہ ہٹو۔

اگر اعلیٰ ایمان یہ ہوتا کہ جب دشمن سے مقابلہ پیش آئے تو ہر حال میں لوگ مقابلہ پر جمے رہیں تو ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ دونوں فرار بن کر رہ جاتے ہیں نہ کہ کوئی اعلیٰ دینی عمل۔

۱۳ نومبر ۱۹۸۴

خوش نامی اور بد نامی کی حقیقت ایک لفظ میں یہ ہے —— بے اصول آدمی سے ہر ایک خوش رہتا ہے، اور بااصول آدمی سے ہر ایک ناخوش۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جو شخص بھی وائس چانسلر ہو کر جاتا ہے وہ تھوڑے دنوں کے بعد بدنام ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جب بھی کوئی اصلاح کرنا چاہتا ہے تو وہ تمام لوگ چیخ پڑتے ہیں جن پر اس کی زد پڑ رہی ہوتی ہے۔ وہ فوراً "اسلام خطرہ میں" کا جھنڈا لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی ذاتی شکایت کو ملی مسئلہ بنا کر وائس چانسلر کو بدنام کرنے اور اس کو اکھاڑنے کی مہم جاری کر دیتے ہیں۔

اس میں غالباً صرف ایک استثناء ہے اور وہ پروفیسر خسرو کا ہے۔ ان کا اصول غالباً یہ تھا کہ ادارہ کو اس کے حال پر چھوڑ دو اور اپنا ٹرم پورا کرو۔ ان کے طریق کار کے بارہ میں ایک لطیفہ مشہور ہے۔ طلبہ کا ایک وفد ان سے ملاقات کے لئے آیا اور اپنے کچھ مطالبے پیش کئے۔ پروفیسر خسرو نے طلبہ سے اتفاق کیا۔ اور کہا کہ آپ لوگ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہ لوگ خوش ہو کر چلے گئے۔ اس کے بعد ان کا مخالف گروپ آیا اور اس نے بالکل متضاد مطالبہ پیش کیا۔ پروفیسر خسرو نے ان سے بھی اتفاق کیا اور کہا کہ آپ لوگ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔

پروفیسر خسرو کی بیگم یہ دونوں باتیں سن رہی تھیں۔ جب دوسرا گروپ بھی چلا گیا تو انھوں نے پروفیسر خسرو سے کہا کہ آپ نے پہلے وفد کو بھی ٹھیک کہا اور دوسرے وفد کو بھی، حالانکہ دونوں کے مطالبات بالکل ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ پروفیسر خسرو نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا:

بیگم، آپ بھی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔

پروفیسر خسرو کا یہ لطیفہ علی گڑھ کے ایک صاحب نے مجھے بتایا۔

۱۴ نومبر ۱۹۸۴

علامہ اقبال (۱۹۳۸ - ۱۸۷۷) نے جب اپنی زندگی شروع کی تو وہ مسلمانوں کے بارہ میں بہت اعلیٰ امیدیں رکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی "بانگ درا" اس سوئے ہوئے شیر کو جگا دے گی۔ اور وہ اٹھ کر سارے زمین و آسمان کو بدل ڈالے گا۔ اپنے ابتدائی زمانہ میں انھوں نے کہا:

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے   ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

حالات نے اقبال کا ساتھ دیا اور اپنی زندگی ہی میں اقبال کو غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اقبال کے اشعار پوری ملت کی زبان پر نغمۂ ملت بن کر گونجنے لگے۔ مگر عملی اعتبار سے نتیجہ بالکل صفر رہا۔ مثلاً اقبال نے لاہور میں "تبلیغی کالج" قائم کیا۔ اس میں طلبہ کو ایسا نصاب پڑھایا جاتا تھا کہ اس سے فارغ ہو کر وہ داعی اور مبلغ بن سکیں۔ اقبال نے خیال کیا تھا کہ تبلیغی کالج کے فارغ شدہ طلبہ کو مسلم ادارے اپنے یہاں معقول مشاہرہ پر رکھ لیں گے اور وہ مسلم اداروں کی کفالت پر ملک میں تبلیغ و دعوت کا کام انجام دیں گے۔ مگر جب تبلیغی کالج سے فارغ شدہ لوگ نکلے تو کوئی ادارہ ان کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ چنانچہ پہلے بیچ کے بعد اس میں داخلے بند ہو گئے اور کالج ٹوٹ گیا۔

اس طرح کے بہت سے ناکام تجربے ہوئے۔ جس کے نتیجہ میں اقبال کی امیدیں مایوسی میں تبدیل ہو گئیں۔ جس اقبال نے ابتداءً مذکورہ بالا شعر کہا تھا، اس نے اپنی آخری عمر میں یہ اعتراف کیا:

تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں   ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

یہی واقعہ موجودہ زمانہ کے اکثر مصلحین اور رہنماؤں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اب ایک زوال یافتہ قوم ہو چکے ہیں۔ ان کے اندر وہ اعلیٰ صفات مرچکی ہیں جو جوہر انسانیت ہیں۔ اس لئے اب اسلام کے احیاء کی واحد صورت یہ ہے کہ غیر مسلموں میں بڑے پیمانہ پر دعوتی کام کیا جائے۔ اب غیر قوموں ہی سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ ان کے اندر سے

ایسے جاندار لوگ نکلیں جو موجودہ زمانہ میں اسلام کے حامل بن سکیں۔

۱۵ نومبر ۱۹۸۴

فرینک لائڈ رائٹ کا قول ہے کہ تعمیر میں واحد غلط چیز اس کے معمار ہیں:

The only thing wrong with architecture is architects.
Frank Lloyd Wright

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی تعمیر کا اچھا یا برا ہونا اس کے معماروں پر منحصر ہے۔ معمار اگر اچھے ہیں تو تعمیر اچھی ہوگی، معمار اگر برے ہیں تو تعمیر بھی اسی نسبت سے بری ہو جائے گی۔

یہی حال قوم کا بھی ہے۔ قوم اگر عمارت ہے تو اس کے لیڈر اس کے معمار ہیں۔ وہ قوم خوش قسمت ہے جس کو سنجیدہ اور دانش مند لیڈر مل جائیں۔ ایسے لوگ قوم کو آگے کی طرف لے جائیں گے۔ اور جس قوم کے لیڈر سطحی، نادان اور غیر سنجیدہ ہوں وہ قوم کو بربادی کے گڑھے میں گرانے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتے۔

۱۶ نومبر ۱۹۸۴

موجودہ زمانہ میں جب مغرب کی قومیں ابھریں اور دنیا پر چھا گئیں تو مسلمانوں میں اس کے جواب میں دو قسم کا ذہن ابھرا۔ ایک، خالص تقلید کا ذہن۔ ہندستان کے ایک شاعر (حالی) نے کہا:

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں

یہی بات مشہور عرب شاعر حافظ بک ابراہیم نے ان لفظوں میں کہی:

لیتنا نقتدی بکم او نجاریکم   علی نسترد ما کان ضاعا

(اے اہل مغرب) کاش ہم تمہاری پیروی کرتے یا تم سے قریب ہوتے تو ممکن تھا کہ ہم وہ چیز دوبارہ حاصل کر لیں جس کو ہم نے کھو دیا ہے۔

دوسرا ذہن ردعمل کا ذہن تھا۔ مغربی قوموں نے چونکہ مسلمانوں سے ان کی عظمت چھینی تھی اس لئے یہ لوگ مغرب کے خلاف بگڑ کر ان سے لڑنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔

یہ دونوں ذہن غلط تھا۔ کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ خود مسلمانوں کو دوبارہ زندہ اور مستحکم بنایا

جائے۔ مگر دور جدید میں اس قسم کے مصلحین اتنے کم ہیں کہ وہ کسی شمار میں نہیں آتے۔

۱۷ نومبر ۱۹۸۴

"شنکر بھگوان کی مورتی لے لو، شنکر بھگوان کی مورتی" ایک شخص آواز لگاتا ہوا سڑک سے گزرا۔ میں نے سوچا: وہ لوگ بھی کیسے عجیب ہیں جو بھگوان کو ایسی چیز سمجھتے ہیں جس کو بیچا اور خریدا جائے۔ آسمان کے نیچے شاید اس سے زیادہ عجیب واقعہ اور کوئی نہیں۔

۱۸ نومبر ۱۹۸۴

قدیم عرب میں ایک یہودی قبیلہ تھا جس کا نام بنو قریظہ تھا۔ اس قبیلہ کا عالم اور سردار حی بن اخطب تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر قیادت مسلمانوں نے بنو قریظہ کا محاصرہ کیا تو وہ قلعہ بند ہو گئے۔ حی بن اخطب نے قلعہ کے اندر یہودیوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

ہم اس آدمی کی اتباع کریں اور اس کی تصدیق کریں۔ کیونکہ خدا کی قسم تم پر واضح ہو گیا ہے کہ وہ یقیناً خدا کے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔ ان کو تم اپنی کتابوں میں لکھا ہوا پاتے ہو۔ اگر تم ایسا کرو تو تم اپنے خون کو اور اپنے اموال کو بچا لو گے (نتابع ھذا الرجل و نصدقہ۔ فو اللہ لقد تبین لکم انہ لنبی مرسل۔ وانہ للذی تجدونہ فی کتابکم، فتامنون علیٰ دمائکم واموالکم، الرسول، صفحہ ۱۹۸)

یہودیوں (بنو قریظہ) نے حی بن اخطب کی بات نہ مانی۔ مگر اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ خود حی بن اخطب بھی اس کے باوجود یہودیوں سے الگ نہیں ہوا۔ وہ ان کے ساتھ شامل رہا۔ یہاں تک کہ دوسرے یہودیوں کے ساتھ وہ بھی قتل کر دیا گیا۔

حی بن اخطب کو معلوم تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچے رسول ہیں۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس وقت میں زندگی اور موت کے کنارے ہوں۔ اگر میں آپ کی پیغمبری کا اقرار کر لوں تو میں اپنی جان بچا لوں گا۔ پھر بھی اس نے اقرار نہیں کیا۔ وہ قوم کے ساتھ آخر وقت تک وابستہ رہا۔ قومی عصبیت بھی کیسی عجیب چیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سچائی کو ماننے میں سب سے بڑی رکاوٹ قومی اور گروہی عصبیت رہی ہے، قدیم زمانہ میں بھی اور آج بھی۔

۱۹ نومبر ۱۹۸۴

جان لاک (۱۷۰۴-۱۶۳۲) نے کہا ہے کہ چیزیں صرف خوشی یا غم کی نسبت سے اچھی یا بری ہوتی ہیں:

Things are good or evil only in relation to pleasure or pain.

اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی میں یہ بحث ہوئی کہ پین (pain) اور پلیزر (Pleasure) کا صحیح اردو ترجمہ کیا ہے۔ جب دونوں میں اتفاق رائے نہ ہوسکا تو مولانا دریابادی نے بگڑ کر کہا: آپ کس مشرقی یا مغربی درس گاہ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ مولانا آزاد نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا:

میں رب المشرقین والمغربین کی درس گاہ کا تعلیم یافتہ ہوں۔

سرسید احمد خاں نے اپنے بارہ میں کہا تھا: من شاگرد مکتب قرآنم (میں قرآن کے مدرسہ کا طالب علم ہوں)۔

اسی طرح مختلف لوگوں نے اپنے علم اور اپنی تعلیم کے بارہ میں مختلف حوالے دئے ہیں۔ مگر میرے نزدیک یہ تمام جوابات ناکافی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کچھ علوم وہ ہیں جو درد کی درس گاہ میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اور جب تک آدمی درد کی درس گاہ کا تعلیم یافتہ نہ ہو، بقیہ علوم بھی اس کے لئے زیادہ مفید نہیں بن سکتے۔

۲۰ نومبر ۱۹۸۴

فرانسس بیکن (Francis Bacon) کا قول ہے ـــــــــ حسد کبھی تعطیل کا دن نہیں مناتی:

Envy never makes holiday.

مطلب یہ ہے کہ حسد ایک ایسی چیز ہے کہ جو شخص اس میں گرفتار ہوجائے وہ برابر اسی میں پڑا رہتا ہے۔ وہ ہر وقت حسد کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ کسی لمحہ اس کو قرار نہیں آتا۔ کتنی بری چیز ہے حسد، مگر کتنے زیادہ لوگ اس میں مبتلا رہتے ہیں۔ شاید دنیا میں سب سے زیادہ جو بیماری پائی جاتی ہے وہ حسد ہی ہے۔

۲۱ نومبر ۱۹۸۴

حضرت عثمان بن عفان اسلام کے تیسرے خلیفہ ہیں۔ جب وہ خلیفہ ہوئے تو مدینہ کی مسجد میں لوگوں کے سامنے تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ مگر غالباً انھیں تقریر و خطابت کی زیادہ مشق نہ تھی یا کسی اور وجہ سے وہ چند ابتدائی کلمات بولنے کے بعد لمبی تقریر نہ کر سکے۔ چنانچہ انھوں نے حسب ذیل کلمات کہے اور بیٹھ گئے:

تم کو بولنے والے خلیفہ سے زیادہ کرنے والے خلیفہ کی ضرورت ہے

یہی بات عام انسان کے لئے بھی صحیح ہے۔ ہر انسان، خواہ وہ حکمراں ہو یا غیر حکمراں، اس کی قیمت عمل کے اعتبار سے متعین ہوتی ہے نہ کہ قول کے اعتبار سے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ کوئی حقیقی کام کرے۔ الفاظ تو بے دماغ ریکارڈ بھی دہرا سکتے ہیں۔

۲۲ نومبر ۱۹۸۴

استانبول (ترکی) کا قدیم نام قسطنطنیہ (Constantinople) ہے۔ اس کا یہ نام قدیم رومی حکمراں (قسطنطین) کے نام پر تھا۔ مسلمانوں نے اپنے دور میں اس کا نام بدل کر استانبول رکھ دیا۔

استانبول میں ۴۵۰ مسجدیں ہیں۔ ان میں سے ایک مسجد ایا صوفیا (Hagia Sofia) ہے۔ ایا صوفیا کے معنی ہیں حکمت خداوندی۔ یہ عظیم عمارت ۶۳۲ء میں عیسائیوں نے چرچ کے طور پر بنائی تھی۔ سلطان محمد فاتح نے ۱۴۵۳ء میں استانبول کو فتح کیا تو سلطان نے اس کے اندر جمعہ کی نماز پڑھی اور حکم دیا کہ اس کو بدل کر مسجد کی صورت دے دی جائے۔ اس وقت سے یہ عمارت مسجد کے طور پر استعمال ہونے لگی۔

اس کے بعد ترکی میں مصطفیٰ کمال اتاترک کی حکومت آئی۔ وہ سیکولر آدمی تھے۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۳۴ میں ایک نیا حکم نافذ کیا۔ اس کے تحت ایا صوفیا کو دوبارہ میوزیم قرار دے دیا گیا۔ فروری ۱۹۳۵ میں میوزیم کے طور پر اس کے دروازے کھولے گئے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے بیان کے مطابق استانبول میں ۲۵ قدیم گرجے ہیں جو مسجد میں تبدیل کر دئے گئے ہیں۔ ایا صوفیا کی عمارت چونکہ بہت بڑی اور تاریخی تھی، اس لئے اس کی زیادہ شہرت ہوئی۔

اتا ترک نے اگرچہ ترکی میں اقتدار پانے کے بعد بے شمار حماقتیں کیں۔ مگر ایا صوفیا کے بارہ میں اس کا حکم میرے نزدیک درست تھا۔ دوسروں کے عبادت خانہ کو مسجد میں تبدیل کرنا صرف اس وقت درست ہے جب کہ اس کو خرید لیا جائے یا ان سے اس کی اجازت لی جائے۔ اس کے بعد دوسری صورت یہ ہے کہ اس کی عمارت کو کسی پبلک مقصد کے لئے استعمال کیا جائے، جیسا کہ اتا ترک نے کیا۔

۲۳ نومبر ۱۹۸۴

ہنری پرین (Henri Pirenne) مشہور مغربی مورخ ہے۔ وہ ۱۸۶۲ میں بلجیم میں پیدا ہوا اور ۱۹۳۵ میں وفات پائی۔ جرمنی نے بلجیم پر قبضہ کیا تو وہاں وہ تاریخ کا پروفیسر تھا۔ اس نے جرمن نقطہ نظر سے تاریخ پڑھانے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ جرمنوں نے اس کو جیل میں ڈال دیا۔ وہ ۱۹۱۶ سے ۱۹۱۸ تک جیل میں رہا۔ جیل خانہ میں اس کو مطالعہ کے لئے کتابیں حاصل نہ تھیں۔ اس نے محض یادداشت سے ایک کتاب تاریخ یورپ (History of Europe) لکھی۔ یہ کتاب اصلاً جرمن زبان میں تھی، پھر اس کا انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ اب وہ یورپ میں داخل نصاب ہے۔

کتاب کے دیباچہ میں مصنف نے معذرت خواہانہ انداز میں لکھا ہے کہ حوالہ کی کتابیں نہ ہونے کی وجہ سے میں اپنی یہ کتاب محض یادداشت سے لکھ رہا ہوں۔ تاریخ کے موضوع پر یادداشت سے لکھنے کا طریقہ صحیح نہیں۔ مگر جیل خانہ کی زندگی میں میرے لئے اس کے سوا کوئی دوسری صورت بھی نہیں ——— اصل چیز وقت کو مارنا ہے اور وقت کو یہ موقع نہیں دینا ہے کہ وہ خود آدمی کو مار ڈالے:

The essential thing is to kill time and not allow oneself to be killed by it (p. 21).

۲۴ نومبر ۱۹۸۴

شیخ سعدی نے گلستاں میں ایک کہانی کے تحت یہ شعر لکھا ہے:

نہ بینی کہ چوں گربہ عاجز شود   بر آرد بچنگال چشم پلنگ

(تم نہیں دیکھتے کہ بلی جب عاجز ہو جاتی ہے تو وہ چنگل مار کر شیر کی آنکھ نکال لیتی ہے) شیخ سعدی کا یہ سادہ سا شعر اس عظیم حقیقت کو بتا رہا ہے کہ آدمی کو جب کسی چیلنج کا سامنا پیش آتا ہے تو اس کے اندر

کی سوئی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اس کے بعد وہ ایسے بڑے بڑے کام کر گزرتا ہے جس کو وہ معتدل حالات میں نہیں کر سکتا تھا۔

۲۵ نومبر ۱۹۸۴

ابو داؤد کی ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں: فلما خرج قمنا الیہ (پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے تو ہم کھڑے ہو گئے) محفل میلاد میں قیام کرنے والے لوگ اس حدیث سے قیام کی دلیل پیش کرتے ہیں۔ مگر اس حدیث میں جو بات ہے وہ یہ کہ صحابہ نے جب رسول اللہ کو دیکھا تو وہ کھڑے ہو گئے۔ گویا دیکھ کر اٹھے نہ کہ بغیر دیکھے اٹھے۔ رسول اللہ کی غیر موجودگی میں صحابہ کے درمیان اکثر رسول اللہ کا ذکر کیا جاتا تھا۔ مگر ایسی کوئی روایت نہیں کہ جب رسول اللہ کا نام لیا گیا تو ہم سب لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ مذکورہ حدیث سے محفل میلاد کے قیام کے حق میں استدلال کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ کیوں کہ یہ حدیث آپ کو دیکھ کر اٹھنے کے بارہ میں ہے نہ کہ دیکھے بغیر اٹھنے کے بارہ میں۔

اسی طرح ایک روایت ہے کہ بنو قریظہ جب حضرت سعد بن معاذ کو حکم بنانے پر راضی ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن معاذ کو بلایا۔ وہ سفید گدھے پر بیٹھ کر آئے۔ اس وقت وہ سخت زخمی تھے۔ رسول اللہ نے حاضرین سے فرمایا کہ اپنے سردار کو (اتارنے کے لئے) اٹھ جاؤ (قوموا الی سیدکم) اس روایت سے بھی محفل میلاد کے قیام پر استدلال کیا جاتا ہے۔ مگر یہاں قیام تعظیمی کا حکم نہیں۔ رسول اللہ کی مراد اس قول سے صرف یہ تھی کہ اپنے (زخمی) سردار کو سواری سے اتارنے کے لئے اٹھو۔ واضح ہو کہ حدیث میں قوموا الی سیدکم کا لفظ ہے قوموا لسیدکم کا لفظ نہیں ہے۔

ہر بدعت اسی قسم کے ناقص استدلال پر قائم ہوتی ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ کے سیاسی بتدعین (سید ابو الاعلیٰ مودودی وغیرہ) کا نظریہ بھی اسی قسم کے ناقص استدلال پر قائم ہے۔ دونوں ہی کے اوپر یہ مثل صادق آتی ہے:

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔

اس سیاسی بدعت کو میں نے تفصیل کے ساتھ "تعبیر کی غلطی" میں بیان کیا ہے۔

۲۶ نومبر ۱۹۸۴

ایک صاحب نے الرسالہ کے انداز پر سخت ردعمل کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ میں ہمیشہ مسلمانوں ہی کو مطعون کیا جاتا ہے۔ ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات میں آپ کے نزدیک ہمیشہ مسلمان ہی قصوروار ٹھہرتے ہیں۔ وغیرہ۔

میں نے کہا کہ گائے کی خوراک گھاس ہے اور شیر کی خوراک گوشت۔ آپ شیر کو گھاس نہیں کھلا سکتے۔ اور اگر آپ گائے کے منھ میں گوشت ڈالیں تو وہ اگل دے گی۔ یہی معاملہ انسانوں کا ہے۔ انسانوں میں بھی مختلف قسم کے لوگ ہیں اور الرسالہ بہرحال ہر ایک کی غذا نہیں بن سکتا۔

وہ لوگ جو ذاتی فخر میں جیتے ہوں، جن کی روح کو اس سے تسکین ملتی ہو کہ وہ ہمیشہ دوسروں کو ملزم ٹھہراتے رہیں، جو اپنی غلطی کی قیمت دوسروں سے وصول کرنا چاہتے ہوں، جو خیالی الفاظ میں جیتے ہوں اور جن کو حقائق سے کوئی دلچسپی نہ ہو، ایسے لوگ الرسالہ کی باتوں میں اپنی غذا نہیں پا سکتے۔

الرسالہ صرف سنجیدہ اور حقیقت پسند لوگوں کی غذا ہے۔ اور ہمیں اس پر کوئی شرمندگی نہیں اگر غیر سنجیدہ اور غیر حقیقت پسند لوگ الرسالہ میں اپنی غذا نہ پائیں۔

۲۷ نومبر ۱۹۸۴

ٹامس فلر (Thomas Fuller) کا قول ہے:

Courage should have eyes as well as arms.

ہمت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس آنکھیں ہوں اور اسی کے ساتھ بازو بھی۔

ہمت یہ نہیں ہے کہ آدمی پرجوش طور پر خطرات میں کود پڑے اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہلاک کرلے۔ اس قسم کی ہمت اور حوصلہ نادانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہمت اور حوصلہ کے ساتھ آدمی کے اندر بصیرت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ وہ حالات کو گہرائی کے ساتھ دیکھے۔ وہ آغاز و انجام کا پوری طرح جائزہ لے، اس کے بعد منصوبہ بند طور پر اقدام کرے۔ حوصلہ مندانہ عمل باہوش عمل کا نام ہے نہ کہ بے ہوشی کے ساتھ اپنے آپ کو خندق میں گرا لینے کا۔

سوچے بغیر اقدام کرنا ایسا ہی ہے جیسے دیکھے بغیر چلنا۔

۲۸ نومبر ۱۹۸۴

مسلم حکمراں سے لڑنا اسلام میں سراسر ممنوع ہے۔ اسلام کی پوری تاریخ میں خوارج کے سوا کسی اور نے یہ فعل نہیں کیا۔ علماء امت کا اس پر کامل اتفاق ہے۔ حتیٰ کہ اس واقعہ کو وہ لوگ بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں جنھوں نے موجودہ زمانہ میں خوارج کے طریقہ پر عمل کیا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں :

"جمہور فقہاء اور اہل الحدیث کی رائے یہ ہے کہ جس امیر کی امارت ایک دفعہ قائم ہو چکی ہو اور مملکت کا امن و امان اور نظم و نسق اس کے انتظام میں چل رہا ہو۔ وہ خواہ عادل ہو یا ظالم، اور اس کی امارت خواہ کسی طور پر قائم ہوئی ہو، اس کے خلاف خروج کرنا حرام ہے۔ الا یہ کہ وہ کفر صریح کا ارتکاب کرے۔ امام سرخسی لکھتے ہیں کہ جب مسلمان ایک فرماں روا پر مجتمع ہوں اور اس کی بدولت ان کو امن حاصل ہو اور راستے محفوظ ہوں، ایسی حالت میں اگر مسلمانوں کا کوئی گروہ اس کے خلاف خروج کرے تو جو شخص بھی جنگ کی طاقت رکھتا ہو اس پر واجب ہے کہ مسلمانوں کے اس فرماں روا کے ساتھ مل کر خروج کرنے والوں کے خلاف جنگ کرے۔ (المبسوط، باب الخوارج) امام نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ ائمہ، یعنی مسلمان فرماں رواؤں کے خلاف خروج اور قتال حرام ہے، خواہ وہ فاسق اور ظالم ہی کیوں نہ ہو۔ اس پر امام نووی اجماع کا دعویٰ کرتے ہیں۔"

تفہیم القرآن، حصہ پنجم، صفحہ ۸۰ ـ ۷۹۔ الحجرات، تحت آیت ۹

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس واضح اعتراف کے بعد کچھ غیر متعلق بحثیں چھیڑ کر غلط طور پر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ مسلم حکمراں کے خلاف بغاوت جائز ہے۔ مگر اس کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ اپنے آپ کو دین کے مطابق ڈھالنے کے بجائے خود دین کو اپنے مطابق ڈھالا جائے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی پاکستان منتقل ہونے کے بعد اسی غیر اسلامی فعل میں مشغول تھے۔ وہ لیاقت علی، ایوب خاں، بھٹو، کی قائم شدہ حکومتوں کو اکھاڑنے میں لگے رہے۔ اپنی اس غیر اسلامی روش کو جائز ثابت کرنے کے لئے انھوں نے دین میں وہ چیز ثابت کرنے کی کوشش کی جو حقیقۃً دین میں موجود نہ تھی۔

مذکورہ عبارت میں یہ بات بہت عجیب کہ جمہور کے اتفاق رائے کو تسلیم کرنے کے باوجود کہا گیا ہے کہ اس معاملہ میں علماء کے درمیان سخت اختلاف رائے ہے۔

۲۹ نومبر ۱۹۸۴

An expert is one who knows more and more about less and less.

Nicholas Murray Butler

"ماہر وہ ہے جو کم سے کم کے بارہ میں زیادہ سے زیادہ جانے" یہ قول نہایت صحیح ہے۔
موجودہ زمانہ میں جب علم کے ذرائع بڑھے اور انسان نے چیزوں کے بارہ میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہا تو معلوم ہوا کہ اگرچہ ذرائع علم بڑھ رہے ہیں، مگر انسان کی استعداد اتنی محدود ہے کہ ایک شخص تمام معلومات کو اپنے ذہن میں جمع نہیں کر سکتا۔

ذرائع علم کی وسعت اور انسانی استعداد کی محدودیت کے اسی تضاد نے موجودہ زمانہ میں تخصیص (specialization) کا طریقہ پیدا کیا۔ علوم شعبوں میں تقسیم کئے گئے اور پھر شعبے بھی مزید ذیلی شاخوں میں تقسیم ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ عملی طور پر اس کے سوا کچھ اور ممکن نہ رہا کہ ایک شخص اگر زیادہ معلومات چاہتا ہے تو وہ ایک بے حد جزئی دائرہ پر قناعت کرے۔

"کم سے کم کے بارہ میں زیادہ سے زیادہ جاننا" بعض محدود ٹکنکل مقاصد کے لئے تو مفید ہے۔ مگر وہ زندگی کے وسیع تر مسئلے کو سمجھنے کے لئے سراسر ناکافی ہے۔ کیوں کہ زندگی کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے کلی علم درکار ہے نہ کہ محض جزئی علم۔ مزید یہ کہ کلی علم ایک ذہن میں جمع ہونا چاہئے۔ بہت سے ذہنوں کی جزئی مہارت اس "کلی عالم" کو تشکیل نہیں دے سکتی جو مسئلہ حیات کی وضاحت کے لئے درکار ہے۔

۳۰ نومبر ۱۹۸۴

مسٹر فورڈ کی صدارت کے زمانہ میں ان کی اہلیہ، امریکہ کی فرسٹ لیڈی، بیٹی فورڈ (Betty Ford) نے اگست ۱۹۷۵ میں ایک ٹیلیویژن انٹرویو میں یہ کہہ دیا:

She would not be surprised if her 18-year old daughter Susan came to her and said she was having an affair.

Mc Call magazine, September 1975

بحوالہ انڈین ایکسپریس (بمبئی) ۲۳ اگست ۱۹۷۵

مجھے تعجب نہ ہوگا اگر میری ۱۸ سالہ لڑکی سوزان میرے پاس آئے اور مجھ سے کہے کہ میرا کسی سے تعلق

ہوگیا ہے۔

صدر امریکہ جیرالڈ فورڈ کی بیوی نے مزید کہا کہ مجھے یقین نہیں کہ موجودہ نسل زندگی کے معاملات میں اتنی دانش مند ہو سکتی ہے جیسا کہ ہم لوگ تھے۔

مسز فورڈ نے یہ بات صدر فورڈ کے علم اور مشورہ کے بغیر کہہ دی تھی۔ جب صدر فورڈ نے اخبار میں اس کو پڑھا تو انھوں نے کہا کہ میں نے ۲۰ ملین (عورتوں) کے ووٹ کھو دئے۔

I'd lost 20 million votes. It will cost me 20 million votes.

جمہوری دور کے لیڈر کو اس سے دل چسپی نہیں کہ حق کیا ہے، وہ صرف یہ جانتا ہے کہ عوام کیا چاہتے ہیں۔

یکم دسمبر ۱۹۸۴

فرینک فرٹ یونیورسٹی کے ماہر نفسیات ڈاکٹر جان اوکرٹ (Dr John Ockert) نے ایک جائزہ میں بتایا کہ زیادہ خوبصورت لڑکیاں عام طور پر زندگی میں ناکام رہتی ہیں:

Georgeous women feel beauty is the only asset and they cannot bear the ageing. Marilyn Monroe, one of the prettiest women to emerge from Hollywood, is stated to have wept bitterly when she saw first traces of wrinkles in the mirror.
Indian Express (Bombay) 23 August 1975

دلکش عورتیں سمجھتی ہیں کہ خوبصورتی ان کا واحد سرمایہ ہے اور بڑھاپے کو وہ برداشت نہیں کر سکتیں۔ میرلین مانرو جو ہالی وڈ کی ایک انتہائی خوبصورت عورت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اس وقت بری طرح رونے لگی جب اس نے آئینہ میں پہلی بار اپنے چہرے پر جھریوں کے نشانات دیکھے۔

جس آدمی کو پرکشش عورت نہ ملے وہ زیادہ خوش قسمت ہے۔ کیوں کہ غیر پرکشش عورت عملی زندگی میں زیادہ بہتر رفیق ثابت ہوتی ہے۔

۲ دسمبر ۱۹۸۴

شیخ عبد الوہاب شعرانی اپنی کتاب الیواقیت والجواہر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں فتوحات کیہ

(ابن عربی) کے نسخوں میں ملحدین اور زنادقہ نے بہت سی عبارتیں شامل کر دی ہیں۔

پریس کے دور سے پہلے تمام کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ اس زمانہ میں یہ طریقہ بہت عام تھا۔ کوئی شخص علم وفضل میں شہرت حاصل کر لیتا تو لوگ اس کے نام پر اپنی بات چلانے کے لئے یہ کرتے تھے کہ اس کی کتابوں کا قلمی نسخہ تیار کرتے وقت اس کے اندر اپنی بات ملا کر لکھ دیتے۔ نہج البلاغہ میں اسی طرح بہت سے کلام اپنی طرف سے بنا کر لکھ دئے گئے ہیں۔ قدیم دور کی تمام آسمانی کتابوں میں اسی طرح الحاق کیا جاتا رہا ہے۔ پریس کے دور سے قبل کی کوئی بھی قابل ذکر کتاب اس قسم کے الحاقات سے محفوظ نہیں۔

اس کلیہ میں صرف ایک ہی استثناء ہے اور وہ قرآن کا ہے۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ وہ پریس کے دور سے قبل آیا۔ اور اس کے تمام قدیم نسخے ہاتھ سے لکھے گئے۔ اس کے باوجود وہ اس قسم کے الحاق سے مکمل طور پر محفوظ رہا۔

۳ دسمبر ۱۹۸۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی شخصیتوں میں سے ایک ابوطالب ابن عبد المطلب ہیں۔ ان کے متعلق بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ ابوطالب نے کفر کے کلمہ کے ساتھ جان دی۔ مگر سیرت ابن ہشام میں عبد اللہ بن عباس سے روایت ہے کہ جب ابوطالب کی موت کا وقت آیا تو ان کے بھائی حضرت عباس نے دیکھا کہ وہ ہونٹ ہلا رہے ہیں۔ حضرت عباس نے کان لگا کر سنا اور رسول اللہ کو مخاطب کر کے بولے " بھتیجے، خدا کی قسم جو کلمہ تم پڑھوانا چاہتے تھے، میرے بھائی نے اس کو پڑھ دیا۔" آپ نے فرمایا، میں نے نہیں سنا۔

ابوطالب کے کچھ اشعار بھی کتابوں میں نقل ہوئے ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منقبت اور اعتراف واضح طور پر موجود ہے۔ ابن ہشام نے خبر الصحیفہ کے ضمن میں ان کا ایک قصیدہ درج کیا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے:

الم تعلموا انا وجدنا محمدا　　نبیا کموسیٰ خطّ فی اول الکتب

تاہم بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ قصیدے الحاقی ہیں۔ واللہ اعلم۔ ابوطالب نے اگرچہ اپنے اسلام کا اعلان نہیں کیا مگر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پوری طرح ساتھ دیا۔

۴ دسمبر ۱۹۸۴

کسی کے بینک اکاؤنٹ میں ایک ہزار روپیہ ہو اور وہ پچاس ہزار روپیہ کا چک لکھ دے تو ایسے چک کی بینک کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔ بینک اس کے بدلہ میں رقم ادا کرنے کے بجائے اس کو ایک بے قیمت پرزے کی طرح صاحب اکاؤنٹ کو واپس کردے گا۔

یہی معاملہ آخرت کا بھی ہے۔ ایک شخص کے پاس نفاق کا سرمایہ ہو اور وہ ایمان کا دعویٰ لے کر آخرت میں حاضر ہو تو اس کا "ایمان" اس کے منھ پر مار دیا جائے گا۔ ایسا دعویٰ آخرت میں کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔ اسی طرح مثلاً ایک شخص اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے لئے ایک کام کرتا ہے اور اس کو "اسلامی خدمت" کا عنوان دیتا ہے تو وہ بھی گویا مذکورہ بالا چک کی مانند ہے۔ جس کی کوئی قیمت مدعی کو آخرت میں نہ مل سکے گی۔

۵ دسمبر ۱۹۸۴

کسی کا قول ہے کہ کیا وجہ ہے کہ اکثر لوگ مواقع کو سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مواقع محنت طلب کام کے بھیس میں آتے ہیں:

The reason why many people fail to recognise opportunity
is because it comes disguised as hard work.

یہ اصول فرد اور قوم دونوں کے اوپر صادق آتا ہے۔ کامیابی کا دروازہ کبھی کسی کے لئے بند نہیں ہوتا۔ مگر حقیقی کامیابی کسی کو پرمشقت عمل کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ لوگ اکثر سطحی اور بے نتیجہ کاموں کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سطحی اور بے نتیجہ کام آدمی سے محنت اور جدوجہد نہیں مانگتے۔ جب کہ گہرا اور نتیجہ خیز کام سخت محنت اور طویل جدوجہد کا طالب ہوتا ہے۔

اکثر لوگ بڑے مواقع کو استعمال نہیں کر پاتے، کیونکہ بڑے مواقع ہمیشہ زیادہ محنت کے طالب ہوتے ہیں، لوگ زیادہ محنت کرنا نہیں چاہتے اس لئے وہ ایسے مواقع کو سمجھنے سے بھی قاصر رہتے ہیں۔

۶ دسمبر ۱۹۸۴

ٹائمس آف انڈیا ہندستان کے انگریزی اخبارات میں نمبر ایک اخبار شمار ہوتا ہے۔ اس کی کم از کم ایک وجہ یہ ہے کہ وہ ۱۹۳۸ میں جاری ہوا تھا۔ ڈیڑھ سو سال کی کوششوں نے اس

کو ترقی کے موجودہ مقام تک پہنچایا ہے۔ کسی بھی بارکے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ ٹائمس آف انڈیا کی طرح اپنی پیشانی پر جاری شدہ ۱۸۳۸ (Establishe d 1838) کے الفاظ کمپوز کرکے چھاپ دے مگر وہ اس تاریخ کو کہاں سے لائے گا جو فی الواقع ۱۸۳۸ میں جاری ہونے والے ایک اخبار کو حاصل ہوتی ہے۔

جو چیز تاریخی حقیقت کے ذریعہ ملتی ہو، اس کو الفاظ بول کر حاصل کرنا ممکن نہیں۔

۷ دسمبر ۱۹۸۴

قرآن میں ہے کہ اللہ نے انسان کے اندر اپنی روح پھونکی (ونفخ فیہ من روحہ، السجدۃ ۹) ایک ضعیف حدیث میں ہے کہ: خلق اللہ آدم علی صورتہ (اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا)

جب میں اس قسم کی آیات واحادیث کو دیکھتا ہوں، اور دوسری طرف انسان کی حالت پر غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے خدائے قادر نے خدائے عاجز کو پیدا کیا ہو۔ ایک طرف انسان کو خدائی صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ دوسری طرف وہ نہایت عاجز اور فانی بھی ہے۔ انسان کی نجات کا دارومدار اسی پر ہے کہ وہ اس دوطرفہ معاملہ کو سمجھ سکے۔

باعتبار حقیقت اگرچہ انسان ایک عاجز مخلوق ہے۔ مگر اس کی یہ عاجزانہ حیثیت عام حالت میں چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ اپنی آخری اور کامل صورت میں صرف موت کے وقت ظاہر ہوتی ہے۔ عملی طور پر حالت عجز طاری ہونے سے پہلے اپنے عجز کا اعتراف کرنا، یہی انسان کا اصل امتحان ہے۔ یہ بلاشبہ موجودہ انسان کے لئے مشکل ترین کام ہے، مگر اسی مشکل ترین کام میں اس کی اعلیٰ ترین کامیابیوں کا راز بھی چھپا ہوا ہے۔

۸ دسمبر ۱۹۸۴

Our major obligations is not to mistake slogans for solutions.

Edward R Murrow

ہماری اہم ذمہ داری یہ ہے کہ ہم نعروں کو حل کا قائم مقام نہ سمجھ لیں۔

عام طور پر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ بڑی بڑی تحریکیں اٹھتی ہیں اور اس طرح ختم ہوجاتی ہیں کہ

ان سے قوم کو اتنا بھی نہ ملا ہو جتنا قوم نے اس تحریک کو چلانے کے لئے خرچ کیا تھا۔

اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ یہ تحریکیں نعروں پر اٹھی تھیں نہ کہ واقعی معنوں میں حل کی بنیاد پر۔ اگر پوری صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے سوچا سمجھا منصوبہ بنایا جائے اور حکیمانہ تدبیروں کے ساتھ اس کو آگے بڑھایا جائے تو کامیابی یقینی ہے۔ مگر سطحی لیڈر اکثر ایسا کرتے ہیں کہ وہ محض وقتی جوش کے تحت ایک نعرہ لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ نعرہ کو تدبیر کا بدل سمجھ لیتے ہیں۔ مگر نتیجہ بتاتا ہے کہ وہ محض جھوٹے الفاظ پر کھڑے ہوئے تھے نہ کہ واقعی معنوں میں کسی سوچے سمجھے منصوبہ پر۔

۹ دسمبر ۱۹۸۴

ہندو خدائے برتر کو مانتے ہیں جس کو وہ ایشور کہتے ہیں۔ مگر ہندوؤں کے یہاں ایشور کا کوئی مندر نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں جتنے مندر ہیں سب دیوتاؤں کے ہیں۔ گویا ہندو اس مذہب سے واقف نہیں جس میں "خدا" کی پرستش کی جائے۔ وہ صرف اس مذہب کو جانتے ہیں جس میں دیوی دیوتاؤں کی پرستش کی جاتی ہے۔

یہی موجودہ زمانہ میں تمام مذاہب کا حال ہے۔ یہودی صرف اس دین کو جانتے ہیں جس میں ایک خاص نسل سے تعلق رکھنے والوں کے لئے نجات ہے۔ عمل کی بنیاد پر نجات ملنے والے دین سے وہ واقف نہیں۔ عیسائی صرف اس دین سے واقف ہیں جس میں "پادری" کی معرفت کوئی شخص خدا تک پہنچتا ہے۔ وہ براہ راست خدا تک پہنچنے والے دین سے واقف نہیں۔

مسلمان بھی اس معاملہ میں دوسروں سے مختلف نہیں۔ اسلام اگرچہ ایک خالص اور بے آمیز دین ہے، مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان آج جس دین پر ہیں وہ اس سے مختلف دین ہے جو محمد عربی پر اتارا گیا تھا۔

آج مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ "تقویٰ" والے دین سے واقف نہیں۔ مسلمان آج جس دین سے واقف ہیں وہ ان کی تاریخی روایات، ان کے بزرگوں کے قصے کہانیاں، ان کے قومی جذبات ہیں۔ انھیں چیزوں کے تحت ان کا ایک دین بن گیا ہے اور اسی خود ساختہ دین پر وہ قائم ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں سے جب خدا کی بڑائی بیان کی جائے تو وہ انھیں زیادہ اپیل نہیں کرتی، کیوں کہ وہ اپنے قومی ہیروؤں کی بڑائی میں جی رہے ہیں۔ ان سے آخرت

کی پکڑ کی پکڑ کی بات کیجئے تو ان کی نفسیات میں کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوتی۔ کیوں کہ اس دین سے وہ آشنا ہی نہیں۔

۱۰ دسمبر ۱۹۸۴

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لا تصاحب الا مؤمنا ولا یاکل طعامک الا تقی (مشکوٰۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مومن کے سوا کسی اور کو اپنا ساتھی نہ بناؤ۔ اور تمہارا کھانا متقی آدمی کے سوا کوئی اور نہ کھائے۔

اس حدیث کو اگر مطلق معنوں میں لیا جائے تو وہ دوسری اسلامی تعلیمات سے ٹکرا جائے گی۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے سفر میں ایک مشرک (عبد اللہ بن ارقط) کو اپنے ساتھ لیا اور اس کو اپنا شریک سفر بنایا۔

اسی طرح رسول اللہ کو جب نبوت ملی تو آپ نے مکہ کے مشرکین کی دعوت کی اور اس کے بعد ان کے سامنے اسلام پیش کیا۔ اسی طرح جنگ بدر کے بعد جو مشرکین گرفتار کرکے مدینہ لے جائے گئے، ان کو مدینہ کے مسلمان کھانا کھلاتے تھے ۔۔۔۔۔۔ اگر مذکورہ حدیث کو مطلق معنوں میں لیا جائے تو یہ سب چیزیں اس کے خلاف ہو جائیں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر بات کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ اگر بات کو اس کے پس منظر سے ہٹا دیا جائے تو وہ ناقابل فہم ہو کر رہ جاتی ہے۔

۱۱ دسمبر ۱۹۸۴

ایک صاحب نے میرے بارہ میں کہا کہ آپ غیر معمولی ذہن کے آدمی ہیں۔ میں نے کہا کہ میرے بارہ میں آپ کا یہ خیال صحیح نہیں۔ میں صرف اوسط درجہ کا ذہن رکھنے والا آدمی ہوں۔ میرے اندر اگر کوئی خاص صفت ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کوئی حقیقت یا کوئی سچائی میرے سامنے آئے تو میں اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں ہر حال میں اس کا اعتراف کروں گا، خواہ وہ میرے موافق ہو یا میرے خلاف۔

نیوٹن کی شہرت جب بڑھی تو اس کے بارہ میں کسی شخص نے کہا کہ آپ غیر معمولی صلاحیتوں والے

آدمی ہیں۔ نیوٹن نے اس کا جو جواب دیا وہ انگریزی میں اس طرح نقل کیا گیا ہے :

I had no special sagacity only the power of patient thought.

(میرے اندر کوئی خصوصی قابلیت نہیں، صرف انتھک طور پر سوچتے رہنے کی قوت) اسی طرح میں کہوں گا کہ میرے اندر کوئی امتیازی لیاقت نہیں۔ اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف یہ کہ میں بے اعترافی کو afford نہیں کر سکتا۔

۱۲ دسمبر ۱۹۸۴

جبر و اختیار کی بحث میں حضرت علی ابن ابی طالب کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شخص حضرت علی کے پاس آیا اور جبر و اختیار کے بارہ میں دریافت کیا۔

حضرت علی نے پوچھنے والے سے کہا کہ تم اپنا ایک پاؤں اٹھاؤ۔ اس نے اٹھایا۔ آپ نے کہا کہ یہ اختیار ہے۔ اس کے بعد حضرت علی نے کہا کہ اب تم اپنا دوسرا پاؤں اٹھاؤ۔ اس نے جواب دیا کہ دوسرا پاؤں میں نہیں اٹھا سکتا۔ یہ تو ممکن نہیں۔ حضرت علی نے کہا کہ یہ جبر ہے۔ اس طرح حضرت علی نے پوچھنے والے کو یہ سبق دیا کہ اصل حقیقت دونوں کے درمیان ہے۔

یہ صحابہ کرام کا طرز استدلال تھا۔ وہ فطری منطق کو استعمال کرتے تھے اور سادہ دلائل سے باتوں کو ثابت کرتے تھے۔ بعد کو غیر اقوام کے اختلاط سے وہ موشگافیاں پیدا ہوئیں جن کا ماخذ یونانی منطق تھی نہ کہ وہ ذہن جس کو صحابہ نے پایا تھا۔

۱۳ دسمبر ۱۹۸۴

کسی مفکر کا قول ہے ۔۔۔۔ ناکامی تاخیر ہے، مگر ناکامی شکست نہیں :

Failure is delay, but not defeat.

موجودہ دنیا میں امکان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ یہاں کوئی ناکامی کبھی آخری ناکامی نہیں بن سکتی۔ ہر ناکامی کے بعد یہاں ایک نیا امکان موجود رہتا ہے۔ ناکامی کو دوبارہ کامیابی بنانے کی شرط صرف ایک ہے۔ آدمی گرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کا حوصلہ پیش کر سکے۔

بہت پہلے میں نے ایک آدمی کو یہ مقولہ سنایا تھا جب کہ وہ ایک ناکامی سے دوچار ہوئے

تھے۔ یہ بات ان کے دل کو لگ گئی۔ انھوں نے دوبارہ نئے عزم کے ساتھ عمل کرنا شروع کیا۔ اب ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ یہ مقولہ میرے حق میں پوری طرح صادق آیا ہے۔ میری ناکامی تاخیر تھی، مگر میری ناکامی میرے لئے شکست نہیں بنی۔

اسی سے ملتا جلتا انگرسال (Robert Green Ingersoll) کا قول ہے کہ اس زمین پر ہمت و حوصلہ کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آدمی شکست کو دل شکستگی کے بغیر برداشت کر سکے:

The greatest test of courage on Earth is to bear defeat without losing heart.

۱۴ دسمبر ۱۹۸۴

الامیر اسماعیل بن احمد السامانی کہا کرتے تھے:

كن عصاميا ولا تكن عظاميا

عصامی بنو، عظامی نہ بنو۔ عصامی، یا العصامی ایک شخص کی طرف منسوب ہے جس کا نام عصام بن شہبر الجرمی تھا۔ اس آدمی نے اپنی ذاتی کوششوں سے بڑی ترقی حاصل کی۔ اس لئے اس کا نام ذاتی عمل سے آگے بڑھنے کی علامت بن گیا۔

عظامی یا العظامی کا لفظ عظام الموتی (مرے ہوئے بزرگوں) کی طرف منسوب ہے۔ یہ اس بات کا کنایہ ہے کہ آدمی اپنے گزرے ہوئے آباو اجداد پر فخر کرے۔ وہ ماضی کے بڑوں سے نسبت دے کر اپنے کو بڑا سمجھے۔

السامانی کے مذکورہ مقولہ کا مطلب یہ ہے کہ اپنے عمل سے بڑا بننے کی کوشش کرو، پدرم سلطان بود کے ذہن کے تحت اپنے کو بڑا نہ سمجھو۔ (العربی، کویت)

۱۵ دسمبر ۱۹۸۴

ریچھوں اور بھیڑیوں کے درمیان شاید انسان امن کے ساتھ رہ سکے۔ مگر موجودہ زمانہ کے انسانوں کے درمیان امن کے ساتھ رہنا ممکن نہیں۔ آج انسان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے معمولی نفع کی خاطر دوسرے کا بڑے سے بڑا نقصان کر سکتا ہے۔ ہر آدمی بے اصولی پر تلا ہوا ہے۔ ہر آدمی اپنی انا کی تسکین کے لئے دوسرے کو ملیامیٹ کر دینا چاہتا ہے۔ انسانوں کے لوائق اس سے زیادہ ہیں کہ

کوئی بھی شخص ان سے محفوظ رہ سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی بربادی سے بچنا ممکن نہیں۔ کامیاب وہ ہے جو آخرت کی بربادی سے بچ جائے۔

۱۶ دسمبر ۱۹۸۴

تاریخ کے بہت سے واقعات ایسے ہیں جو اپنی ابتدائی صورت میں اس سے بہت زیادہ مختلف تھے جو بعد کے لوگوں کی افسانہ طرازی سے بن گئے۔ انھیں میں سے ایک واقعہ حضرت حسین بن علی کا بھی ہے۔

آج "حسین ویزید" کے لفظ سے جو سخت تصور سامنے آتا ہے وہ تمام تر بعد کی پیداوار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض غلط فہمیوں کے سبب سے حضرت حسین مدینہ سے روانہ ہوئے اور کربلا کے میدان میں یزید کی فوجوں سے ان کی لڑائی ہوئی۔ مگر یہ پوری تصویر کا بہت ادھورا رخ ہے۔ حضرت امیر معاویہ نے ۵۰ھ میں قسطنطنیہ کی طرف ایک اسلامی لشکر روانہ کیا۔ اس کا سپہ سالار اپنے لڑکے یزید کو بنایا جس کی عمر اس وقت تقریباً ۲۶ سال تھی۔ اس لشکر میں عام لوگوں کے علاوہ بہت سے صحابہ موجود تھے۔ مثلاً عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن عباس، عبد اللہ بن زبیر، ابو ایوب انصاری وغیرہ۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی مشہور کتاب البدایہ والنہایہ میں لکھا ہے کہ اس لشکر میں حسین بن علی بھی شامل تھے:

لما توفی الحسن کان الحسین یفد الی معاویة فی کل عام فیعطیه ویکرمه وقد کان فی الجیش الذین غزوا القسطنطنیه مع ابن معاویة یزید فی سنة احدیٰ وخمسین (جزء ۸، صفحه ۱۵۱)

جب حسن کا انتقال ہو گیا تو حسین ہر سال امیر معاویہ کے پاس جاتے اور وہ ان کو ہدایا دیتے اور عزت سے پیش آتے۔ حسین اس لشکر میں بھی شامل تھے جس نے معاویہ بن یزید کی سرداری میں ۵۱ھ میں قسطنطنیہ پر حملہ کیا تھا۔

کربلا کے میدان میں جو جنگ ہوئی وہ بھی سراسر مجبورانہ جنگ تھی۔ ورنہ آخر وقت میں حضرت حسین یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے تیار تھے جو اس وقت میدان جنگ سے دور دمشق

میں تھا۔ ملاحظہ ہو تاریخ طبری۔

۱۷ دسمبر ۱۹۸۴

خلیفہ ہارون الرشید کے ایک صاحبزادہ کا نام محمد الامین تھا۔ محمد الامین کی تعلیم و تربیت کے لئے خلیفہ نے الاحمر النحوی کو بلایا۔ جب وہ آئے تو خلیفہ نے ان کو اپنے لڑکے کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں کچھ ہدایات دیں۔ ان میں سے ایک بات یہ تھی:

یا احمر امنعہ من الضحک الا فی اوقاتہ

اے احمر، اُس کو اِس سے روکو کہ وہ وقت پر ہنسنے کے علاوہ ہنسے۔

بڑے آدمی کے لئے ہنسنا پسندیدہ فعل نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ ساری زندگی کبھی لوگوں کے سامنے نہیں ہنسی۔ بات بات پر ہنسنا ہلکے پن کی علامت ہے۔ ایسا فعل آدمی کو لوگوں کی نظر میں حقیر بنا دیتا ہے۔

۱۸ دسمبر ۱۹۸۴

ایک عالم اور زاہد اکثر تنہا رہتا تھا۔ وہ نہ دوسروں سے ملنے کے لئے جاتا اور نہ یہ پسند کرتا کہ لوگ اس سے ملنے کے لئے آئیں۔ ایک آدمی نے اس سے کہا کہ اے شخص، تم اس مسلسل تنہائی کو کس طرح برداشت کرتے ہو۔ اس نے کہا ہرگز نہیں:

انی اجالس ربی۔ فان شئت ان یناجینی قرأت القرآن۔ وان شئت ان اناجیہ دخلت فی الصلاۃ

میں اپنے رب کی صحبت میں بیٹھتا ہوں۔ اگر میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے کلام کرے تو میں قرآن پڑھتا ہوں۔ اور اگر میں چاہتا ہوں کہ میں اس سے کلام کروں تو میں نماز میں مشغول ہو جاتا ہوں۔

۱۹ دسمبر ۱۹۸۴

اردو شاعر کا روایتی معشوق تلوار کے بغیر لڑتا تھا، اس کے باوجود وہ لوگوں کو مار ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا تھا:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

بے تلوار کی یہ خطرناک جنگ اردو شاعر کے لئے زیادہ مہنگی نہیں پڑی۔ کیوں کہ وہ ہمیشہ کاغذ کے اوپر فرضی میدان میں ہوتی تھی۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین نے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کیا کہ بے تلوار کی جنگ وہ حقیقی میدان مقابلہ میں لڑنے لگے۔ اس کا نتیجہ موجودہ زمانہ میں ہولناک تباہی کی صورت میں برآمد ہوا۔

سید احمد شہید بریلوی اور ان کے مجاہدین کی سکھ راجہ سے لڑائی، ۱۸۵۷ میں ہندستانی علماء کی انگریزوں سے لڑائی۔ ۱۹۶۵ میں صدر ناصر کی اسرائیل سے لڑائی۔ مصر کے الاخوان المسلمون کی فوجی حکومت سے لڑائی، اس قسم کی بے شمار لڑائیاں ہیں جو موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنے مفروضہ حریفوں سے لڑتے رہے ہیں۔ ان لڑائیوں میں مسلمانوں اور ان کے حریفوں کے درمیان جنگی اسباب کے اعتبار سے تناسب کا جو فرق تھا اس کے لحاظ سے یہ سب کی سب عملاً "بے تلوار" کی جنگ تھی، اور اسی لئے وہ بدترین ناکامی پر ختم ہوئی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم مجاہدین کی رہنما اردو شعراء کی خیال آرائیاں تھیں۔ ورنہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسباب اور تیاری میں انتہائی غیر معمولی فرق کے باوجود وہ کیوں بار بار اپنے حریفوں سے ایسی لڑائی چھیڑتے رہے جس کا واحد یقینی نتیجہ ان کی یکطرفہ شکست کی صورت میں ظاہر ہونے والا تھا۔

۲۰ دسمبر ۱۹۸۴

ایک مفکر کا قول ہے:

Defence, not defiance

یعنی دفاع نہ کہ دعوت مقابلہ۔ یہ نہایت حکیمانہ بات ہے۔ عقل مند آدمی کبھی ایسا نہیں کرتا کہ وہ خود اپنے حریف کو للکارے۔ البتہ اگر اس کی ساری امن پسندی کے باوجود دشمن اس پر حملہ کر دے تو اس وقت وہ جم کر اس کا سامنا کرتا ہے۔ عقل مند آدمی کا طریقہ مقابلہ ہے نہ کہ دعوتِ مقابلہ۔

اس دنیا میں اصل کام اپنی تعمیر کرنا ہے نہ کہ دوسروں سے لڑنا۔ اپنی تعمیر و استحکام

کے منصوبہ کو جاری رکھنے ہی کے لئے ضروری ہے کہ دوسروں سے ٹکراؤ کو avoid کیا جائے۔ جو لوگ بات بات میں دوسروں سے لڑ جائیں ان کو اس لڑائی کی یہ قیمت دینی پڑتی ہے کہ ان کا تعمیر خویش کا منصوبہ کبھی مکمل نہ ہو۔

۲۱ دسمبر ۱۹۸۴

ہماچل پردیش کے ایک صاحب ہیں جو وہاں ایک عربی مدرسہ کے صدر مدرس ہیں۔ وہ الرسالہ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ مگر میرے بار بار کہنے کے باوجود اب تک انھوں نے الرسالہ کی ایجنسی نہیں چلائی۔ وہ ہمارے مشن کے قصیدہ خواں ہیں مگر وہ اس مشن میں عملاً شریک نہیں۔

میں نے ان سے کہا کہ آپ ہمارے نزدیک ابھی تک صرف "ابوالکلام" ہیں، آپ ابھی تک "ابوالعمل" نہیں بنے۔ پھر میں نے کہا کہ یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کا اصل سبب ہے۔ مسلمانوں کے تمام رہنما صرف ابوالکلام تھے، ان میں سے کوئی ابوالعمل نہ تھا۔ ایسی حالت میں ان کی کوششوں کا کوئی حقیقی عملی نتیجہ پیدا ہوتا تو کیوں کر ہوتا۔

۲۲ دسمبر ۱۹۸۴

حدیثیں وضع کرنے والے ایک تو وہ تھے جو سیاسی مقصد کے لئے حدیثیں وضع کرتے تھے۔ مثلاً:

الامناء ثلاثة انا وجبريل ومعاوية

امین تین ہیں: میں اور جبریل اور معاویہ

اسی طرح اس شغلہ نے بھی بہت سی حدیثیں وضع کرائیں جس کو "گپ بازی" کہا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نے حدیث گھڑی کہ حضرت نوح کی کشتی جب پانی پر بلند ہوئی تو پہلے اس نے سات بار خانہ کعبہ کا طواف کیا۔

اسی طرح ایک شخص نے قصہ بنایا کہ طوفان نوح کے وقت ایک طویل القامت آدمی تھا جس کا نام عوج بن عنق تھا۔ اس کا قد تین ہزار گز لمبا تھا۔ حضرت نوح نے اس کو طوفان کی خبر دی اور ڈوبنے سے ڈرایا۔ مگر وہ کشتی میں سوار نہیں ہوا۔ وہ اتنا لمبا تھا کہ طوفان کا پانی اس کے گھٹنوں تک بھی نہیں پہنچتا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ سمندر کی تہہ میں ڈال کر مچھلیاں پکڑ لیتا اور اس کو

سورج کی آنچ میں بھون کر کھالیتا۔

اس قسم کے بے شمار قصے جو محض گپ بازی کے نتیجہ میں پیدا ہوئے۔ وہ کتابوں میں درج ہوگئے۔ واعظین ان کو سنانے لگے۔ یہاں تک کہ وہ اس طرح عوام میں پھیل گئے کہ ان کو اسلام کی تاریخ سے الگ کرنا ممکن نہ رہا۔

۲۳ دسمبر ۱۹۸۴

ندوہ (لکھنؤ) کے ایک استاد ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ دوران گفتگو انھوں نے بتایا کہ دکتور عبد الحلیم عویس (جامعۃ الامام، ریاض) نے ان سے میری کتاب "پیغمبر انقلاب" کا عربی ترجمہ کرنے کے لئے کہا تھا، مگر میں نے معذرت کر دی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس وقت میں ندوہ میں ابھی نیا نیا آیا تھا، میرے سامنے سب سے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ میں وہاں کے ماحول میں اپنے کو جماؤں۔ اس لئے میں نے پیغمبر انقلاب کے ترجمہ کا کام نہیں لیا۔

چوں کہ میں نے مولانا علی میاں پر تنقید کی ہے اس لئے ندوہ کا ماحول میرے سخت خلاف ہے۔ کوئی شخص جو میری حمایت کرے یا میرے ساتھ کسی نوعیت کا تعاون کرے اس کے لئے ندوہ میں رہنا سخت مشکل ہے۔ "پیغمبر انقلاب" کا عربی ترجمہ جامعۃ الامام ریاض کی طرف سے کرایا جا رہا تھا وہ لوگ بہت زیادہ معاوضہ دیتے ہیں۔ عام حالات میں ناممکن ہے کہ کسی ندوی کو جامعۃ الامام کا ایک کام ملے اور وہ اس کو چھوڑ دے۔ مگر مذکورہ استاد کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ پیغمبر انقلاب کا ترجمہ کرتے تو ندوہ کے ماحول میں غیر مطلوب شخصیت بن جاتے۔ اس مصلحت کی بنا پر انھوں نے اس سے احتراز کیا۔

موجودہ زمانہ میں سب سے بڑا دین مصلحت ہے۔ ہر آدمی اپنی مصلحتوں پر چلتا ہے۔ مالیاتی مصلحت، قیادتی مصلحت، ملازمت کی مصلحت، پوزیشن کی مصلحت، غرض ہر ایک کا دین مصلحت ہے اور وہ اسی کو سب سے زیادہ اہمیت دئے ہوئے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج لوگوں کا حال یہ ہے کہ جس بلند مقام پر خدا کو بٹھانا چاہئے وہاں انھوں نے مصلحت کو بٹھا رکھا ہے۔ خواہ وہ زبان سے خدا کا اقرار کرتے ہوں یا اس کا انکار۔

یہ بھی غیر اللہ کی پرستش کی ایک قسم ہے۔

۲۴ دسمبر ۱۹۸۴

دو صاحبان ملنے کے لئے تشریف لائے۔ ایک صاحب نے کہا: ہم نے سنا ہے کہ آپ کو قذافی نے کافی پیسہ دیا ہے۔ دوسرے صاحب نے فرمایا: ہم نے سنا ہے کہ آپ کو سی آئی اے سے پیسہ ملتا ہے۔

میں نے کہا کہ بخدا وہ لوگ اندھے اور بہرے ہیں جو اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ الرسالہ میں جو مضامین چھپتے ہیں وہ خود اس قسم کی تمام باتوں کی تردید ہیں۔

میں نے کہا کہ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جن کو الرسالہ کے مضامین میں قذافی اور سی آئی اے کا پیسہ نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قذافی کی تمام دولت اور سی آئی اے کے تمام ڈالر مل کر بھی وہ مضامین نہیں لکھوا سکتے جو الرسالہ میں چھپتے ہیں۔ یہ مضامین غم ناک دل سے ابلتے ہیں اور دردمند قلم سے لکھے جاتے ہیں۔ قذافی اور سی آئی اے کا پیسہ پہلا کام یہی کرتا ہے کہ وہ آدمی سے غم ناک دل اور دردمند قلم چھین لیتا ہے، پھر ایسا شخص ایسے مضامین کہاں سے لکھے گا۔

کاش لوگوں کے پاس آنکھ ہوتی کہ وہ دیکھتے، اور لوگوں کے پاس عقل ہوتی کہ وہ سمجھتے۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگوں سے دیکھنے والی آنکھ بھی چھن گئی ہے اور سمجھنے والی عقل بھی۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ چیزوں کو دیکھیں، کیسے ممکن ہے کہ وہ حقیقتوں کو سمجھیں۔

۲۵ دسمبر ۱۹۸۴

مسلم نوجوانوں اور طالب علموں کی ایک مشہور جماعت ہے۔ اس کے کچھ ارکان سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ ہم اپنے نصب العین کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

قرآن ہمارا دستور

رسول ہمارا رہنما

شہادت ہماری تمنا

میں نے کہا کہ جب آپ کو شہادت کا شوق ہے تو اس کی "تمنا" کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس وقت مختلف ملکوں میں مسلمانوں کی دوسروں سے جو لڑائیاں ہو رہی ہیں ان کو آپ لوگ جہاد کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد کا میدان آپ کے لئے ہر طرف کھلا ہوا ہے۔ ہندستان میں ہندوؤں کے مقابلہ میں، افغانستان میں روس کے مقابلہ میں، فلسطین میں یہود کے مقابلہ میں۔ اسی طرح

اور بہت سے ملکوں میں مسلمان وہاں کی حکومتوں سے لڑ رہے ہیں اور ان سب کو آپ لوگ جہاد کہتے ہیں۔ پھر جہاد کے ان میدانوں میں سے کسی میدان میں داخل ہو جائیے اور لڑ کر شہید ہو جائیے۔

انھوں نے کہا کہ پھر آپ خود کیوں ایسا نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ میں تو ان کو جہاد کہتا ہی نہیں۔ میرے نزدیک یہ سب کی سب قومی لڑائیاں ہیں نہ کہ جہاد فی سبیل اللہ۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان جھوٹے الفاظ میں جی رہے ہیں۔ حالانکہ مسلمان وہ ہے جو سچے الفاظ میں جئے۔ "شہادت کی تمنا" کا لفظ بول کر لوگ شہادت کا کریڈٹ لینا چاہتے ہیں، حالانکہ شہادت کا کریڈٹ شہید ہو کر ملتا ہے نہ کہ شہادت کے الفاظ بول کر۔

۲۶ دسمبر ۱۹۸۴

مارٹن ایسلن (Martin Esslin) کا قول ہے کہ انسان کی عظمت کا راز اس کی اس صلاحیت میں ہے کہ وہ حقیقت کا سامنا کر سکے خواہ وہ کتنا ہی بے معنی کیوں نہ ہو:

The dignity of man lies in his ability to face reality in all its meaninglessness.

انسان فطری طور پر معقولیت کو پسند کرتا ہے اور لغویت کو ناپسند۔ اس لئے جب کسی کی طرف سے لغو صورت حال پیدا کی جائے تو وہ فوراً بپھر اٹھتا ہے۔ مگر بپھر اٹھنا اس طرح کے مسئلہ کا حل نہیں۔ کیوں کہ اس دنیا میں جس طرح ہم کو آزادی حاصل ہے اسی طرح دوسروں کو بھی آزادی حاصل ہے۔ اور ہم کسی پر یہ پابندی نہیں لگا سکتے کہ وہ صرف معقول کارروائی کرے اور کوئی ایسی کارروائی نہ کرے جو ہم کو نامعقول دکھائی دیتی ہو۔

ایسی حالت میں کامیابی کا راز یہ ہے کہ آدمی ہر پیش آمدہ صورت حال کو غیر جانبدارانہ انداز سے دیکھے۔ وہ ہر مسئلہ کا صابرانہ حل تلاش کرے خواہ بظاہر وہ کتنا ہی زیادہ لغو نظر آتا ہو۔

۲۷ دسمبر ۱۹۸۴

لینن (۱۹۲۴ - ۱۸۷۰) نے اپنی کتاب "سوشلزم اینڈ ریلیجن" میں لکھا تھا کہ "ہمارے نزدیک آسمان پر جنت تعمیر کرنے سے زیادہ اہم کام زمین پر جنت تعمیر کرنا ہے"۔

لینن کے زیر قیادت روس میں ۱۹۱۷ میں اشتراکی انقلاب آیا اور دنیوی جنت کی تعمیر عملاً شروع ہوگئی۔ مگر ۱۹۵۶ میں روس کے وزیر اعظم خروشچوف نے کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگرس میں جو انکشافات کئے، اس سے معلوم ہوا کہ روس میں اتنے دنوں سے صرف جہنم کی تعمیر ہورہی تھی ——— حقیقت یہ ہے کہ زمین پر جنت کی تعمیر وہی لوگ کرتے ہیں جو آسمان میں جنت کی تعمیر کرنے والے ہوں۔

۲۸ دسمبر ۱۹۸۴

۱۹۱۱ء تک بے پردگی دلّی والوں کے نزدیک اتنی معیوب تھی کہ ۱۹۱۱ میں مولانا محمد علی دلی میں آکر رہے اور ان کے ساتھ بیگم محمد علی برقعہ پہن کر اور منھ چھپائے تانگہ میں سے نکلیں تو دلّی والوں نے ناک بھوں چڑھائی کہ تانگہ پر پردہ کیوں نہیں لپیٹا گیا (میرے زمانہ کی دلی، از ملا واحدی)

یہ بلاشبہہ غلو تھا۔ اور غلو ہمیشہ الٹا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ ۱۹۱۱ اور آج کے فرق کی صورت میں یہ الٹا نتیجہ واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

۲۹ دسمبر ۱۹۸۴

۱۹۲۱ میں ہندستان میں خلافت تحریک کا زور تھا۔ مسلم قائدین نے فتویٰ دیا کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں پر ہجرت لازم ہوگئی ہے۔ انھیں چاہئے کہ وہ ہندستان سے ہجرت کرکے افغانستان پہنچیں۔ وہاں افغانیوں کو ساتھ لے کر دوبارہ ہندستان کے انگریزوں پر حملہ کریں اور اس کو آزاد کرائیں۔ خطیبوں اور شاعروں نے نہایت جوشیلے انداز میں مسلمانوں کو اکسانا شروع کیا۔ ہر طرف یہ نغمہ سنائی دینے لگا:

چلو مسلمانو سوئے کابل امیر صاحب بلا رہے ہیں

اس قسم کی جذباتی باتوں سے متاثر ہوکر تقریباً ۱۸ ہزار ہندستانی مسلمان ہندستان سے ہجرت کرکے افغانستان پہنچے۔ ہندستان میں انھوں نے اپنا سب کچھ لٹا کر سفر کیا تھا۔ مگر جب وہ افغانستان پہنچے تو بجبر انھیں وہاں سے واپس آنا پڑا۔ کیوں کہ " امیر صاحب " نے انھیں بلایا ہی نہیں تھا۔

اولاً تو ہجرت کا فتویٰ ہی سراسر لغو تھا۔ دوسرے ان قائدین نے مزید مجرمانہ حماقت یہ کی کہ امیر افغانستان سے گفت وشنید کرنے اور اس سے باقاعدہ اجازت لینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بس بھیڑ بکری

کی طرح لوگوں کو افغانی سرحد کی طرف روانہ کر دیا۔ ہزاروں لوگ بالکل برباد ہو کر رہ گئے۔

۳۰ دسمبر ۱۹۸۴

قرآن کے نزول کی ابتدا ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے اکتالیسویں سال ۱۷ رمضان کی رات سے ہوئی۔ اور اس کی انتہا آپ کی پیدائش کے ۶۳ ویں سال اور ہجرت کے دسویں سال ۹ ذوالحجہ کو یعنی حج کے روز ہوئی۔ قرآن کی سورتوں کی کل تعداد ۱۱۴ ہے۔ آیات کی مجموعی تعداد ۶۳۴۲ ہے۔ اس تعداد میں سے وہ آیات جن میں شرعی اور قانونی احکام بیان کئے گئے ہیں، صرف پانچ سو ہے۔

۳۱ دسمبر ۱۹۸۴

نازی ازم اور فاشزم شخصی نظامات ہیں۔ ان کا اور اسی طرح ہر ڈکٹیٹرانہ نظام کا خلاصہ یہ ہے کہ ـــــــ تم وہ کرو جس کا میں تم کو حکم دیتا ہوں، اور میں وہی کروں گا جو تمہارے لئے بہتر ہوگا:

You do what I tell you, and I do what is good for you.

شخصی نظام مذکورہ روش کے لئے بدنام ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں شخصی نظام اور جمہوری نظام میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں کہ ایک بے پردہ آمریت ہے اور دوسرے کے اوپر بظاہر عوامی جمہوریت کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔